مضامین شرر - جلد چہارم

ادب و تحقیق مسائل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فلسفۂ تصوف اور اسلام

اگرچہ دُنیا اپنی رفتار ترقی مین سابق کے بہ نسبت بہت آگے نکل آئی مگر اس وقت تک اس امر کا پتہ نہ لگا کہ انسان کی کمالی حالت کا منتہا کس مقام پر ہے۔ مختلف فلسفیون کے قائم کیے ہوے اصول پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد مختلف مذاہب کے اصول کا انداز کیجیے تو طبیعت ایک مخمصہ مین پڑ جاتی ہے۔ شاید اسی لیے بانیان مذہب کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہوگا کہ اُن عقلی نازک مباحث سے کم تعلق رکھنا چاہیے جو انسان کے خیالات پر کوئی نہ کوئی جدید اثر ڈال دیا کرتے ہین۔ اگرچہ ایک تقلیدی طرز پر اس عہد سے پیشتر کے علما بھی فلسفیانہ مباحث پر نظر ڈالا کرتے تھے مگر تعلیم کے لیے جو طریقہ مغربی یوروپین سررشتہ تعلیم نے ایجاد کیا ہے اُس کا یہ لازمی اور حتمی اثر ہے کہ انسان اپنے عالم خیال مین بالکل آزاد ہو کے مذہب اور فلسفے پر غائر نظر ڈالتا ہے اور دونون کے درمیان مین ایک عمدہ فیصلہ کرنے والا بن جاتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ بہ نسبت عربی تعلیم کے انگریزی تعلیم نے

زیادہ دہریے پیدا کیے۔ عربی کورس میں فلسفہ و منطق کی کتابیں انگریزی سے زیادہ ہیں مگر پھر بھی اُس سے طبیعت پر اتنا اثر نہیں پڑتا۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ عربی تعلیم سے کوئی دہریہ نہیں ہوا۔ نہیں ضرور ہوئے۔ مگر یہ اندھیر نہیں ہو گیا کہ ایک سرے سے گویا دُنیا میں مذہب کی واجبی اور ضروری حکومت اُٹھتی جاتی ہے۔

اگرچہ ہم مذہب کے احکام کو اعتقاداً ضرور مانتے ہیں مگر ہم نے فلسفے کی طرف سے آنکھیں بند بھی نہیں کر لی ہیں۔ ہم خود بھی پسند کرتے ہیں کہ فلسفیانہ اصول کا مذہب سے مقابلہ کیا جائے۔ لیکن مذہب کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود فلسفہ کے دو مختلف اور متضاد فریقوں کا جھگڑا چکا دیا جائے۔ اس لیے کہ جب تک اُن دونوں کے مباحث طے نہ کر دیے جائیں فلسفے میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ مذہب کے مقابل میں لا کے قائم کیا جائے۔ متقدمین سے متاخرین تک اہل فلسفہ کے دو گروہ رہے۔ ایک وہ لوگ جو نظام عالم کو معقولی استدلالات کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو نتائج عقلی کو چھوڑ کے صرف روحانیات کی طرف جھکتے ہیں۔ پہلوں کو عربی فلسفے کی اصطلاح میں مشائین کا خطاب دیا گیا ہے اور پچھلے اشراقیین کہلاتے ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ فلسفۂ مادی اور تصوف۔ اور اس نے اسلام میں آ کے دو اصول دینی پیدا کر دیے یا شریعت اور طریقت۔

بے شک اس امر کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے کہ آیا مشائین کی پیروی کی جائے یا اشراقیین کی؟ پہلے فرقے والے تو فقط اسی کے قائل ہیں کہ اُنکے اصول سے پیروی کی جائے۔ اس لیے کہ وہ استدلال کے متعدد طریقوں سے کام لے کے کسی ایسے شخص کو سمجھا دینے کی کوشش کرتے ہیں جو سمجھنا چاہتا ہو۔ مگر اشراقیین یا صوفیہ نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب تک سالہا سال کوشش کر کے اُن کے اشراق نوری اور مکاشفات سے اطلاع نہ حاصل کیجیے اُسوقت تک ممکن نہیں کہ آپ سمجھ سکیے یا وہ سمجھا سکیں۔ جن لوگوں نے اتنی ہی بات پر صوفیہ کے دعووں کو باطل قرار دیدیا اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے غلطی کی۔ اس لیے کہ مادیین اور صوفیہ کے دعوے ہی بتا رہے ہیں کہ پہلوں کا اصول قال ہے اور پچھلوں کا مدار صرف حال پر ہے

تصوف کیا چیز ہے؟ جن لوگون نے یہ سمجھ رکھا ہو کہ صوفیہ کی بڑی بڑی کتابون مین جو کچھ لکھا ہوا ہے وہی تصوف ہے تو اصل یہ ہے کہ وہ ایک عظیم الشان غلطی مین مبتلا ہین - تصوف صرف ان اثرون کا نام ہے جو واقف کار صوفیہ کی بتائی ہوئی ریاضتون سے دل پر پڑ جاتے ہین جنھین وجدانیات کہنا چاہیے انسان اُن سے لطف یا بدمزگی حاصل کر لیتا ہے مگر زبان سے نہین ادا کر سکتا کہ اصل مین کیا چیز ہین - جیسے نور و سرور کہ ان کی کیفیت کسی سے پوچھیے تو بیان نہین کر سکتا مگر ہان دل ہی دل مین لطف اُٹھاتا ہے - لہذا جب تک کوئی اُن کیفیتون سے نہ واقف ہوا ہو جو تصوف کی عملی ریاضتون سے دل مین پیدا ہوتی ہین ہرگز اس قابل نہین ہو سکتا کہ اہل مادہ کے ظاہری استدلالات کو سُن کے اُنھین یکطرفہ ڈگری دیدے - ہم زمانے مین اکثر لوگون کو اس غلطی مین مبتلا پاتے ہین -

آج کل ایک ہمارا سا شخص اگر اوپر کی سطح سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کا مدار مجرد خیالات پر ہے اور اُس کے مقابل مین دوسرا فلسفہ خیالات ہی کا پابند نہیں ہے - لیکن یہ بحث بھی چل سکتی ہے تو ایک اور امر کا فیصلہ کر لینے کے بعد - اس لیے کہ وہ فلسفہ جو تصوف کے مقابل میں ہے اُس میں بھی بہت بڑے بڑے تغیرات ہو گئے - ایک قدیم اور اگلے زمانے کا فلسفہ تھا جس کی ترتیب و نظام میں زیادہ دخل ارسطو کو تھا - اور دوسرا جدید مغربی فلسفہ ہے جسکے اصول کو لارڈ بیکن وغیرہ متاخرین حکماے یورپ نے قائم کیا ہے - پہلا یونانی فلسفہ جس کا زیادہ نہیں کل حصہ عربی مین موجود ہے بلکہ اسلامی علمانے جس کو اُسکی یونانی حالت کے مقابلے مین بہت کچھ ترقی دلا دی اُس کا مبنی بھی صرف خیالات ہی پر تھا - تصوف سے اگر فرق تھا تو اس قدر کہ مقلدین ارسطو عقل کے عام محاکمات پر مسائل کی بنا قائم کرتے تھے - اور ہر طالب علم کو اُس کی عقل کے موافق تمام اصول حکمت پر اطمینان دلا دیا کرتے تھے - بخلاف اس کے اہل تصوف ریاضت کے ذریعون سے اپنے خیالات پر خلوت مین بیٹھ بیٹھ کے غور کرتے تھے اور اُن سے جو کیفیتیں اُنکے دل پر طاری ہوا کرتی تھین اُن پر اپنے فلسفے کی جو اُن کا مذہب تھا بنا قائم

۔۔۔ تھے - لیکن اس پچھلے عہد میں صوفیہ تو اپنی اُسی حالت اور اُنھیں اصول پر قائم ہین مگر اہل مادہ جنھون نے پہلے ارسطو کے فلسفے کو ترمیم و تنسیخ کر کے نئے اصولون پر قائم کر لیا ہے وہ گذشتہ اور موجودہ عربی مقلدین ارسطو کی طرح صرف زبانی جمع خرچ کے پابند نہین ہین بلکہ اُنھون نے دنیا کے فنون پیشون اور تمام علمی مسائل کو سمیٹ کے اپنا بنا لیا ہے - وہ عقلی طور پر بحث کرتے ہین - مگر اُن کے مباحث کا موضوع صرف خیال نہین رہتا بلکہ دُنیا پر اس حیثیت سے نظر ڈالتے ہین کہ اُس کی ہر چیز سے کون سا علمی مسئلہ نکل سکتا ہے - اور کون بات پیدا ہو سکتی ہے جو دنیا کے لیے بکار آمد ہو - یہ کلین اور یہ تمام آلات اُس عہد قدیم ہی مین پیدا ہوئے مروج ہو جاتے مگر نہ ہوئے - اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن اگلے فلسفیون نے اشراقیین کو تو خیر آج تک بحث نہین مقلدین ارسطو نے بھی اپنے خیالات کو اس جانب متوجہ ہی نہین کیا - ان دنون اکثر لوگ ڈھونڈتے پھرتے ہین کہ اپنے گذشتہ لوگون کی کوئی علمی کارستانی نکال کے زمانے کے سامنے پیش کر کے سُرخرو بنین مگر ہم بتائے دیتے ہین کہ اُنکی یہ جستجو بالکل بیکار ثابت ہوگی - اور اگر کوشش کر کے وہ کوئی ایسی بات نکال کے پیش بھی کر دین گے تو یہ خوب جان لینا چاہیے کہ اُسکی ایجاد بحیثیت فلسفہ ہرگز نہ ہوئی ہوگی - بلکہ بحیثیت پیشہ یا تجارت کے کسی کاریگر کا ذہن لڑ گیا ہوگا اور اُس نے کوئی ایسی چیز تیار کر دی ہوگی - اُس زمانے مین اس طرف کسی فلسفی کا خیال متوجہ ہی نہین ہوا تھا - ایسے نتائج ظاہر ہوتے تو کیونکر؟

خیر اب ہم پھر اس بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہین کہ تصوف کے مقابل یہ دونون قدیم و جدید عقلی فلسفے کیسے ہین؟ یہ ظاہر ہو گیا کہ اگرچہ غرض متحد نہ تھی مگر تصوف اور فلسفۂ قدیم دونون کا مدار صرف خیالات پر تھا - لہذا ہم کیا کرین ہمارا انصاف ہمین مجبور کیے دیتا ہے کہ ہم تصوف کو ترجیح دین - اس لیے کہ ایک مسئلے کے حل کر لینے پر عالم خیال مین انسان کو جو مسرت ہو جایا کرتی ہے اُس مین دونون شریک ہین - اور تصوف کو اس قدر ترجیح ہے کہ خیالی ریاضتون سے وہ از قسم انکشاف بہت سے عمدہ کمالات حاصل کر لے سکتا ہے - بخلاف اُس قدیم فلسفہ

ارسطو کے جو سوا اسکے کہ انسان اپنے دل ہی مین آپ اپنے اوپر ناز کرے نہ کسی کے کام آسکتا نہ اپنے لیے کوئی دنیاوی نفع حاصل کرسکتا ہے۔ رہا دوسرا جدید فلسفۂ یورپ جس نے بہت کچھ کمالات تھوڑے ہی دنون مین دکھا دیے۔ دنیا نے اپنی وسیع مقدار عمر مین اتنی شان و شوکت نہ حاصل کی تھی جتنی اس فلسفے کی وجہ سے پچھلی دو ایک صدیون مین حاصل کرلی۔ ہر انسان اُس فلسفے کے ذریعے سے ایک ممتاز ترقی کرسکتا ہے اور بہت کچھ نفع حاصل کرسکتا ہے اور ثابت کرسکتا ہے کہ ایک تھوڑی محنت سے انسان کس پائے پر پہونچ جاتا ہے اور اُس سے کیسے کیسے اہم کام ظاہر ہوجایا کرتے ہین۔ بخلاف تصوف کے کہ اُسکے معتقد جس طرح افلاطون کے مدرسۂ الٰہیات مین بیٹھ کے مراقبہ کیا کرتے تھے اُسی طرح آج بھی اپنی خانقاہون اور کوہستان کی گھاٹیون مین سر جھکائے بیٹھے ہین۔ صوفیہ کو شاید یہ خبر بھی نہ ہوئی ہوگی اور فلسفۂ مادی نے عدالت کی کرسیون تک پر قبضہ کرکے یہ فیصلہ کردیا کہ صوفیہ کے کشف و کرامات اور تمام وہ روحانی خوارق عادات جو تصوف کے ذریعے سے حاصل ہوا کرتے ہین سب خلاف نیچر اور غیر قابل اعتبار ہین۔ بے شک تصوف کو اس جدید مادی فلسفے کے سامنے دب جانا پڑا۔ اور ہم کو بھی تمام نظام عالم کے دیکھتے موجودہ فلسفے ہی کے حق مین فیصلہ کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اسکو سب تسلیم کرتے ہین کہ تصوف ایک ایسی چیز ہے جسکے اصول کو اگر عقل نہ بھی قبول کرے تو اُس کے سراپا ذوق جزئی خیالات کو ضرور اور بہت جلد قبول کرلیتی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ زمانۂ قدیم مین اگرچہ مشائین کا فلسفہ تصوف کی بیخ کنی مین اپنی پوری قوت صرف کرتا رہا مگر ہرگز کامیابی نہ حاصل ہوسکی۔ اُس عہد کے علما اگرچہ ہر فن اور ہر قسم کے علوم فلسفیہ مین کمال حاصل کرلیا کرتے تھے مگر اعتقادی حیثیت سے تصوف اُنکے دعوون پر بالکل حاوی ہوجاتا تھا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ تمام وہ مذاہب جن کو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کے سلسلہ وار پیغمبرون سے کوئی علاقہ نہین اور جن کی بنا بہ ظن غالب عقلی فلسفے پر تھی سب کے اصول تصوف ہی کی زمین پر قائم کیے گئے۔ یہ سب باتین اس امر کا ثبوت دے رہی ہین کہ فلسفۂ ارسطو کو تصوف اور اشراقی فلسفے کے مقابل مین بالکل کامیابی نہ ہوسکی۔ اس عظیم الشان

فلسفے کے خیالات صرف چند مدرسون کی دیوارون کے اندر محدود تھے۔ مسلمانون نے اپنے عہد مین اگرچہ اُس فلسفے کو یہان تک ترقی دلائی کہ خاص مقامات سے نکل کے عام بازارون تک پہونچ گیا۔ مگر پھر بھی اشراق کے دلچسپ اثر نے علما مین جو ذوق تصوف پیدا کیا وہ صرف بحث و مباحثہ کی حیثیت سے نہین رہا بلکہ مذہب کا ایک جزو بن کر اعتقادون مین گھس گیا۔ ہان تصوف کے اس جہانگیر اثر کو اگر مٹایا تو اس جدید فلسفے نے۔ جس نے دکھا دیا کہ ہمارے خیالات تصوف اور نیز قدیم فلسفۂ ارسطو کی طرح صرف دماغ مین چکر کھانے کے لیے نہین ہین بلکہ ان سے، اگر غور کیا جائے تو بڑے بڑے نتائج پیدا ہو سکتے ہین۔ اس فلسفے کے حامیون نے یہ دعوی ہی نہین کیا بلکہ کر کے دکھا دیا۔ انھون نے ثابت کر دیا کہ ہمارے اصول اور ہماری کوششون نے دنیا کو کسی طالب علمانہ بحث مین الجھا کے نہین رکھا بلکہ دنیا کے لیے عمدہ عمدہ کلین قسم قسم کے سامان مہیا کر دیے۔ الغرض یہ ایسے دلفریب دعوے ہین کہ اب دنیا تصوف کی دلخوش کن باتون کو بھول گئی اور بھولتی جاتی ہے اور جدید فلسفہ فلسفۂ قدیم۔ تصوف بلکہ مذہب تک کو مٹا کے اپنا قبضہ کرتا جاتا ہے۔ اور در پردہ اسکے ساتھ ہی ساتھ مذہب کو بھی نقصان پہونچا جاتا ہے۔ تصوف کے حامیون کی بعض پارٹیان قائم ہین اور کوشش کر رہی ہین کہ افلاطونی اصول کو اس جدید فلسفیانہ تہذیب کے دور مین مضرتون سے بچائین۔ مگر موجودہ عصر کے نامور فضلا اور یورپ کے بڑے بڑے فلسفی انکی باتون کو اُسی طرح سنتے ہین جس طرح کوئی سن رسیدہ شخص بچون کی بھولی بھولی باتون کو سنتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہی طریقۂ تعلیم کچھ دنون اور چلا گیا تو تصوف کو دنیا مین بالکل شکست ہو جائیگی۔ ہمارے مشہور اہل طریقت اپنی خانقاہون مین اور ہندو جوگی کوہستانی نشیبون مین یونہین بیٹھے رہ جائین گے اور زمانہ وہ پہلا ورق اُلٹ کے تصوف کو دنیا سے ناپید کر دے گا۔

اب ہمین دیکھنا چاہیے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ اگر ہم علمی اصطلاحون سے کام لین تو کہہ سکتے ہین کہ مذہب ایک مزاج کا نام ہے جو فلسفۂ اشراقی و مشائی کے باہمی امتزاج سے پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تعریف زیادہ عام نہین ہو سکتی۔ اس لیے

کہ بعض مذہب اپنی اصلی حالت مین صرف تصوف پر قائم کیے گئے ہین - مثلاً دین عیسوی جسکو سوا اعتقادات کے اور کسی عملی مسئلے سے کسی قسم کا تعلق نہین ہے - اسلام نے دنیاوی انتظامون اور احکام معاشرت کو دیگر مذاہب کی بہ نسبت بہت زیادہ لیا - لیکن اس پر سب مذہب متفق ہین کہ اصلی چیز اعتقادات ہین جن کو صرف تصوف ہی سے تعلق ہے اور جو اصل مین تصوف ہی ہین - لہذا جن بناؤن کے باعث فلسفہ جدید سے تصوف کو نقصان پہونچ رہا ہے انھین بناؤن کے مطابق مذاہب کو بھی ضرر پہونچ رہا ہے - اور اسی وجہ سے اہل مذاہب کو ضرورت ہے کہ لازمی طور پر تصوف کے روحانی مسائل کو سنبھالین ورنہ یہ جدید مادی فلسفہ مذاہب کو جڑ سے اُکھاڑ کے پھینکدے گا -

شاید یہ جملہ ہم تیز کہ گئے - اس لیے کہ اہل مذاہب کو نہایت ناگوار گذرا ہوگا - اُنکے اعتقاد کے مطابق مذہب کی حفاظت کرنے والا خود خدا ہے - اور جب خدا نے حفاظت کا وعدہ کر لیا تو ممکن نہین کہ کوئی مخالفانہ کوشش کارگر ہو سکے - ہان یہ بے شک صحیح ہے اور ممکن نہین کہ کوئی مذہب کی بیخ کنی کر سکے مگر ہم اتنا ضرور کہین گے کہ اسباب زمانہ دیکھ کے آپ کو اُس کی حفاظت ضرور کرنا چاہیے - عیسائی ایک حد تک کوشش کر رہے ہین - اگرچہ مذہب اُن کے اصلی وطن سے جلا وطن ہوتا جاتا ہے - لیکن جتنی یورپ مین کمی ہوتی ہے اُتنا ہی نقصان وہ یون پورا کر لیتے ہین کہ ایشیا کے دیگر اہل مذاہب کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنا لیتے ہین - مگر ہان دیگر مذاہب کو صاف نظر آ رہا ہے کہ روز بروز نقصان پہونچتا جاتا ہے -

یہ بڑی غلط کارروائی ہے کہ ایشیا کے مذاہب باہم لڑ لڑ کے اپنی ساری قوت آپس ہی مین تمام کیے دیتے ہین - جس کی وجہ سے اُن مین اور ضعف ہوتا جاتا ہے اور تعلیم جو جدید فلسفیانہ خیالات بچپن سے دماغون مین پیدا کرتی ہے وہ سب کو اُڑا کے بخوبی تمام غالب آ جاتے ہین - ایسے وقت مین تمام دُنیا کو آپس مین مل کے ایک ایسا مشن قائم کرنا چاہیے جو اتحاد کے ساتھ اس فلسفے کا زور توڑنے پر کمر باندھے - اور یہی مشن اگر کامیاب ہو سکا تو مذاہب کے بچنے کی اُمید ہو سکتی ہے - ورنہ آیندہ ایک ایسا زمانہ ضرور آ جائے گا جب مذہب کی حفاظت انسانی قوت

کے دائرے سے خارج ہو جائے گی۔

ہم کو بالکل اُمید نہین کہ مذہب اپنی موجودہ حالت سے فلسفے کے حملون کو روک سکین۔ اور جب تک تمام مذاہب کی متحدہ قوت ایک عام مشن مذکورہ غرض کے لیے اور مندرجہ بالا اصول پر نہ قائم کرے گی اُسوقت تک ممکن نہین کہ دنیا اُس آفت سے محفوظ رہ سکے جو فلسفے کی صورت مین نمایان ہوئی ہے۔ عیسائی بھی اس خیال سے غافل نہ رہین۔ اُن کی کوششین ایشیا مین جو ظاہری ترقی کی صورت دکھا رہی ہین یہ صرف چندروز کے لیے ہے۔ ایشیا بھی اب تھوڑے دنون مین ایشیا نہ رہے گا۔ وہ یورپ ہوتا جاتا ہے۔ اور جو جو ایشیا یورپ کی صورت اختیار کرے گا وہ وہ عیسائیون کی کوششین بیکار ہوتی جائین گی۔ لہٰذا ہم تمام مذہبون کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اور درخواست کرتے ہین کہ اب وہ تمام باہمی نزاعون کو چھوڑ دین اور اُن نوجوانون کی طرف متوجہ ہون جو دہریت کا وعظ کہتے پھرتے ہین۔

اگست ۱۸۹۳ء

سکّہ اسلام مین

یہ امر ابھی واضح طور پر نہین بتایا گیا کہ اسلام مین سکّے کا رواج کیونکر اور کس وقت سے شروع ہوا۔ حالانکہ اسکے جاننے کی بہت کچھ ضرورت ہے۔ عوام مین اسکے متعلق طرح طرح کے خیالات پھیلے ہوے ہیں۔ اور اُن غلط فہمیون کے مٹانے کی بالکل کوشش نہین کی گئی جو شرعی دینار و درہم کے نام سے عوام کے ذہن مین مرتکز ہین۔ ابھی تک اس بات پر یقین کرنے والے کثرت سے موجود ہیں جو چاریاری روپے کو خلفاے راشدین کے عہد کا سکہ تصور کرتے ہین۔ یورپ مین فی الحال یہ مذاق عام ہوگیا ہے کہ قدیم زمانون کے سکّے ہم پہونچا پہونچا کے جمع کیے جاتے ہین۔ ان کوششون کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ خلفاے بنی اُمیہ و عباسیہ و عبیدیین مصر کے بعض سکّے ہاتھ آگئے۔ لیکن اس امر پر بغیر تاریخی ثبوت کے یقین نہین کیا جا سکتا کہ اسلام مین سب سے پہلے کس عہد مین ٹکسال قائم ہوئی اور کس ضرورت نے مسلمانون کو اسپر آمادہ کیا۔

اس مین کوئی شک نہین کہ مسلمان فاتحوں نے جس وقت ممالک عالم کو زیر و زبر

کرنا شروع کیا اُسوقت فتوحات کے خیال اور دُھن مین وہ اس قدر ڈوبے ہوے تھے کہ بہت سی ضروری باتون کی طرف اُن کا خیال بھی نہین گیا۔ اور جب دنیا کا مرقع اُلٹ پلٹ کے اُنھون نے اپنی طرف دیکھا تو سمجھے کہ ہم کس قدر آگے بڑھ آئے ہین اور یہین کیا کیا کرنا تھا جس کی طرف ہماری توجہ مبذول ہی نہین ہوئی۔ اگرچہ اس بے پروائی کا زیادہ تر باعث اُن کا جوش جہاد تھا۔ مگر عرب کی سادگی اور اُن کی بدویانہ صحرائی زندگی جسکو تمدن سے بہت کم لگاؤ تھا زیادہ تر اسکی معین ہوئی۔ انھین اسباب نے جہان اُن سے اور بہت سے امور نظر انداز کرا دیے وہان اُنکو سکے کی طرف بھی متوجہ نہ ہونے دیا۔

جاہلیت مین عرب کے ایک کونے کو روم سے اور ایک کونے کو ایران سے تعلق تھا۔ ان تعلقات کی وجہ سے عرب کے شہرون مین عموماً ایرانی اور رومی سکون کا رواج تھا۔ کچھ سکے[عہ] ملوک حمیر نے بھی عرب مین ایام جاہلیت مین بنائے تھے جو اُنھین رومی و عجمی سکون مین ملے ہوے کبھی کبھی نظر آ جایا کرتے تھے۔

آنحضرت صلعم کے بعد چارون خلافت ہاے راشدہ گذر گئین۔ جناب امام حسن علیہ السلام نے خلافت سے دست بردار ہو کے امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ معاویہ کا دور بھی ابتدائی شان و شکوہ دکھا کے آخر ہو گیا۔ یزید کی سلطنت دن بھی دبدبہ پیدا کر کے ختم ہوئی۔ مروان خلیفہ ہوا اور مر بھی گیا۔ یہ سب ہو گیا سکے وہی رومی ایرانی اور حمیری مروج تھے۔

پھر اُن سکون مین بھی یہ خرابی تھی کہ اس قدر مختلف اوزان اور قیمت کے تھے کہ تجارت و کاروبار اور خصوص بیت المال کا انتظام روز بروز اُلجھتا جاتا تھا۔ مسلمانون کو مفروضہ زکوٰۃ و صدقات کے ادا کرنے مین دقت[عہ] لاحق ہوئی تو جناب عمر فاروق کو مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ شرعی اغراض کے واسطے اُن تمام سکون مین سے ایک خاص سکہ مقرر کر دیا جو قیمت مین سب سے متوسط اور چلن مین سب سے زیادہ مروج تھا۔ لیکن اسپر بھی ٹھیک انتظام نہ ہو سکا اس لیے

عہ دیکھو فتوح البلدان بلاذری۔

عہ دیکھو مقدمہ ابن خلدون۔

اکثر لوگوں نے کھوٹے سکے بنا بنا کے ملک میں پھیلا دیے جن کی وجہ سے خزانۂ خلافت کو معمولاً نقصان اُٹھانا پڑتا تھا اور مروجہ سکے اُس قیمت سے بدرجہا زیادہ گھٹتے جاتے تھے جس پر کہ چل رہے تھے۔ ان دقتوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے آخر یہ نتیجہ ہوا کہ عرب میں سکے کی کچھ قیمت نہیں باقی رہی تھی جو کچھ قیمت تھی سونے چاندی کی۔ بلکہ قریب قریب سونا چاندی ہی وہاں کا سکہ بن گئے تھے۔ اور سونے چاندی ہی کے پرکھنے پر مروجہ سکوں کی قیمت قائم کی جاتی تھی۔

بعض مورخین کہتے ہیں کہ انھیں مشکلوں سے عاجز ہو کر عبد اللہ بن زبیر کے چند روزہ عہد خلافت میں اُنکے بھائی مصعب بن زبیر کے حکم سے حارث بن عبد اللہ بن ابی ربیعۂ مخزومی نے ۷۰ھ میں سکے بنانا شروع کر دیے۔ یہ سکے بالکل ایرانی سکوں کی وضع پر بنائے گئے تھے فرق اتنا تھا کہ اُن پر الفاظ "برکۃ" اور "اللہ" بڑھا دیے گئے تھے۔ مگر عام مورخین اور کل محققین کو عبد اللہ بن زبیر کے عہد میں سکہ بننے سے انکار رہے۔ حیرت ہے کہ ناسخ التواریخ میں لکھ دیا ہے کہ ۱۸ھ خلافت جناب فاروق اعظم میں اسلامی سکے کے درہم و دینار مروج ہوے جن میں سے بعض پر "لا الہ الا اللہ" بعض پر "الحمد للہ" بعض پر "قل ہو اللہ احد" اور بعض پر اوپر "اللہ" اور اُسکے نیچے جناب عمرؓ کا نام منقوش تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان کے صحیح ہونے کا گمان بھی کریں تو کیونکر؟ افسوس ہے کہ ناسخ التواریخ جس قدر مبسوط لکھی گئی ہے اُسی قدر جمع روایات میں بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں سکہ بننا بالکل بے اصل ہے۔ اگر کسی قدر اسکی اصلیت ہو سکتی ہے تو اس قدر کہ اُنکے عہد معدلت عہد میں ایک کسرویہ سکہ مروج تھا جس کا نام آخر میں بغلیہ ہو گیا۔ بغلیہ اس لیے کہ اس پر ایک جانب خچر کا سر بنا تھا اور دوسری طرف کسرے کی تصویر مع اُسکے تخت کے تھی۔ اور تخت کے نیچے لکھا تھا "نوش خور" (یعنی خوشی کے ساتھ نوش کر) اس بیان کی نسبت اول تو یہی نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں تک قابل اعتبار رہے اور اگر مان بھی لیا جائے تو اُسکی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے

عہ دیکھو فتوح البلدان۔

عہ دیکھو حیواۃ الحیوان مصنفہ دمیری شافعی۔

کہ جناب فاروق کے حکم سے بنا۔ پھر یہ بھی سمجھ مین نہین آتا کہ اُس پر خنجر کی صورت کیون بنائی گئی۔ لیکن اس مین شک نہین کہ نقلیہ نام کا ایک سکہ خلافت راشدہ کے زمانے سے بنی اُمیہ کے دور تک دنیاے اسلام مین مروج تھا۔ جس بات پر مورخین کو اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اسلام مین ترویج سکہ کے فخر کا مستحق عبد الملک بن مروان ہے جو بنی امیہ مین سب سے زیادہ نامور خلیفہ اور دولت مروانی کا دوسرا جد ہے۔

ترویج سکہ کا تفصیلی حال ہارون رشید نے اپنے دربار مین ایک موقع پر کسائی نحوی سے بیان کیا تھا جو بمقابلہ دیگر بیانون کے زیادہ واضح ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ مخصوصین دربار پر تقسیم کرنے کے لیے رشید کے سامنے توڑے لا کے رکھے گئے۔ ایک تھیلی پھٹی تھی اُس مین سے ایک دینار نکل کے باہر گر پڑا۔ اُسکے نقش خوب اُبھرے ہوے تھے اور حروف نہایت واضح طور پر پڑھے جا سکتے تھے۔ رشید نے اُس دینار کو جھک کے اُٹھا لیا اور اُلٹ پلٹ کے اُسکے نقوش کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے کسائی کی طرف جو حاضر دربار تھے متوجہ ہو کے کہا "جانتے ہو یہ کس عہد مین بنے تھے؟" کسائی نے عرض کیا "جی ہان عبد الملک بن مروان کے عہد مین"۔ رشید نے پوچھا "اور یہ بھی جانتے ہو کہ انکے بننے کا سبب کیا تھا؟" کسائی نے کہا "نہین مجھے اس کی خبر نہین"۔ تب رشید نے یہ واقعہ بیان کیا کہ درہم و دینار عبد الملک کے عہد تک نہین بنائے گئے تھے۔ عرب مین ایرانی درہمون اور رومی دینارون کا رواج تھا۔ عبد الملک نے جو یک بیک ٹکسال قائم کر دی اسکی وجہ یہ ہوئی کہ فرامین وغیرہ لکھنے مین جو کاغذ کام آتے تھے وہ مصر مین بنائے جاتے تھے (یہ گویا ایک قسم کے فارم تھے جنہیں بنانے والے ملا کرتے تھے) بنانے والے حسب رواج قدیم اُن کی پیشانی پر بطور نشان تجارت کے رومی زبان مین کچھ الفاظ لکھ دیا کرتے تھے۔ یہی الفاظ مصر کے بنے ہوے حریر کے تھانون اور ظروف وغیرہ پر بھی لکھے ہوتے تھے۔ اسلام مین بعد فتح مصر کبھی ان الفاظ کی طرف توجہ نہین کی گئی اور نہ یہ پوچھا گیا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ عبد الملک ایک متجسس طبیعت کا آدمی تھا۔ فرمان کے اُن فارمون مین سے اتفاقاً ایک اُسکی نظر سے گذرا

عسه دیکھو حیوۃ الحیوان۔

تو اس نے اپنے مترجم سے پوچھا "یہ کیا لکھا ہے؟" مترجم نے کہا "باپ بیٹا روح القدس"
اتنا سنتے ہی عبدالملک سناٹے میں آگیا - اور پھر بولا "یہ کلمۂ کفر اب تک مروج چلا آیا -
اور حیرت ہے کہ کسی کا خیال اسکی طرف نہ گیا" - اسکے بعد اُس نے فوراً اپنے بھائی
عبدالعزیز بن مروان کو جو والی مصر تھا لکھا "مصر کے تمام کاریگرون کو حکم دیدیا جائے کہ
آیندہ سے تمام فارمون کی پیشانیون - تھانون اور ظروف پر ان الفاظ کی جگہ کلمۂ
توحید "اشہد انہ لا الہ الا ہو" لکھا کرین - اور منادی کردی جائے کہ جو کوئی اسکے خلاف
کرے گا سخت سزا پائے گا" اس حکم پر فوراً عمل درآمد شروع ہوگیا - اس عہد کے
بنے ہوئے بعض فارم قیصر روم (جسٹینین دوم) کی نظر سے گذرے تو اُسے نہایت
ناگوار ہوا - قیصر نے بہت سے قیمتی ہدایا کے ساتھ عبدالملک کے دربار مین ایک
سفارت بھیجی اور خط مین یہ مضمون لکھا "ان الفاظ کا رواج تمام گذشتہ خلفا کے عہد
سے چلا آتا ہے یا تو وہ سب غلطی پر تھے یا آپ غلطی پر ہین - مجھے بتایئے کہ ان
دونون مین سے کون بات ہے" اس نے بعد درخواست کی تھی کہ ان ہدایا کو
قبول فرمایئے اور ان کے معاوضے مین اُس رسم قدیم کو جاری رہنے دیجیے" عبدالملک
کو اس خط پر بڑا غصہ آیا - مگر اُس نے ضبط کیا - سفارت مع اُن ہدایا کے واپس
کردی اور خط کا کچھ جواب نہین دیا - قیصر کی طرف سے وہ ہدایا دُونے کردیے
گئے اور پھر سفارت آئی کہ شاید ہدایا آپ کی نظر مین کم اُترے - لہذا اب مضاعفت
کرکے روانہ کیے جاتے ہین - مگر سفارت پھر اسی طرح بے نیل مرام واپس گئی - تیسری
مرتبہ قیصر نے ہدایا کو اور بڑھا دیا اور [illegible] مضامین کے بعد لکھا بلکہ یون کہنا
چاہیے دھمکی دی کہ "اگر [illegible] کا حکم نہ دیا جائے گا تو مین
اپنے ہان سکے پر تمھارے پیغمبر (صلعم) کے نام کے ساتھ ایسے الفاظ نقش کرادونگا
جو تم کو نہایت ناگوار ہون گے - اُس وقت تمہارے بنائے کچھ نہ بنے گی اور وہ
سکے تمھارے وہان گھر گھر مین اور ساری دنیاے اسلام مین پھیل جائین گے -
یہ تم کو معلوم ہے کہ عرب اور سارے مسلمان ہمارے سکے سے کام لینے پر مجبور
ہین" یہ دھمکی عبدالملک بن مروان پر اثر کرگئی - وہ انتہا سے زیادہ پریشان
ہوا - اور گھبرا کے کہہ اُٹھا "اب کیا کیا جائے؟" اہل دربار نے مشورہ دیا کہ آپ

اس امر میں آپ خالد بن یزید بن معاویہ سے رائے لیں وہ کوئی نہ کوئی تدبیر نکالیں ہی گے۔ خالد سے پوچھا تو انھوں نے کہا "کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ اپنے سکّے خود بنا کے مروج کر دیجیے۔ اور ممانعت کر دیجیے کہ رومی سکوں کا چلن قلمرو خلافت کے اندر نہ باقی رہے" غرض اسی رائے کے مطابق اسلامی سکوں کے لیے جناب فاروق کے معین کیے ہوے اوزان قائم کیے گئے ٹکسال جاری ہوئی اور یوں اسلام کو غیر ممالک کے سکوں سے آزادی حاصل ہوئی۔

اس واقعے کی تصدیق کسی حد تک انگریزی مورخوں کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ ۷۳ھ (۶۹۲ و ۶۹۳ء) میں جسٹینین دوم قیصر روم اور عبدالملک کے بھائی محمد بن مروان سے لڑائی ہوئی۔ محمد نے ابتداءً تو برابر رومیوں کو شکستیں دیں۔ لیکن آخر صلح ہوگئی۔ اس صلح کے بعد ۷۵ھ یا ۷۶ھ میں خلیفۂ عبدالملک کی طرف سے قیصر مذکور کے پاس ایک خط گیا جس میں ایسے الفاظ تھے جن سے قیصر کو اپنی توہین کا گمان ہوا۔ اُس نے وہ صلح توڑ دی اور اسکے ساتھ عبدالملک کو دھمکی دی کہ میں ایسے سکّے مروّج کروں گا جن پر اسلام کی توہین کے کلمات کندہ ہوں گے۔ اسلام میں اسوقت تک سکّے نہیں جاری کیے گئے تھے۔ (ایرانی اور رومی) سکوں سے کام چلایا جاتا تھا۔ غرض اُسوقت عبدالملک سکہ بنوانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُس کے حکم سے تیما کے ایک یہودی سُمیر نامے نے ٹکسال قائم کی۔

ع۵ تمام معتبر اور مستند مورخوں کی رائے ہے کہ عبدالملک نے خالد بن یزید کی ہدایت کے مطابق سکہ بنوایا۔ خالد بنی امیہ میں بہت بڑا عالم و فاضل اور گویا اسلام کا پہلا فلیسوف ہے۔ یہ یزید بن معاویہ کا بیٹا تھا۔ مگر سب کے خلاف دمیری شافعی نے بیہقی سے جو روایت کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد نہیں بلکہ امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کی ہدایت سے بموجب عبدالملک نے سکّے بنوائے۔ یہ روایت تمام مورخین کے بیان کے خلاف ہے۔ اور اسی لیے ہم نے جمہور کے بیان کا تتبع کیا ہے جو قرین قیاس ہے۔

ع۶ دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانکا۔

انگریزی مورخون کا یہ عام قاعدہ ہے کہ مسلمانون کے عہد کی تمام ترقیون کو کسی نہ کسی طریقے سے حتی الامکان اپنی طرف اور نہین تو کسی غیر قوم کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہین۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اس کوشش مین کبھی اپنی امکانی قوت مین تھاک کے زبردستی اور غلط بیانی سے بھی کام لینے لگتے ہین۔ سکے کی ایجاد جو سُمیر کے نام کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے یہ بھی ایک اسی قسم کا واقعہ ہے۔ بعض قدیم تاریخون سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنون ایک قسم کے درہم یا دینار سُمیریہ کے نام سے مشہور تھے۔ اور سمیریہ اسی لیے کہلاتے تھے کہ اُنکے بنانیوالے کا نام سمیر تھا۔ مجرد اتنے بیان تک یہ واقعہ مبہم معلوم ہوتا ہے مگر علامۂ ابن اثیر نے اپنی تاریخ مین صاف کر کے کھول دیا۔ جسکے بعد شبہہ کی بالکل گنجایش نہین باقی رہتی۔ وہ سنہ ۷۶ ہجری کے واقعات مین جہان عبد الملک بن مروان کے حکم سے اسلامی سکہ بنائے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہین وہان لکھتے ہین کہ حجاج نے اپنے سکے مروج کرنے کے بعد قطعی ممانعت کر دی کہ رعایا مین سے کوئی شخص سکہ بنانے کی جرأت نہ کرے۔ اس حکم کے خلاف سُمیر نامے ایک یہودی سکہ زنی کے جُرم کا مرتکب ہوا۔ جب اُسے گرفتار کر کے حجاج کے سامنے لائے تو اُس نے کہا میرے بنائے ہوے سکے شاہی سکے سے زیادہ خالص اور کھرے ہین۔ اور جب مین نے دراصل سکہ بنا کے نقصان کی جگہ رعایا کو فائدہ پہونچایا تو پھر آپ مجھے کیون قتل کرنا چاہتے ہین؟ حجاج نے اُس کی اس حجت کو نہ مانا۔ اس مین شک نہین کہ سُمیر ایک ذہین آدمی تھا۔ اُس نے مقید ہی کی حالت مین تولنے کے بٹے ایجاد کیے۔ اس لیے کہ اُس زمانے مین دینار و درہم کی طرح بٹے بھی غیر منتظم حالت مین تھے۔ ممالک مین کوئی عام وزن نہین قائم ہوا تھا۔ سُمیر نے بٹے بنا کے حجاج کی خدمت مین پیش کیے اور رہائی کے لیے ملتجی ہوا۔ مگر حجاج نے اسپر بھی نہ مانا۔ تاہم اس مین کوئی شک نہین کہ سُمیر کے بنائے ہوے بٹے مروج ہو گئے اور رعایا کو تاجرون اور بازارون کے غبن سے بہت کچھ نجات مل گئی۔ سُمیر کی نسبت اس سے زیادہ پتہ نہین لگتا کہ حجاج کی قید مین اُس کا کیا حشر ہوا۔ غالبًا قتل کیا گیا ہوگا۔ کاش اگر یہ کہا جاتا کہ سُمیر نے مسلمانون کو بٹے دیے، تو ہمین بے شک تسلیم کرنا پڑتا کہ دنیا کی

انتظام مین ایک حد تک خلافت اُسکی زیر بار احسان تھی۔ مگر یہ تو بالکل لغو ہے کہ سُمیر نے سکہ بنا دیا۔ جو سکّے سمیریہ کے نام سے مشہور تھے غالبًا وہ وہی تھے جن کو سمیر نے مجرمانہ طور پر بنا کے پھیلا دیا تھا۔

بعض مورخین اسلام نے پہلے پہل سکہ بننے کا حال یون لکھا ہے کہ عبدالملک کی طرف سے جو خطوط قیصر کے پاس جاتے تھے اُنکی پیشانی پر لکھا ہوتا تھا۔ " قل ہو اللہ احد" اسکے بعد محمد صلعم کا نام مبارک اور اُس کے نیچے تاریخ لکھی جاتی تھی۔ قیصر کو یہ ناگوار ہوا۔ اُس نے جواب مین لکھا" اس وضع کو چھوڑ دو ورنہ مین دینارون پر تمھارے پیغمبر کی نسبت ایسے کلمات نقش کراؤن گا جو تمھین ناگوار ہون گے"۔ یہ امر عبدالملک کو بہت ہی دشوار معلوم ہوا۔ اُس نے لوگون سے مشورہ کیا۔ خالد بن یزید نے راے دی کہ آپ خود اپنا سکہ جاری کرین"۔ عبدالملک نے حجاج کو ٹکسال قائم کرنے کا حکم دیا۔ حجاج نے اس حکم کے مطابق درہم و دینار بنانا شروع کیے اور اُن پر یہ عبارت نقش کرائی" اللہ احد اللہ الصمد" یہ سکہ عام اہل اسلام کے خلاف ہوا اس لیے کہ یہ قرآن کی عبارت تھی جس کو بے طہارت دو چھونا حرام ہے۔ تاہم اس ناراضی کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ یہ سکہ ۷۴ھ مین بنا اور ۷۵ھ مین تمام ممالک مین پھیلا دیا گیا۔

چند روز بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ سکہ خالص نہین ہے۔ چنانچہ یزید بن عبدالملک کے عہد مین جب ابن ابی ہبیرہ والی عراق مقرر ہوا تو اُس نے اس سکے کے خالص کرنے کی کوشش کی۔ پھر ہشام کے زمانے مین خالد قسری نے اور خالص کرنا چاہا۔ ان دونون کے بعد یوسف بن عمر نے سب سے بڑھ کر اس مین اہتمام کیا اور ٹکسال کا اچھی طرح امتحان کرکے اپنے عہد کا سکہ بالکل خالص بنا دیا۔ اسی وجہ سے ہبیری۔ خالدی۔ اور یوسفی سکے عہد بنی اُمیہ کے سب سے خالص اور کھرے سکے تصور کیے جاتے تھے۔ یہی خیال تھا جس نے بنی عباس کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور کو حکم عام دینے پر آمادہ کیا کہ خراج مین مذکورہ تین سکون کے سوا اور کوئی سکہ نہ لیا جائے۔

قبل اسلام سلاطین ارض کا عام قاعدہ تھا کہ سکّون پر مختلف قسم کی تصویرین بنایا کرتے تھے - کبھی تو بادشاہ کی تصویر کندہ ہوتی تھی - کبھی کسی قلعے کا نقشہ بنایا جاتا تھا - کبھی کوئی جانور بنا ہوتا تھا کبھی کوئی اور چیز بنی ہوتی تھی - مسلمانون نے جب سکہ بنایا تو تصویرین بنانا چھوڑ دین اور انکے عوض پر زور کلمات کندہ کرائے - زیادہ تر اس کی وجہ تو یہ تھی کہ شریعت اسلامیہ مین تصویرون کی مخالفت ہے - مگر قطع نظر اسکے ایک اور بھی خیال تھا جس نے انکو تصویرون کی جگہ الفاظ کندہ کرانے پر آمادہ کیا - عرب فصاحت و بلاغت کو اپنا قدیمی تمغہ خیال کرتے تھے - انکو دعوے تھا کہ شوکتِ الفاظ مین کوئی ہمارا مقابلہ نہین کر سکتا - اور اسی وجہ سے الفاظ و کلمات ہی کو اُنھون نے اپنا معرکہ قرار دیا - یہ سکہ مدوّر وضع کا تھا - ایک رخ پر تو اللہ جل شانہٗ کا نام منقوش ہوتا تھا اُسکے نیچے رسول مقبول صلعم پر درود کندہ ہوتا تھا - اور دوسرے رخ پر تاریخ اور بادشاہِ وقت کا نام لکھا جاتا تھا - آیاتِ قرآنی لکھنے کا سلسلہ حجاج کے بعد سے موقوف ہو گیا - اسلامی سکہ بنی اُمیہ عباسیہ اور عُبیدیین مصر کے زمانون مین اسی قطع کے دور رہے - لیکن مغرب مین جب دولت موحدین قائم ہوئی تو مہدی نے لوگون کے لیے مربع قطع کے سکّے مسکون کیے جن کا برابر اُسی خاندان مین رواج رہا -

یہان پر ہم سکّے کے بیان کو ختم کرتے ہیں اور آخر مین اتنا اور لکھتے ہین کہ وہی سکہ جو عبد الملک کے عہد مین مروج ہوا وہی شرعی سکہ کہلاتا تھا اس لیے کہ جناب فاروق رض کے قائم کیے ہوے اوزان پر بنایا گیا تھا -

عربی سے فارسی و اُردو کے تعلقات ستمبر ۹۳ء

بعض لوگون کو اندنون ہم اس خیال مین محو پاتے ہین کہ فارسی یا اُردو زبان مین سے عربی کے الفاظ بالکل نکال ڈالے جائین - یہ خیال کچھ ان مشرقی زبانون ہی کے ساتھ مخصوص نہین ہے بلکہ ہم انگریزی مین بھی دیکھتے ہیں کہ ایسی کوشش ایک عرصہ سے جاری ہے - انگریزی زبان میں بے انتہا لاطینی (رومی) الفاظ ملے ہوے ہیں -

جو انگریزی قوم پر سے رومیون کی غلامی کا داغ کسی طرح مٹنے نہین دیتے۔ اور کوئی تعجب نہین کہ لاطینی الفاظ کے نکالنے پر جو چیز آمادہ کر رہی ہے اُس مین زیادہ حصّہ اسی خیال کا ملا ہو۔

فارسی اور اُردو مین جو عربی الفاظ ملے ہوے ہین وہ بھی اس امر کا ثبوت دیتے ہین اور ہمیشہ دین گے کہ ایران و ہندوستان کو کسی زمانے مین اسلام کی غلامی نصیب ہوئی تھی۔ جو لوگ ان الفاظ کو نکالنا چاہتے ہین غالبًا اُن کا بھی یہی خیال ہوگا کہ اپنی زبان کو عربی یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ اسلام کی قید سے آزاد کرانا چاہتے ہین۔ مگر شاید ایسی کوششین ہمارے خیال مین بڑی مشکل سے کامیاب ہو سکین۔ فردوسی نے ایک شاہنامہ لکھا جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ عربی الفاظ سے بچنے کی پوری کوشش کی تھی۔ لیکن اب شاہنامے کے دیکھنے والے بتا سکتے ہین کہ فردوسی کو اس ارادے مین کہان تک کامیابی ہوئی۔ بڑی تحقیق کے بعد جو کچھ فیصلہ کیا جا سکا وہ اسی قدر ہے کہ شاہنامے مین عربی الفاظ بہت کم ہین۔ یہ کوئی نہین کہہ سکتا کہ عربی الفاظ اُس مین بالکل نہین۔ ادھر آخر زمانے مین ناصرالدین شاہ ایران کے چچا نے نثر مین ایک تاریخ بنام نامۂ خسروان لکھی۔ اس مین بھی عربی الفاظ بالکل متروک کر دیے ہین۔ اور بے شک وہ اس وجہ سے بہت کچھ قابل تعریف ہین کہ اپنی وضع کو آخر تک نباہ لیجا سکے۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ اُسکی عبارت مروجہ فارسی سے کہان تک موافق رہی ہے اور محاورات کی کسوٹی پر کس قدر پوری اُترتی ہے تو شاید اُنکو جواب دینا دشوار ہوگا۔ زبان کی اصلاح وہین تک جائز ہے جہان تک کہ محاورہ اور اہل زبان کی پیروی کیے ہو۔ جب ایرانیون کی زبان پر ہزارہا ایسے عربی الفاظ چڑھے ہوے ہین جن کی جگہ پر کوئی ٹھیٹھ فارسی لفظ بولنے والون کو روزمرہ کے استعمال کے لیے نہین ملتا تو اُنکے نکالنے کی کوشش کرنا زبان کی اصلاح نہین بلکہ ایک قسم کا جنون ہے۔ دری زبان کے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے استعمال کرنا کوئی مشکل کام نہین ہے اگر دشواری ہے تو یہ کہ اُنکے استعمال مین محاورے کا لحاظ رکھا جائے۔

تاہم یہ کتابین تاریخ مین ہین کسی علم و فن کی دنیا مین قدم رکھتے وقت

انسان کو معلوم ہو سکتا ہے۔ فارسی زبان کس قدر بے مایہ ہے۔ بغیر اسکے کہ عربی الفاظ سے مدد لی جائے کوئی شخص ایک علمی مسئلہ بھی فارسی مین نہین بیان کر سکتا۔ جو صاحب اس قسم کی کوشش کرنا چاہتے ہین اُن کا کام ہے کہ زبان کو اپنے اصول سے درست کریں۔ آج تک کسی نے اتنا تو کیا نہین کہ فارسی کی صرف و نحو ہی درست کی ہوتی۔ آج تک جس کسی نے نحو مین کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اس نے وہی عربی کے قواعد عربی ہی اصطلاحات کے ساتھ فارسی میں بیان کر دیے۔ حالانکہ سمجھنے والے خوب جانتے ہین کہ گو ہزارہا عربی الفاظ فارسی مین مستعمل ہین مگر زبان اپنے طرز سے ایسی علٰحدہ واقع ہوئی ہے کہ عربی کے قواعد فارسی پر ٹھیک منطبق نہین ہو سکتے بلکہ عربی کی جگہ اگر انگریزی نحو و صرف سے فارسی مین کام لیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ بہرحال فارسی کے ہمدرد آج تک اُسکے لسانی قواعد تو درست ہی نہین کر سکے عربی کی غلامی سے اُسے کیا خاک آزاد کرائینگے؟

ایک پارسی صاحب نے ایک انگریزی اخبار مین ابھی اس خیال پر زور دینا چاہا تھا جو ماشاء اللہ نہ فارسی ہی جانتے ہین اور نہ عربی ہی۔ اُنھون نے محض اپنے حسنِ عقیدت سے یہ دعوٰے کر دیا کہ فارسی اس قدر مکمل زبان ہے کہ بعض موقعون پر عربی کو اُسکے خزانے سے الفاظ عاریت لینا پڑے۔ چنانچہ انھون نے شاید کسی سے سُن کے لگام کے لفظ کو پیش کیا ہے جسکو عربون نے معرب کر کے لجام کر لیا۔ اور آج تک مروج ہے۔ یہ خیال بعض ایرانی صاحبون مین بھی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ایک عجمیون کی زبان سے ہم نے خود بھی سنا ہے۔ وہ کہتے ہین کہ جاہلیت مین سیف بن ذی یزن کی فریاد پر جب ایرانیون نے ملک یمن پر قبضہ کر لیا تو اُس زمانے مین فارسی کے بہت سے الفاظ عربون کی زبان پر مروج ہو گئے۔ قطع نظر اسکے عرب کے حصۂ حیرہ وغیرہ پر مدتون سے ایران کی حکومت تھی۔ یہ بھی ایک کافی ذریعہ عربی مین فارسی الفاظ کے جانے کا تھا۔ لیکن یہ خیال ایک جاننے والے کے نزدیک بالکل لغو اور بے سر و پا ہے۔ اول تو جہان عرب کے حصہ حیرہ وغیرہ کی حکومت ایرانیون کے ہاتھ مین تھی وہان سرحد شام سے ملے ہوئے اضلاع عرب پر روم کی حکومت تھی۔ علیٰ ہذا القیاس یمن پر جہان چند

روز کے لیے ایرانیوں کی حکومت رہی وہاں اُن سے پہلے بوساطت نجاشی عرصے تک روم کی بھی حکومت رہی - کوئی وجہ نہیں کہ عربی نے ایرانیوں سے اُنکی زبان کے الفاظ تو لیے ہوں اور رومی زبان کے الفاظ یونہیں چھوڑ دیے ہوں -

قطع نظر اسکے شاید اس خیال والوں کو یہ نہیں معلوم کہ اضلاع عرب پر غیر ممالک کی حکومت تھی بھی تو کس طرح کی - سیف بن ذی یزن کے عہد میں جو ایرانیوں نے ملک یمن کو فتح کیا اُس کی یہ حالت تھی کہ یمن پر بادشاہ حبشہ سے متصرف ہوکے جب وہاں کے شرفا کی آبروریزی شروع کردی تو سیف بن ذی یزن نے کسریٰ کے دربار میں جاکے فریاد کی اور بہت دنوں تک پڑا رہا - آخر کسریٰ نے ایک فوج دے کے اپنے ایک افسر کے ساتھ اُسے یمن پر روانہ کیا - اس فوج نے حبشہ والوں کا قلع و قمع کیا اور سیف بن ذی یزن کو بادشاہ بنایا - اس میں شک نہیں کہ ملک کو ایرانیوں نے فتح کیا مگر حکومت سیف بن ذی یزن کی رہی جو عربی نژاد تھا - بس اتنا تھا کہ وہ ایران کے آگے سر جھکائے ہوئے تھا - ورنہ یہاں کے انتظامات اور معاملات سے شہنشاہ ایران کو کوئی تعلق نہ تھا - باقی رہے اضلاع حیرہ وغیرہ یہاں کی بھی یہی حالت تھی - ان مقامات پر نعمان بن منذر کا خاندان حکمران تھا - سیف بن ذی یزن کی طرح یہاں کے فرمانرواؤں نے بھی یہی کیا کہ تاج ایران کے آگے سر جھکائے رہے - غرض ایرانی رعایا سے عربی رعایا کے تعلقات کبھی اتنے نہیں بڑھنے پائے کہ الفاظ و خیالات کا باہم تبادلہ ہوتا یا عجمی الفاظ عربی میں پہنچتے -

دوسرے سب سے زیادہ جس بات نے عربی زبان کو خارجی اثروں سے بچایا وہ یہ تھی کہ عرب میں سب سے زیادہ مستند اور قابل تتبع قریش کی زبان تھی جن کو خدا نے ہمیشہ غیر قوموں کی اطاعت سے بچایا - قریش نے کبھی کسی کے آگے سر اطاعت نہیں جھکایا - اور نہ اُن کو سوا خاص تاجرانہ سفروں کے غیر زبان بولنے والوں سے ملنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی - لہذا اُنکی زبان ہمیشہ ان خارجی اثروں سے محفوظ رہی - اور عربی زبان میں کوئی لفظ شامل ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ قریش کے لوگ اُسکو تسلیم نہ کرلیں - غرض ان وجوہ

سے کبھی قیاس ہی مین نہین آ سکتا کہ فارسی کے الفاظ عربی مین شامل ہوے ہون۔

ہان بعد اسلام البتہ عربی مین فارسی کے بعض الفاظ مستعمل ہو گئے جس کی وجہ یہ ہوئی کہ خلافت عباسیہ نے اپنا مستقر بغداد کو قرار دیا جو در اصل ایک ایرانی شہر تھا۔ صرف اتنا ہی نہین ہوا بلکہ عجمی خاندان وزارت کے درجے کو پہونچ گئے۔ جس کی وجہ سے عربون کو ایرانیون سے ملنے جُلنے کی بہت ضرورت ہوئی اُس پر طرہ یہ ہوا کہ خلفا اور اُن کی وجہ سے تمام امراے عرب عیش و عشرت کے سامانون کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جن کے لیے مملکت ایران اگلی دنیا مین مشہور تھی۔ یہ وہ سامان تھے جو کبھی اہل عرب کے خواب و خیال مین نہ گذرے تھے۔ اور ان مین بہت سی ایسی چیزین تھیں جن کے لیے عربی زبان کو فارسی ہی سے الفاظ لینا پڑے۔ ہمنے عربی زبان مین "شمعدانات" کا لفظ بھی دیکھا ہے جو اسی عہد مین عربون کی زبان پر جاری ہوا۔ بلکہ حکومت کی وجہ سے اس سے پیشتر بھی تعلقات قائم ہو گئے تھے کہ بنی اُمیہ ہی کے دور مین عربون کی زبان پر فارسی کے الفاظ چڑھ گئے۔ بنی اُمیہ کے ابتدائی زمانے کا شاعر ابن مفرغ جو زیاد کے بیٹے عباد کے ہمراہ سیستان کے جہاد پر آیا تھا۔ شہداء سندھ کے مرثیے مین کہتا ہے۔ ؎

کم بالجُرُومِ وارضِ الھند من قَدَمٍ
وَمِن سَرَانک قتلٰی لاھم قُبِرُوا

(ممالک گرم مین اور ارض ہند مین بہت سے نقش قدم ہین اور بہت سے سرہنگان قوم ہین جو شہید ہوے اور وہ دفن نہین کیے گئے)

اس شعر مین اول تو "جروم" جرم کی جمع ہے جو لفظ گرم کا معرب ہے۔ دوسرے مصرعے مین سرانک ہے جو فارسی لفظ سرہنگ کو بگاڑ کے بنایا گیا ہے۔ بہر حال فارسی الفاظ اگر عربی مین آئے تو فتوحات اسلام کے بعد آئے۔

مگر ان الفاظ کے عربی مین مروج ہو جانے سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ عربی ان الفاظ کی محتاج تھی۔ عربی زبان کے خزانے مین اس کثرت سے الفاظ موجود ہین کہ یہی زبان تھی کہ تمام علوم فلسفیہ و طبیہ یونانی و رومی زبانون سے لیے بغیر اس کے کہ اسے ایک اصطلاح کے لیے بھی ان زبانون کا زیر بار احسان ہونا پڑا ہو۔

جناب شہربانو

ہم نے ایک مضمون "خاندان نبوت" کے متعلق لکھا تھا۔ یا دی النظر مین ہمارا خطاب انگریزی مورخون کی طرف تھا۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان بھی ہم سے خفا ہو گئے۔ سنتے ہیں ہماری تکفیر کے لیے فتوے لیے گئے۔ مگر کسی نے اتنی عنایت نہ کی کہ اُن فتوون کو ہمارے پاس بھی بھیجدیا ہوتا کہ دیکھتے آخر ہماری خطا کیا ہے؟ اور کون کون صاحب ہین جو ہماری تکفیر فرماتے ہین؟

لاؤ تو قتل نامہ مرا مین بھی دیکھ لون
کس کس کی مُہر ہے سر محضر لگی ہوئی

تاہم ہمکو سچا سے خود اطمینان ہے۔ اور ہم بہت خوش ہین کہ اس مضمون مین ہمنے جو کچھ لکھا اُس مین سے ایک لفظ بھی بے اصل نہین۔ بعض احباب کی زبانی معلوم ہوا کہ ہم نے جو جناب شہربانو کے زبید کے نکاح مین آنے کا حال لکھا تھا اُسی پر لوگون کو غصہ آگیا۔ اگر یہی ہے تو افسوس کی بات ہے۔ یہ امر تو ایسا ہے کہ مستند مورخین مین سے کسی کو انکار نہین۔ ہم وہ کتابون کی عبارتون کا ترجمہ کیے دیتے ہین۔ اور کتابین بھی کون؟ جن سے زیادہ مستند تاریخین تاریخ کی دنیا مین نہین مل سکتین۔

محمد بن جریر طبری کی "تاریخ" مطبوعہ لیڈن کے صفحہ ۸۷۲۴ میں ہے "علی بن حسین بن علی بن ابی طالب۔ آپ کی والدہ غزالہ تھین جو اُم ولد تھین۔ بعد امام حسینؑ کے زبید اُنکے غلام نے اُنکو اپنے عقد نکاح مین لیا۔ تب عبید اللہ بن زبید پیدا ہوے جو علی بن حسین کے بھائی (اخیافی) ہین"۔

معارف ابن قتیبہ مطبوعہ لیڈن کے صفحہ ۱۱۰ مین مندرج ہے "اور علی بن حسین اصغر امام حسین کی نسل آپ ہی سے چلی۔ بعض کہتے ہین آپ کی والدہ سندیہ تھین۔ جن کا نام بعض سلافہ اور بعض غزالہ بتاتے ہین۔ بعد امام حسینؑ کے اُنکو امام حسینؑ کے غلام زبید نے اپنے عقد مین لیا۔ اور عبید اللہ بن زبید پیدا ہوئے جو علی بن حسین کے اخیافی بھائی ہین"۔

۱؎ مسلمانون

آغانی جو باعتبار اسناد اسی پایے کی کتاب ہے اُس میں بھی یہی واقعہ مندرج ہے - قدیمی تاریخیں جن پر کہ استناد و اعتبار کا دارومدار ہے وہ یہی ہیں - اور یہی اصلی سرچشمہ ہیں جن سے سلسلے کے متاخرین نے مصنف بننے کا فخر حاصل کیا - ابتدائً ہم نے اس واقعے کو ابن خلکان سے نقل کیا تھا - جو نہایت متداول کتاب ہے - اور غالباً ہر جگہ دستیاب ہو سکے گی - جن صاحب کو اطمینان حاصل کرنا ہو اُس کے ورق اُلٹیں اور امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے حالات میں دیکھیں - ابن خلکان نے شاید غلطی سے جناب شہربانو کے دوسرے شوہر کا نام زید لکھ دیا ہے - اگرچہ یہ بتایا ہے کہ وہ جناب امام حسین کے غلام تھے - مگر اب ہم کو بعد تحقیق معلوم ہو گیا کہ اُن بزرگ کا نام زید نہیں زُبید تھا -

سب سے بڑھ کر لطف کی یہ بات ہے کہ جو خدشہ اس معاملے میں معترضون کو گذرا ہے یہی خدشہ انکی طرح خاص اُسی زمانے میں عبدالملک بن مروان کے دل میں بھی گذرا تھا - لہذا ہم بھی اُنکو وہی جواب دینا مناسب خیال کرتے ہیں جو عبدالملک مذکور کے مقابلے میں جناب امام زین العابدین کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوا تھا - مذکورۂ بالا کتاب معارف ابن قتیبہ میں ہے "علی بن حسین (رضی اللہ عنہ) نے اپنی والدہ کا عقد اپنے غلام سے کر دیا - اور اپنی ایک لونڈی کو آزاد کر کے خود اپنے عقد نکاح میں لے لیا - یہ سُن کے عبدالملک بن مروان نے اُنکو ایک خط لکھا - جس میں اس معاملے پر شرم دلائی تھی - علی بن حسین نے جواب میں تحریر فرمایا - قد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃٌ حسنۃٌ - رسول اللہ صلعم نے صفیہ بنت حیی کو آزاد کر کے اپنے نکاح سے مشرف فرمایا تھا - اور زید بن حارثہ کو آزاد فرمایا اور اپنی چچا زاد بہن زینب بنت جحش کو اُن کے نکاح میں دے دیا" اب اس سے بڑھ کے کیا شافی جواب ہو سکتا ہے؟ یہ متاخر الذکر واقعہ بھی ابن خلکان میں موجود ہے -

اس موقع پر ہمیں ایک اور امر کا جواب دینا ہے - ایک صاحب نے دلگداز کے اُس مضمون پر بھی جو فتح قسطنطنیہ کے متعلق ہے ایک اعتراض کیا ہے - اور اس اعتراض کو اودھ پنچ کے مضمون پر شایع کیا ہے - دلگداز کے مضمون میں ہے کہ

قسطنطنیہ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو حملہ ہوا تھا اُس میں جناب امام حسین علیہ السلام بھی شریک مجاہدین تھے۔ اُس مضمون کے نیچے فٹ نوٹ مین تصریح کر دی گئی ہے کہ گبن کا تتبع کیا گیا ہے۔ ہمارے دوست پہلے گبن ملاحظہ کر لیتے تب اعتراض کرتے۔ شہادت جناب امام حسین علیہ السلام کے بیان مین وہ دیکھین معلوم ہو جائیگا۔ باقی رہا کہ کسی اسلامی تاریخ سے ثابت کیا جائے اسکے ہم مکلّف نہین۔ اس لیے کہ مضمون مین گبن کے تتبع کی تصریح کر دی گئی ہے۔

اس موقع پر ہمین معزز ہمعصر اتحاد کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ایسے نازک وقتون پر وہ ہماری مدد پر آمادہ ہو جاتے ہین۔ لیکن اُنکو ایسی فضول بحثون مین نہ پڑنا چاہیے۔ جواب کسی لائق آدمی کے مقابلے مین ہو تو ایک بات بھی ہے۔ اور یون ہر نادان کی چھیڑ چھاڑ پر اُٹھیں اپنے قلم کو زحمت دینے کی ضرورت نہین ہے۔

اسلام اور تھیٹر

(۱)

فی الحال یہ بحث پیش ہے کہ اسلام کو تھیٹر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اور برگزیدگان دین کا بہروپ بھر کے ایکٹرون کا ناٹک کے اسٹیج پر آنا اسلامی ملک کی نظر مین کیسا ہے۔ یہ منحوس بحث تو جہان تک نہ چھیڑی جاتی وہین تک اچھا تھا۔ اس لیے کہ کوئی مسلمان اس بحث پر کچھ لکھنے کے لیے قلم ہاتھ مین لینے کے بعد اپنے ہوش مین نہین رہ سکتا۔ ہم اسوقت لکھ رہے ہین اور ہماری آنکھون مین خون اُترا آ رہا ہے۔ جو جو ہمارا قلم آگے بڑھتا جاتا ہے وہ وہ ہمارے دماغ سے نیک و بد کے تمیز کرنے کی حس زائل ہوتی جاتی ہے۔ بعض پنجابی ہمعصرون نے اس معاملے مین نہایت قیمتی اور پُر جوش مضامین لکھے ہین۔ اور ان جاہلون کو اسلامی دینی حمیت کا نہایت اچھا سبق دیا ہے جو حیرت سے پوچھتے تھے کہ مسلمانو

کو اس پر کیون طیش آگیا۔

تھیٹر کیا چیز ہے؟ اس سے پہلے تو ہم اسی قدر جانتے تھے کہ روساء کی شادیون اور اکثر عام خوشی کی تقریبون مین ذلیل بھانڈ کسی خوبصورت لڑکے کو لا کے نچاتے ہین۔ اور اُس کے ناچ کے درمیان مین کبھی کبھی خود سامنے آ کے کوئی مسخرے پن کا واقعہ بیان کرکے یا کسی کا بہروپ بھر کے اوچھی طبیعت والے رؤسا اور بچّون کو ہنسی کے مارے لٹا لٹا دیتے ہین۔ ہمارے قدیم اسٹیجون کے اصلی ایکٹر یہی لوگ تھے۔ یہ عام ہندوستانی سوسائٹیون مین نہایت ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ اور کوئی مہذب شخص اُن لوگون کو اپنے پاس بٹھانا بھی جائز نہ سمجھتا تھا۔ لیکن باوجود اس ذلت کے اُنکا جوش مذہبی مشہور تھا۔ چند روز پیشتر کے مسلمان بھانڈون کا یہ واقعہ ہندوستان کے ہر ہر بچے کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی غیر مذہب رئیس کے ہان کوئی خوشی کی تقریب تھی۔ بھانڈون کا قاعدہ ہے کہ جسکے ہان جاتے ہین پہلے اُسی کی نقل کرتے ہین۔ شاید اسی امر سے ناراض ہوکر یا خدا جانے کس وجہ سے صاحب خانہ رئیس نے اُن لوگون سے فرمایش کی کہ "اپنے پیغمبر اور اُنکے دوستون کی نقل نہین کرتے"۔ اسلامی حمیت ان نقالون کے دل میں بھی کسی نہ کسی قدر ضرور ہونا چاہیے تھی۔ اُنکو یہ متعصبانہ فرمایش سُن کے ملال بھی ہوا ہوگا۔ لیکن اس ملال کو اُنھون نے نہایت خوبصورتی سے مخفی رکھ کے تیور نہ پہچاننے والے متعصبون سے عرض کیا کہ "بہتر۔ آپ کچھ تلوارین اور نیزے منگوا دیجیے"۔ خود فراموش رئیس اس پر بھی نہ سمجھا۔ اور اُس نے اسلحہ منگوا دیے۔ اس سامان کے ملتے ہی بھانڈون نے اپنا دلی جوش پورا کرنے کے لیے نہایت ہی خونخوار پارٹ شروع کر دیا۔ ایک شخص (معاذاللہ) محمد رسول اللہ صلعم بنا۔ باقی سب اُنکے جان نثار اور وفادار صحابی بنے۔ مصنوعی پیغمبر آخر الزمان نے تبلیغ رسالت کرکے اپنے پیرودن کو حکم جہاد سنایا۔ اتنا سنتے ہی سب تلوارین کھینچ کھینچ کے اُٹھ کھڑے ہوے۔ جسکے بعد اُن بنے ہوے پیغمبر صاحب نے حملے کا آخری حکم دے دیا۔ اور وہ اسلامی (مصنوعی) لشکر جو اُسوقت تک ایک شام فائٹ (جنگ مصنوعی) کا تماشا دکھا رہا تھا سچے

مجاہدین کا گروہ بن گیا۔ سبھون نے چارون طرف سیر دیکھنے والے اہل مجلس پر حملہ کیا اور دم بھر مین مع اہل خانہ رئیس کے سب کو کاٹ کے ڈال دیا گذشتہ برس ایک اسٹیج پر پیغمبر آخر الزمان کا بہروپ دیکھنے کی فرمایش کی گئی تھی اُس کا یہ نتیجہ ہوا۔ اور اسی لئے ہم کہتے ہین کہ ہمارے متعصب انگلش دوستون کو اگر پیغمبر آخر الزمان کا ناٹک دیکھنا ہے تو خود ہم سے بُلا کے کہین اور دیکھین کہ ہم کیسا اچھا اور کسقدر سچا پارٹ کرتے ہین۔ ایسا پارٹ جسکو دیکھ کے اُنھین کچھ مزہ بھی آئے۔ اور وہ اُنیسوین صدی کا ناٹک صرف لندن والون کی تفریح گاہ ہی نہ رہے بلکہ خود محمدؐ صاحب کی لائف کی طرح ایک تاریخی یادگار کی بھی حیثیت حاصل کر سکے

اب ہم یہ بتاتے ہین کہ ڈراما کی ابتدا کس وقت اور کیونکر ہوئی۔ انگریزی مورخین کے نزدیک اسکے بانی اور موجد یونانی بت پرست ہین۔ اگرچہ ہندؤون کو بھی اپنی جگہ پر اسکی ایجاد کا دعوٰی ہے۔ مگر چونکہ یونانیون کے ڈراما کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے۔ لہذا ہم پہلے یونانیون سے بحث کرتے ہین۔ پھر ہندؤون کا ذکر کرین گے۔

مسلم ہے کہ سب کے پہلے جمہوری سلطنت یونان مین قائم ہوئی تھی جمہوری ریپلکن اصول کا اصلی مقتضا یہ ہے کہ عام اہل ملک خوش رکھے جائین۔ یہ غرض بغیر ڈراما کے اور کسی طرح حاصل نہین ہو سکتی تھی۔ بس انھین ضرورتون کی وجہ سے ڈراما یونان مین پیدا ہوا۔ اور برابر ترقی کرتا گیا۔ اگرچہ ڈراما کو زیادہ عروج خاص اتھینس والون کے ہاتھون حاصل ہوا مگر اسکے اصلی موجد ڈوریا والے ہین۔ جنھون نے پہلے پہل اس کی بنا ڈالی۔ اور ابتداءً اس کی دونون قسمین ٹریجڈی (حسرت) اور کامڈی (خوشی) ڈوریا والون کی ریاستون پلاپونی نس (جو مقام فی الحال موریا کے نام سے مشہور ہے) مین مروج تھین اور اسی وجہ سے آتھیکا کی ٹریجڈی مین گانے والون کی جو کیان جو ڈراما کی اصلی بنا تھین۔ ڈوریا والون ہی کی لغت مین لکھی جاتی تھین۔ یہین سے پتہ لگتا ہے کہ اہل اتھینس نے ڈراما کو ڈوریا والون ہی سے لیا تھا۔

ابتدائی عہد مین دونون مذکورہ اقسام ڈراما کی ایجاد یون ہوئی کہ

انہیں سکے ذریعے سے ڈایونی سس (شراب کے دیوتا) کی پرستش کی جاتی تھی اور دونوں میں ایسا فرق نہ تھا۔ جیسا آج ہے۔ بلکہ اس عہدہ فرق ایسا تھا کہ گانوں اور دیہاتوں مین ڈایونی سس کی پوجا کامڈی نے ذریعے سے کیجاتی تھی۔ اور شہرون مین ٹریجڈی کے ذریعے سے۔ مگر اس ٹریجڈی مین کوئی غم و حسرت کی بات نہ ہوتی تھی۔ ٹریجڈی مین ایک قسم کے ایکٹر بنا کرتے تھے جو سٹائرس کہلاتے تھے۔ اور وہ بکریون کی قطع اور وضع مین اسٹیج پہ آکے ڈایونی سس کے بھجن گاتے تھے اور ناچتے تھے۔ اسکے خلاف کامڈی مین جو ایکٹر اسٹیج پر آتے تھے وہ مسخرہ پن کرتے تھے اور ہنستے ہنساتے تھے اور تماشا دیکھنے والون پر پھبتیان کہتے اور آوازے کستے تھے۔ اسکے بعد دونون قسم کے ڈراما کو تدریجاً ترقی ہوسنے گئی۔

ٹریجڈی کو اُسوقت سے ترقی ہوئی جب سے اُس مین غزلین گائی جانے لگین ان غزلون مین اکثر مضامین حسرت ہوتے تھے یعنی ڈایونی سس دیوتا کے مصائب کا دکھڑا رویا جاتا تھا۔ اور اسی وقت سے حسرت واندوہ کے خیالات ٹریجڈی کا جزو ضروری ہوگئے۔ غزلین اس طرح گائی جاتی تھین کہ پچاس آدمی اس کے ڈایونی سس کی قربان گاہ کے گرد کھڑے ہوتے تھے اور آوازین ملاکر گاتے تھے۔ اس عہد کے بعد کارنتھ مین ایک شخص پیدا ہوا اریان اس نے اُن غزلون مین اور ترقی پیدا کی

ہوتے ہوتے وہ زمانہ آیا کہ پانی سس ٹرٹیس بادشاہ کے زمانے مین تھس پس نے اسی ڈراما کو ترقی دلانے مین ناموری حاصل کی۔ معمولی ایکٹر جو پیشتر سے معین چلے آتے تھے۔ اُنکے علاوہ تھس پس نے ایک نیا ایکٹر ایجاد کیا اور یہ طریقہ ہو گیا کہ تین ٹریجڈیان ایک ہی غرض سے کیجاتی تھین اور اُنکے بعد ایک نقل ہوتی تھی۔ اور ڈراما انھین اصول پر چلا آتا تھا۔ یہان تک کہ قبل مسیح ۵۲۵ء مین اسکیلس پیدا ہوا۔ اس شخص نے ڈراما مین بہت زیادہ ترمیم کی اور اُس نے گویا ڈراما کی ایجاد کا وصف دوریا والون سے چھین کے انتھنس والون کو دیدیا۔ اسکیلس انتھنس کی ٹریجڈی کا موجد مانا گیا ہے۔ اس نے

اول تو تھس پس کی طرح ایک نیا ایکٹر اضافہ کیا - علاوہ برین ڈراما کی حیثیت کذائی جو آج ہمین نظر آتی ہے یہ ایسکلیس ہی کی ایجاد ہے - اس لیئے کہ رنگ آمیز پردے اور ایکٹرون کا بیش قیمت اور فوق البھڑک لباس اُسی کی ایجاد ہے - جسکی وجہ سے ڈراما مین رونق کے علاوہ اثر کو بہت کچھ ترقی ہو گئی - پھر حضرت مسیح سے ۴۹۵ برس پہلے سفاکلیز پیدا ہوا - اس نے بھی اپنی یادگار مین ایک ایکٹر اور بڑھایا اور گویا یونانی ڈراما کی تکمیل کر دی - قبل مسیح ۴۴۸ مین یوری پائڈیز پیدا ہوا تھا - اُسنے مذہب اور پوجا کے اغراض سے عام کرکے ڈراما میں اخلاقی معاملات شامل کئے تھے - جس سے بیان کیا جاتا ہے کہ ڈراما خراب ہو گیا تھا - مگر اتنا ضرور ہوا کہ جذبات اور اثر کو بہت کچھ ترقی ہو گئی -

یہ تو ٹریجڈی کا حال تھا - اب کامڈی کا حال سنئے - قدیم کامڈی کی ابتدا کریٹینس نے ترقی دلائی جس نے شاہ پری سیس کے زمانے میں شہرت پائی تھی اسکے بعد آرسٹوفی نیز نے جو کامڈیان مرتب کیں تھیں وہ پالیٹیکل تھیں - اور ان کے ذریعے سے ممتاز اور سربرآوردہ لوگون کی نقلین کی جاتی تھیں - جن میں ظرافت کا بہت زیادہ حصّہ ہوتا تھا - یونان کے عہد وسطیٰ مین جو کامڈی مروج تھی - اس میں گانے والوں کی چوکیاں مندارد کر دی گئیں تھین اور شخصی نقلین بھی اڑا دی گئی تھیں - یونانی کامڈی اسی وضع پر رہی اور یونان کے عروج کا زمانہ آخر ہو گیا - یہاں تک کہ فلمن (جو ۳۶۰ برس قبل مسیح پیدا ہوا تھا) اور من اینڈر (جو قبل مسیح ۳۴۲ میں پیدا ہوا تھا) ترقی کے اسٹیج پر نظر آنے - ان میں پچھلا شخص سکندر اعظم کے زمانہ عروج کا بہت بڑا نامور شخص تھا - ان دونون نے مصر سلطنت سمجھ کے ڈراما میں پولیٹیکل واقعات دکھانا ممنوع کر دیا -

اس کے بعد رومیون کا دور شروع ہوا - چونکہ اُنھون نے اپنی ترقی کی بنا یونانی تہذیب کے کھنڈرون پر قائم کی تھی لہذا ڈراما ان مین بھی مروج ہوا - اور انکی بُت پرستی اور دیوتاؤن کی پرستش میں برابر کام آتا رہا -

رومی اور یونانی لوگون کے علاوہ ادھر ہندؤوں کو دعوےٰ ہے کہ ہمنے اپنے زمانہ عروج مین ڈراما کو بھی بہت کچھ ترقی دلائی تھی اور بیشک یہ دعوےٰ صحیح ہے

ہندوؤن کی مذہبی تفریحون مین اب بھی ہمین اُن ڈرامون کے بگڑے ہوے سین کبھی کبھی نظر آجاتے ہین - دسہرے مین رام لیلا اور بعض موقعون پر کرشن لیلا دیکھکے ہم سمجھ جاتے ہین کہ ہندوؤن کو قدیم عہد مین ڈراما کا ضرور شوق تھا - بعض محققین نے تو ڈراما کا موجد ہندوون ہی کو قرار دیا ہے - جو بیان کرتے ہین کہ بہت قدیم زمانے مین جبکہ ہندوستان اپنے تمام رسوم کے اعتبار سے وید کی پابندی کرتا تھا اور پورانون کے اچھے اور برے قصے ظاہر نہین ہوے تھے اُس عہد مین سادی سادی نقلین جن مین زبان سے کچھ نہین کہا جاتا اور صرف اشارون سے مافی الضمیر ظاہر کیا جاتا ہے ہندوستان مین مروج تھین - اور انھین نقلون سے ڈراما نکلا ہے - سنسکرت مین بعض ناٹک موجود ہین لیکن انکی تصنیف یونان کے زمانۂ ترقی کے بعد ہوئی ہے - ہندوستان کی اس مقدس زبان مین ڈراما کے متعلق جتنے تصانیف ہین سب ایک سو برس قبل مسیح سے لیکے آٹھوین صدی عیسوی تک لکھے گئے - اس سے پیشتر ہندوستان مین کسی ڈراما کا پتہ نہین لگتا - گو اصول ڈراما یا اسباب ظہور ڈراما بہت پہلے پائے گئے ہون - سنسکرت ناٹک (ڈراما) کا بہت بڑا باکمال موجد کالی داس شاعر ہے - اور یہی پہلا شخص ہے جس نے سنسکرت مین پہلے پہل ڈراما لکھے - اُس کا نہایت مشہور ڈراما سکنتلا ناٹک ہے - اس مین دربار وغیرہ کے سین نہایت عمدہ دکھائے گئے ہین - کالی داس حضرت مسیح سے ۵۷ برس قبل اجین کے مشہور علم دوست راجہ بکرما جیت کے ممتاز مشیرون مین تھا -

سنسکرت کے ناٹکون مین مرچھ کٹک (کھلونا گاڑی) بھی قیمتی اور قابل قدر ہے جو دس حصون پر تقسیم کیا گیا ہے - اس کے علاوہ سنسکرت کا ایک اور ڈراما ہے - نل دمنتی (راجہ نل اور رانی دمینتی) اس ناٹک کی بھی نہایت قدر کی گئی اور زمانے نے اسکو بہت زیادہ شہرت دی - خصوصاً اس وجہ سے کہ فارسی کے سحر بیان اور فاضل شاعر فیضی فیاضی نے اس کا ترجمہ نظم فارسی مین اس خوبصورتی اور عمدگی سے اور ایسے شاندار الفاظ مین کیا کہ تمام فارسی مثنویان اُسکے سامنے دب گئین -

باوجود ان سب نقصون کے اس امر کے خیال کرلینے کا نہایت آسان

موقع ہے کہ ہندوؤن نے بھی ناٹک کی بنا ابتداءً مذہبی پیرائے ہی سے کی ہوگی۔ اس لیے کہ رام لیلا اور کرشن لیلا جو ہندوون کے قدیم مذہبی کھیل بلکہ ذرائع عبادت ہین یقیناً انکی بنا کالیداس اور دیگر شعراسے پہلے پڑی ہے۔ کالی داس اور جن شاعرون نے جو کچھ لکھا ہے اگرچہ اُسکے پلاٹ مصنفون کی ذہانت کے شاہد ہین مگر ماخذ سب کا وہی مذہبی ڈراما ہین جو ہندوون کی عبادت مین داخل تھے۔ اور جن کے ذریعے سے قدیم ناموروں کی زندہ مورتین بنا کے ہند مین پرستش کی جاتی تھی

رومیون نے بھی ڈراما کو یونانیون سے سیکھ کے اپنی بت پرستی رسوم مین شامل کر لیا تھا اور ایطالیہ مین بھی حضرت مسیح سے پہلے یہ ڈراما بتون کی عبادت کا کام دیتے تھے۔ بہرحال اس مین کوئی شک نہین کہ ڈراما کی ایجاد جہان کہین ہوئی ہو خواہ یورپ مین یا ایشیا مین لیکن اُس کی بانی بت پرست قومین اور اسکی غرض بت پرستی تھی۔

ان قدیم عہد کی ترقی یافتہ قومون اور موجودہ یورپ کے درمیان مین صرف ایک مسلمان تھے۔ جنھون نے پہلی قومون سے اصول ترقی کو حاصل کیا تھا لیکن مسلمانون کے خیالات ہر عصر اور ہر عہد مین دین کے تابع اور پابند رہے۔ نیز اُس وقت جب وہ تلوارین ہاتھ مین لیے فتوحات کا سیلاب بہا رہے تھے۔ اور نیز اُسوقت جب وہ علوم کو اپنی مذہبی زبان مین لا رہے تھے اور ترقی و تہذیب کے دریاؤن کی شناوری مین مشغول تھے۔ اُس حالت مین بھی جب وہ مفلس اور محتاج تھے اور اُس حالت مین بھی جب وہ دولتمند تھے اور عیش و عشرت کے جام اطمینان کے ساتھ نوش کر رہے تھے۔ اُنھون نے کسی وقت اور کسی حالت مین دین کو نہ چھوڑا۔ لہذا یونانیون اور اپنے سے پہلی تمام ترقی یافتہ قومون سے اُنھون نے جو کچھ حاصل کیا وہ وہی تھا جو دین اسلام کے خلاف نہ تھا۔ مصوری اگرچہ ایک عمدہ اور دلچسپ فن تھا انھون نے اُسکو بالکل چھوڑ دیا۔ موسیقی جو بت پرستون کے عبادات مین داخل تھی اور جو بت پرستون ہی کی تقلید مین اب چرچ آرگن (گرجے کا باجا) اور ہوشون کی تانون کے پیرائے مین نمودار ہوئی ہے اُس کی طرف بھی مسلمانون نے توجہ نہین کی۔ محض اس لیے کہ اُنکے ہادی

بر حق نے اُنھیں اس فن سے قطعًا روک دیا تھا۔

بخلاف عیسائیوں کے جنھوں نے شریعتِ عیسوی کی کبھی قدر نہیں کی اور ہمیشہ انکے اعتقادات میں بت پرستوں کی رسمیں حضرت مسیح کی تعلیمات پر غالب آگئیں۔ خود آنحضرت صلعم کے عہد میں عیسائیوں نے اپنے کلیساؤں کو بتخانوں کی نقل بنا دیا تھا۔ جس طرح منروا کی مورت ایتھنس کے بڑے مندر میں تھی۔ اور جس طرح رادھکا جی کی مورت ہندوؤں کے اکثر دیوہروں میں ہوتی ہے اُسی طرح حضرت مریم کی مورت اُنکے کلیساؤں میں تھی یورپ کے مسیحیوں نے ترقی یافتہ غیر قوموں کی کوئی لغویات نہ تھی جو نہ حاصل کرلی۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ یونانیوں اور رومیوں کی دیومالی جس پر اُنکے کفر اور بت پرستی کی بنا تھی اُسکو بھی مسیحیوں نے نہ چھوڑا۔ ایلیڈ اور آڈسی ہومر (جو اصل میں یونانیوں کا وید کی ہے) کے تصانیف بھی آج مسیحی دنیا کے قیمتی ہی نہیں واجب التعظیم شئے ہیں۔ لنڈن کے بازاروں میں جوکی جو یونانیوں کا دیوتا ہے آج قسمیں کھائی جاتی ہیں۔

بیشک مسیحیوں اور مسلمانوں میں یہ بڑا بین اور قابل غور فرق ہے کہ پہلوں کا مسلک ما قال (کیا کہا) تھا اور آخرالذکر فریق کا مسلک صرف تقلیدی طور پر من قال (کس کا قول ہے) رہا۔ خود پیغمبر عرب (بأبی انت واُمّی یا رسول اللہ) نے باوجودیکہ مشرکین کے رسوم کے مقابلے میں ہمیشہ اہل کتاب کی رسموں کو ترجیح دی لیکن اہل کتاب کی بھی لغو اور شہرت پسندی کی باتیں ہمیشہ چھوڑ دیں۔ جوبلی جو یہودیوں کی لغو رسم تھی اور جس سے اُن کا بہت بڑا اوچھاپن ظاہر ہوتا تھا اُسکا نام بھی مسلمانوں میں مروج نہ تھا مگر یورپ کے مسیحیوں میں یہاں تک مروج ہوئی کہ خود روم کے بعض پوپوں کی جوبلی یورپ کی تاریخ میں موجود ہے۔

جس طرح یہ سب باتیں یورپ کے مسیحیوں نے لیں اُسی طرح ڈراما کو بھی انگلستان کے مسیحیوں نے علمی نہیں خاص مذہبی حیثیت میں یونانیوں اور رومیوں سے حاصل کرلیا۔ حالانکہ مسلمانوں نے اُسکی طرف توجہ بھی نہیں کی تھی۔

یورپ کی تاریخ بتا رہی ہے کہ مسٹری یعنی راز کی باتوں اور خونریزی کے واقعات کے تماشے ایڈورڈ (بادشاہ انگلستان) کے عہد سے مدتوں تک انگلستان

کے گرجون اور نیز سڑکون پر برابر نظر آیا کرتے تھے۔ اور اُنکے ذریعے سے عموماً انجیل کے قصے دکھائے جاتے تھے۔ اور تسلیم کر لیا گیا تھا کہ مذہبی تاریخ بتانے کا یہ نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ جس سے صریحاً ثابت ہو گیا کہ ڈراما کو ابتداءً انگلستان کی علمی سوسائٹی نے نہین بلکہ مذہبی مقدس گروہ نے لیا تھا۔ انگلستان کے ان پہلے ڈرامون مین پھر اتنا تغیر ہوا کہ اخلاقی معاملات پر اثر ڈالنے کے لیے ''الیگری'' کا رواج ہوا۔ الیگری یہ چیز ہے کہ خاص قوتین جو محسوس چیزین نہین ہین وہ استعارۃً مشخص کر لی جائین اور کوئی ایکٹر اُن کا بہروپ بھرے۔ مثلاً ایک شخص وفا کے نام سے نامزد کیا جائے۔ اور ایک دغا کے نام سے۔ اور دونون کی رفتار علحدہ علحدہ دکھائی جائے۔ ان الیگری ڈرامون مین پند اور مذاق کی باتین زیادہ ہوتی تھین۔ سب سے پہلے اس قسم کا ڈراما آٹھوین ہنری کے عہد مین نکولس یوڈل نے تصنیف کیا جو آخر مین وسٹ منسٹر اسکول کا ماسٹر تھا۔ یہ ڈراما کامڈی تھا اور ''رالف رسٹر ڈائسٹر'' کے نام سے نامزد تھا۔ ممدوح ماسٹر صاحب نے یہ ڈراما لکھ کے اپنے شاگردون کو دیا کہ وہ بہروپ بھر بھر کے اُس کا تماشا دکھائین۔ جسکے ذریعے سے لنڈن کے بہادرون اور عام باشندون کا طرز تمدن نظر آسکتا تھا۔ ملکہ الزبتھ کے زمانے مین ڈراما کا ذوق لوگون کے دل مین بڑھ گیا۔ اور اُسی زمانے مین تھیٹر کی عمارتین قائم ہوئین۔ اور اصول ڈراما کی تعلیم کا ایک اسکول بھی تیار ہو گیا۔ اس عہد کے تعلیم پائے ہوے لوگون مین سے بعض لوگون نے اصول ڈراما مین بہت کچھ وقعت اور شہرت حاصل کی مگر آخر شکسپیر کے آگے جو اسی عہد کا بلکہ انگریزون کے نزدیک تمام اگلے اور پچھلے عہدون مین ڈراما کا سب سے بڑا مصنف تھا۔ سب کی شہرت مٹ گئی۔ لنڈن کے محلے بنک سائڈ مین جو ملکہ الزبتھ کے عہد کا بہت بڑا تھیٹر مشہور بہ گلوب تھیٹر تھا۔ اور ۱۵۹۹ء مین قائم ہوا تھا اسکے مالکون مین ایک شکسپیر بھی تھا۔ شکسپیر نے انگلستان مین ڈراما کو بہت ترقی دلائی تھی۔ اور اُسکے بعد سے انگلستان کے اخلاق عموماً تھیٹرون کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ لیکن اس سے انگلستان کے اخلاق کو سخت ضرر پہونچا۔ انگلستان کی یہ اخلاقی خرابیان ہماری ہی نظر مین نہ تھین بلکہ خود انگلستان نے بعض وقت

اس کا اعتراف کر لیا۔ چنانچہ کرامول کے عہد میں کامڈی کے ڈراموں کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ اس لیئے نہیں کہ اُن میں ظرافت اور مذاق زیادہ تھا بلکہ مجرد اس وجہ سے کہ انکی وجہ سے اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑ گیا تھا اور سوسائٹی کی حالت نہایت ذلیل اور شرمناک ہو گئی تھی۔

اگرچہ آج اہل انگلستان کو اپنی سوسائٹی کے نہایت اعلیٰ ترقی پر ہونے کا دعویٰ ہے لیکن دیکھنے والے سمجھ جاتے ہین کہ وہان کی تہذیب کیسی ہے۔ ڈراما کی دونون قسمین وہان آج مروج ہین۔ فی الحال کی کامڈی مین عموماً وہ عشق و شوق کی داستانین ہوتی ہین جن کا نتیجہ حسرت و غم اور مایوسی ہے۔ کامڈی کا یہ اثر صاف ظاہر ہے کہ واقعاتِ عشق و محبت مین جیسی آزادی اور بزرگون کی مخالفت انگلستان کے نوجوان مردون اور عورتون مین ہے ویسی آزادی دنیا کے پردے پر اور کسی ملک مین نہین۔ جو لوگ انگلستان ہو آئے ہین اور نیز وہان کے حالات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ دوشیزہ لڑکیان جس قدر وہان خراب ہو جاتی ہین اُس قدر اور کہین نہین خراب ہوتین۔ زنا جتنا وہان مروج ہے ویسا کہین ڈھونڈھے نہ ملے گا۔ وحشی اور ناتربیت یافتہ بلکہ جنگلی لوگون مین عصمت و عفت ہے اور نہین ہے تو اُس تربیت یافتہ اور مدعی تہذیب قوم مین۔ یہ تو کامڈی کا اثر تھا۔ اب ٹریجڈی کا حال سُنیئے۔ خودکُشی جو ہر مذہب اور ہر فلسفی کی نظر مین انتہا سے زیادہ نالائقی بزدلی اور بدنام کرنیوالی چیز ہے وہ انگلستان مین دنیا کی اکثر قومون سے زیادہ مروج ہے۔ خودکشی کے جیسے نئے اور عجیب و غریب حادثے انگلستان مین ظاہر ہوے ہین ویسے اور کہین نہین ظاہر ہوے۔ بلکہ اسی مین وہان ہر خود اپنی جان دینے والا ایک نئی جدت دکھا کے دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ یہ ظالم بدخلقی صرف ٹریجڈی سے نمایان ہوئی ہے۔ ٹریجڈی نوجوانون کے دل مین اُس ناموری کی موت کا شوق پیدا کر دیتی ہے جو کسی ناکام اور مایوس عاشق کو نصیب ہوئی تھی اور تھیٹر کے اسٹیج پر نظر آئی۔ یہ فائدے ہین جو انگلستان نے اور اسکے ساتھ یورپ کی دوسری تربیت یافتہ قومون نے تھیٹر سے حاصل کیے۔ اور یہ وہ ناموریان ہین جو مغرب زمین کو ڈراما کی بدولت نصیب ہوئین۔ کیا اسکے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے

کہ ڈراما کوئی عمدہ چیز ہے؟ سچی اور نہایت ہی حق پر ہے شریعت اسلامیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ و التحیۃ) جو بتاتی ہے کہ تمام اس قسم کی لغو چیزیں اور کل بیہودہ کھیل ناجائز اور خدا کو۔ اُس خلاق عالم کو نہایت ناپسند ہیں۔

افسوس! اور صد ہزار افسوس!! کہ وہی پیغمبر برحق۔ وہی ہادی مطلق۔ جسنے ان لغو افعال کو حرام اور ناجائز بنایا۔ ایک چھچھورا نقال۔ ایک ذلیل ناچنے والا اُس کی صورت بن کے اسٹیج پر آئے! اُسکی زبان کٹ جائے اگر وہ ایسا دعوے کرے! وہ مقام دھنس جائے جہاں اُسکے منحوس قدم آئیں!

علاوہ بریں اس ڈراما میں صرف اتنی ہی خرابی نہیں کہ اُس میں ایک ذلیل شخص پیغمبر عرب کی صورت بن کے اسٹیج پر آئے گا۔ نہیں بلکہ اسکے ساتھ ہمارے پیغمبر محمد صلعم کی توہین بھی کیجائے گی۔ وہ واقعات دکھائے جائیں گے جنکی نہ کوئی اصلیت ہے اور نہ جنکو ذرا بھی محمد رسول اللہ صلعم کی شان سے کوئی مناسبت ہے

ابھی تک صاف صاف نہیں معلوم ہوا کہ اس ڈراما کا اصلی پارٹ کیا ہو مگر ہاں جس قدر اشارۃً معلوم ہو سکا اُسکا ماحصل یہ ہے کہ ایک ایکٹر محمد صلعم بنا کے آئے گا اور ایک ایکٹرس آن حضرت کی پیاری بی بی جناب عائشہ صدیقہ کا پارٹ کریگی۔ مصنوعی آن حضرت دعوی کریں گے کہ میں افضل الناس۔ افضل البشر بلکہ افضل الخلق ہوں۔ عائشہ صدیقہ دعوی کریں گی کہ نہیں یہ جوہر خاص جناب مسیح کا ہے۔ اور فضیلت کا تاج اُنھیں کے سر پر ہے۔ آنحضرت میں اور جناب صدیقہ میں بہت دیر تک بحث ہوگی اور وہ بحث بہت طول کھینچے گی۔ آنحضرت ہر پہلو سے اپنی فضیلت و فوقیت ثابت کرینگے۔ اور صدیقہ ہر پہلو سے اس کی تردید کر دیں گی۔ آخر وہ فرضی آن حضرت صاحب ہر امر میں عاجز آکر خودکشی کر لینگے اور اس ٹریجڈی کی حیثیت سے یہ ڈراما تمام ہوگا۔

یہ مضمون ابھی ناتمام ہے۔ باقی حصہ دسمبر کے پرچے میں شائع ہوگا۔ اس وجہ سے یہ مضمون دو نمبروں پر تقسیم کر دیا گیا۔ پہلا نمبر ہم یہیں پر تمام کرتے ہیں۔ دوسرا نمبر ناظرین آیندہ دیکھیں گے۔

(۴)

بعض مسیحیون نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "اہل اسلام بزرگان دین کا ڈرا ما بحیثیتِ مذہب دکھایا کرتے ہین"۔ زیادہ ضرورت ہے کہ اس امر پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کرین۔ مسلمانون مین دو بہت بڑے فریق ہین۔ ایک سُنی (یعنی پابندانِ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے شیعہ (یعنی محبان اہلبیت رسالت علیہم السلام) اسلام کی ایک پولیٹکل نزاع نے یہ دونون گروہ پیدا کیے۔ ان دونون مین وہ جھگڑا ایک جزئی امر پر مبنی تھا۔ روزافزون تعصبات کی وجہ سے بڑھتا گیا۔ اور بڑھتے بڑھتے اس درجے کو پہونچا۔ کہ ہزارہا علما تہِ تیغ ہوے۔ ہزارہا مدارس و معابد مین آگ لگی اور صدہا شہر تباہ و برباد ہوے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کی موجودہ تباہیون کا اصلی سبب یہی اختلاف تھا۔ گو کہ اسلام مین اور بھی فرقے ہین مگر زیادہ صاحب اثر یہی دو فرقے ہین۔ ایک تیسرا فرقہ اس عہد مین جدید نظر آتا ہے جو وہابی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اصل مین یہ فرقہ جدید نہین ہے۔ ہر عہد مین ایسے لوگ موجود تھے جنھون نے اسلام مین سے پیدا ہو جانے والے رسوم کو سرگرمی سے مٹانا چاہا۔ اور کوشش کی کہ اسلام اپنی قدیم اصلی حالت پر پہنچ جائے۔ گذشتہ اسلامی سلطنتون نے ایسے لوگون کو کبھی اُبھرنے نہ دیا۔ اور اسی وجہ سے اُن عہود سابقہ مین اس فرقے کے عقائد مخفی خیالات کی حیثیت سے کسی خاص شخص کے سینے مین مخفی رہے۔ جو زیادہ ہم خیال رہنے کی وجہ سے اپنے عقائد کو دل ہی مین چھپاتے رہے۔ اور اگر کسی نے ظاہر بھی کیا تو مخالف پولٹیکل قوتون کے خوف سے کوئی اور شخص اُس کا ہم خیال نہ ہو سکا۔ انگریزی دَور نے آزادی دی اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خیالات یک بیک اُبھر پڑے۔ اور اب روزافزون غلبہ حاصل کرتے جاتے ہین۔ یہان تک کہ اسلام مین ایک جدید قوی فرقہ پیدا ہو گیا۔

ان تینون فرقون مین اہل حدیث لوگ جنھون نے متعصب دشمنون کی طرف سے وہابی کا خطاب پایا ہے وہ تو اُن تمام باتون کے مخالف ہی نہین دشمن ہین جو اسلام کے زمانۂ ابتدائی مین نہ پائی گئی ہون۔ اُن سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ کوئی ایسی کارروائی جائز رکھین جو ڈراما کی قسم سے ہو، بڑی غلطی ہے۔ باقی رہے عام اہل سنت اور امامیہ اثنا عشریہ جو عرف عام مین شیعہ کے لفظ سے مشہور ہین۔ جہان تک ہماری واقفیت

ہے دونون مین سے کوئی فریق بھی کسی ایسی کارروائی کو جسکے ذریعے سے بزرگان دین کے واقعات کی نقل دکھانا مقصود ہو جائز نہین سمجھتا - ایسے امور کی اجازت سے دونون معتبر و مستند کتابین خالی ہین - اگر کسی کو شک ہو تو دونون مذہبون کے علما سے بذریعۂ استفتا دریافت کر لے -

باقی رہی تعزیہ داری - جو واقعی ایک قسم کا ڈراما ہے اور جسکے موجد سُنّی ہین اور حامی شیعہ خیال کیئے جاتے ہین - اول تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ تعزیہ داری کی ایجاد کیون اور کیونکر ہوئی - سارا زمانہ جانتا ہے کہ پیغمبر آخر الزمان - اُس نبی برحق، اُس شفیع المذنبین کے چھوٹے نواسے کو یزید بن معاویہ کی طرفدارون اہل کوفہ نے غدر و فریب کے ہجرت کے ساٹھ برس بعد ارض کربلا مین شہید کیا تھا - اس شہادت سے اسلام کو ایک ایسا سخت صدمہ پہونچا جو اُسے ہمیشہ یاد رہے گا - اور جسکو یاد کر کے مسلمان اگر مسلمان ہین تو ہمیشہ روئین گے - یہ غم چاہے کتنا بڑا ہو مگر سچ یہ ہے کہ اُس عہد مین جزو دین اور جزوِ ایمان نہین خیال کیا گیا تھا - مسلمانون کو اگر صدمہ ہوا تو اسی قدر جتنا کسی قوم کو ایک عہد کے سب سے بڑے نامور اور مقتدا کے مارے جانے کا غم ہو - لیکن جو جو زمانہ گذرتا گیا یہ غم زیادہ باعث درد و الم خیال کیا جانے لگا - ایک طرف سُنّی یعنی متبعین سنت کے خیالات مین یہ غم ہمیشہ ایسا ہی سمجھا گیا جیسا کہ ابتدا مین خیال کیا گیا تھا - لیکن دوسری طرف یعنی متبعان اہل بیت نے اسکو جزو ایمان تسلیم کر لیا اور آخر الامر اُنکے خیال مین یہ غم عملاً عقائد اسلامیہ پر غالب آ گیا -

اہل سنت مین بھی اکثر اوقات ایسے لوگ پیدا ہوے جو تمام عقائد مین تو پورے سُنّی تھے لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم اُنکو معمول سے زیادہ تھا - چنانچہ اسی قسم کے سُنیون مین تیمور لنگ تھا جو ہندوستان کے مغلیہ خاندان کا بانی ہے - اسکو حضرت سید الشہداء علیہ السلام سے نہایت محبت تھی - اُسی محبت نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ ہر وقت غم کے تازہ رکھنے کے لیے اُس نے روضۂ حضرت امام حسین کی ایک نقل بنوا کے رکھ لی جو اسلام مین ایک بالکل نئی مثال تھی - سُنیون نے اسکو ایک معمولی امر خیال کیا لیکن شیعون نے جو محبت اہل بیت کے سب سے بڑے مدعی ہین اس رسم کو بڑی دلچسپی کے ساتھ اُٹھا لیا - تیمور مر گیا اور اُسکی یہ ایجاد شیعون مین رواج

پا گئی - جو زیادہ چند نون کے ساتھ آج تک اسلام کے اس فرقے مین تعزیہ داری کے نام سے مروج ہے - اور جس کی وجہ سے آج یورپ کے متعصبون کو اسلام کا ڈراما بنانے کے لیئے ایک سند ہاتھ لگی -

ہم اوپر بیان کر چکے ہین کہ شیعون کی مذہبی کتابین اس رسم کی بابت بالکل ساکت ہین - اور اسی وجہ سے اُنکے علما بھی اگرچہ خود تعزیہ داری کم کرتے ہین مگر اسکے جواز و عدم جواز مین ساکت نظر آتے ہین - مگر چاہے کچھ ہو اس سے عیسائیون کو کسی قسم کے استدلال کا موقع نہین مل سکتا -

اول تو یہ دیکھنا چاہیے کہ شیعہ تعزیہ داری مین کیا کارروائی کرتے ہین - وہ ایک عمکدے کا نقشہ بنا کے سامنے رکھتے ہین - چونکہ رسول اکرم کے نواسے کی طرف وہ منسوب ہے لہذا اُسکی تعظیم اور اُس کا ادب کرتے ہین - اُسکو دیکھکے اسلامی سب سے بڑی مصیبت کو یاد کرکے روتے ہین اور ثواب جنت کے مستحق ہوتے ہین - وہ کسی کی توہین نہین کرتے - کسی کے ساتھ تمسخر نہین کرتے - اور نہ اُس قسم کی کوئی بات ظاہر کرتے ہین جسکو ڈراما سے تعلق ہو -

دوسری بہت بڑی بات یہ ہے کہ وہ کسی شخص کی صورت اور تصویر نہین بناتے وہ تو ایک عمارت ایک مقبرے یا ایک تربت کی نقل بناتے ہین - وہ ہرگز پسند نہین کرتے کہ اس زمانے کا ایک فاسق و فاجر اُنکے سامنے آکے کھڑا ہو اور معاذ اللہ یہ زبان سے نکالے کہ "مین امام حسین ہون" اگر کوئی ایسا کہے تو اُسکو روکنے اُس کا منہ بند کرنے کے لیے شیعہ اُسی سرگرمی، اُسی طیش، اُسی غصے سے موجود ہو جائین گے جس سرگرمی سے اسوقت شیعہ اور سُنی دونون اُس شخص کو جو محمد صلعم کا بہروپ بھر کے تھیٹر مین آئے ٹانگ کھینچ کے ذلت سے اسٹیج کے نیچے گرا دینا چاہتے ہین -

بیان کیا جاتا ہے کہ کربلا اور ایران مین کربلا کا ڈراما دکھایا جاتا ہے - شاید ایسا ہو - لیکن ہمارے نزدیک اُن لوگون پر یہ بہت بڑی تہمت ہے - اگر کسی جاہلیت کے پُر جوش دور مین دکھایا گیا ہو تو اور بات ہے مگر بحیثیت مذہب اگر آج کوئی شخص شیعہ مقدس مجتہدین کے سامنے کھڑا ہو کے یہ دعوے کرے کہ مین نے امام حسین علیہ السلام

کا بہروپ بھرا ہے تو شاید اسکی تکفیر مین کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا جائے گا - اور شیعون کی دنیا مین اُسکو کسی جگہ ٹھہرنے کا موقع نہ ملے گا -

یہ بھی دعوی کیا گیا ہے کہ بعض شیعہ اُن خلفا کی تصویرین بنا کے توہین کرتے ہین جو اُنکے خیال مین غاصب تھے - لیکن ایسا امر سوا عوام شیعہ کے خواص اور مہذب پارٹی کی جانب سے کبھی وقوع مین نہین آیا - جو لوگ ایسے امور کے مرتکب ہوے اور جنھون نے ایسے رسوم کو جائز رکھا وہ شیعون کی سوسائٹی مین کبھی قدر کی نگاہون سے نہین دیکھے گئے - علاوہ برین سب سے زیادہ غور طلب یہ امر ہے کہ جب کبھی جن لوگون نے ایسی کارروائیان کین اُن کا نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ بلوے ہوے - فوجداریان ہوئین - خون کے سیلاب بہے - سنیون اور شیعون کی طرف سے خونریز مذاق کے لوگ اُٹھے اور اُنھون نے کوئی امر بد انتظامی اور بے امنی کا نہ تھا جو اُٹھا رکھا ہو - ہزارہا عورتون کی بے عزتی ہوئی - صدہا خاندان برباد ہو گئین - بہت سے بچے یتیم - اور بہت سے باپ لاولد ہوے - مدارس مین آگ لگائی گئی مسجدین مسمار کی گئین - کتابین دریا مین غرق ہوئین - قبرین کھود کھود کے لاشین نکال لی گئین اور اُنکی بے عزتی و توہین مین کوئی دقیقہ اُٹھا نہین رکھا گیا - کلیسا کی تاریخ کی طرح مسلمانون کی تاریخ مین قتل و خونریزی اگر پیدا ہوئی تو انھین اسباب کی وجہ سے - اور انھین خیالات کی بنا پر -

تو کیا یہ پسند ہے اور گوارا ہے یا انگریزی دور مین اُن قدیمی تعصبات کا پُرجوش اور پُرخروش سین دیکھنا مقصود ہے جو کوشش کیجاتی ہے کہ تھئیٹر کے اسٹیج پر پیغمبر عرب کی توہین کیجائے اور اسلام کے تمام فرقے آپس مین اتفاق کر کے وہی فساد اور وہی آفت پیدا کر دین جو پہلے آپس مین پیدا کیا کرتے تھے؟ اور کیا گورنمنٹ جو ایسی بد نظمیون کو نفرت کی نگاہ سے نہین دیکھتی ہے بلکہ اُسکے نام سے ڈرتی ہے ایسی کارروائیون کو جائز رکھے گی؟

اس مین کوئی شک نہین کہ قدیم زمانے مین تعصبات بہت بڑھے ہوے تھے - اور اُن دنون ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کی توہین کے لیے نئے اصول اور طریقے ایجاد کیا کرتے تھے - اُنھون نے جو کچھ کیا اُسکو اُس عہد کی پُرشور و شر سیلاب سے

دلچسپی کے ساتھ قبول کر لیا - علیٰ ہذا القیاس دوسرے مذہب والون نے اُس کا بدلہ لینے کے لیے بھی ویسی ہی کارروائیان کین اور اپنے ہاتھ پاؤن اور اپنے جوش و خروش سے کام لے کے اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لیا - اسکی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ سابق کی گورنمنٹون نے دو اصول معین کیے تھے - ایک جو سب سے مقدم تھا وہ یہ کہ غیر بادشاہون کے حملے روکنے کی قوت ترقی کے ساتھ قائم کی جائے - دوسرے یہ کہ سلطنت اپنی مالگذاری رعایا سے وصول کر لے - اسکی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی کہ رعایا کے حقوق کی حفاظت اور حمایت گورنمنٹ کرے - اور اس سبب سے اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا کہ کہ دو مذہبون مین لڑائی ہوئی اور گورنمنٹ نے اُسکے فرو کرنے کی کوشش نہ کی - دونون طرف کے لوگون نے خوب جی کھول کے اپنے دلون کا بخار نکال لیا - لہذا اُس زمانے مین اگر گورنمنٹ ایسی کارروائیون کو روکتی نہ تھی تو اُن لوگون کو جو اپنی مذہبی توہین کا انتقام لینا چاہتے تھے اپنے اسلحہ اور اپنی قوت سے کام لینے کا بھی پورا موقع دیتی تھی - ہمارے وہ دوست جو اس وقت اس قسم کی باتون کے لئے گذشتہ توہین مذہبی کرنے والی کارروائیون کو بطور حجت پیش کرتے ہین وہ بخوبی سمجھ لین گے کہ اگر گورنمنٹ اُنکو اجازت دیگی اور نبی برحق پیغمبر عرب صلعم کا بہروپ بھرنے کا موقع دیگی تو لازمی طور پر گورنمنٹ کا یہ بھی فرض ہو جائے گا کہ مسلمانون کو بھی انتقام لینے اور اُس منحوس تھیٹر مین آگ لگا دینے کا حق دے - اور اگر حق نہ دے تو شاید مسلمانون کے دل کا جوش اور اپنی توہین مذہبی کا انتقام لینے کا جنون دل مین ایسی اُمس پیدا کرے گا کہ دل بے اختیار ہو جائے گا - اور شاید گورنمنٹ کو اپنا انتظام متعلقۂ امن و امان قائم رکھنے مین کسی قدر دقتین لاحق ہونگی -

بالفرض شبہہ بلکہ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہین کہ تمام مسلمان اپنے مذہبی معاملات کو ڈراما کی حیثیت سے بنا کے دکھایا کرتے ہین لیکن پورے مراتب تعظیم و تکریم کے ساتھ - یہ نہین ہوتا کہ ہم کسی کے مذہبی مقتداؤن کی اپنے ڈراما مین توہین کرتے ہون - ہمارے دوست ہندو رام چندر جی اور سری کرشن جی کے ڈرامے دینی آداب کے ساتھ دکھاتے ہین لیکن انکے دیسی اسٹیجون پر نہ کوئی موسیٰ آتا ہے نہ کوئی عیسیٰ آتا ہے اور نہ کسی محمد کی صورت نظر آتی ہے اور نہ اُس کی توہین کیجاتی ہے - علیٰ ہذا القیاس ہمارے

شیعون کے ڈراما مین مظلوم سید الشہدا علیہ السلام کی مصائب دکھائے جاتے ہین۔ نہ وہ مریم بتول کو بے عزتی کی وضع مین نکالتے ہین اور نہ کسی اور عیسائی پیشوا کی وضع مین کسی کو لاکے ذلیل کرتے ہین۔ ہمارا ڈراما اپنا دکھڑا رونے کے لیے ہوتا ہے ہم اورون کی توہین کرنے سے کوئی غرض اور کوئی مطلب نہیں رکھتے۔

جب ہمارے یہ خیالات ہین تو ہم کیونکر دیکھ سکتے ہیں نہین۔ کیونکر سن سکتے ہین کہ کوئی اور بیہودہ شخص ہمارے مذہبی مقتداؤن کی توہین کرے۔ جہان تک ہمارا دسترس ہوگا ہم اُسکو روکین گے۔ اُسکی ناجائز اور بیہودہ اور لغو اشتہارون کو بڑی ذلت کے ساتھ خاک مین ملانے پر آمادہ ہونگے اور ہرگز موقع نہ دین گے کہ دنیا بھر مین کوئی شخص ایسے تعصبات کا ظاہر کرنے والا نظر آئے۔

انگلستان کے پولٹیکل تعلقات زیادہ تر مسلمانون ہی کے ساتھ ہین۔ ہندوستان مین مسلمانون کی بہت زیادہ آبادی ہے۔ افغانستان اُسکی حمایت مین اپنے تئین سینہ سپر ثابت کر رہا ہے۔ ایران مین روس کے مقابل مین اپنی پالیسیون کے کامیاب کرنے کی ابھی اُسے بہت ضرورت ہے۔ ترکون سے اسکے تعلقات قدیم سے چلے آتے ہین اور اب تک انگلستان ترکون کا ہمدرد ہے۔ اسکے علاوہ بھی پالیسیون کا ایک بہت بڑا میدان افریقہ ہے جس مین انگلش گورنمنٹ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اُسے مصر کو اپنے موافق کرنا ہے۔ زنجبار کو اپنا مطیع بنانا ہے۔ اور سب سے بڑی بات جسکی تکمیل مسلمانون ہی کی یاری اور اعانت سے ہو سکتی ہے وہ بردہ فروشی ہے۔ انسداد بردہ فروشی کے لیے انگلستان بڑی بڑی کوششین کر رہا ہے وہ چاہتا ہے کہ یہ ظالم رسم دنیا سے اُٹھ جائے۔ اور سب سے بدتر تجارت انسانی کو دنیا مین زوال ہو۔ اس تجارت کے حامی اسوقت مسلمان ہی ہین۔ اور اسی وجہ سے افریقہ مین اکثر انگلستان کے خلاف جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ عرّبی پاشا کا جوش، مہدی کی فوج کشیان ان سب کی اصلی بنا انسداد بردہ فروشی تھی۔ انگلستان اپنی دھمکیون سے اور اپنی فوجی قوت دکھا کے تمام بازار ہاے بردہ فروشی واقع افریقہ کو بند نہین کر سکتا۔ ہان اگر وہ بند کرا سکتا ہے تو اسی طرح کہ انگلستان کی انسانیت اُن لوگون کے ذہن مین مرتکز ہو جائے جو بردہ فروشی کے حامی ہیں

اور انکو یقین آجائے کہ انگلستان میں کوئی تعصب اور کسی قسم کی بدنیتی نہین ہے۔ وہی سب لوگ جواب بڑی مصیبتون سے راضی کیے گئے ہین کہ انگلستان کی صلاح نیک پر عمل کرین۔ جب یہ سنین گے کہ انگلستان کے دارالسلطنت کے تھیٹر مین ڈراما کے ذریعے سے محمد صلعم کی توہین کی جاتی ہے تو کیا کہین گے؟ اور خود انگلستان بھی سمجھ سکتا ہے کہ برٹش پالسی کو کتنا بڑا ضرر پہونچ جائے گا۔

بیشک ملکۂ معظمہ نے نہایت عمدہ کارروائی کی جو اُس ڈراما کو موقوف کرادیا۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا امر وقوع مین آجاتا تو انگلستان کو بارہ کروڑ مسلمانون کی دل آزاری سے جن مین بیشتر جنگجو خود مختار والیان ملک سلطان، شاہ، رئیس، اور عوام بھی شامل ہین ایسی صورت مین کہ جب وہ اس ڈراما پر نہایت شد و مد سے اعتراض کر چکے ہین بہت بڑا پولیٹیکل نقصان پہونچتا۔

عنقاء

عربی۔ فارسی۔ اور اُردو لٹریچر مین عنقاء کی بے انتہا شہرت ہے۔ وہ ایک ایسا طائر ہے جو کبھی دنیا مین نہین دیکھا گیا صرف شعرا کے خیال مین رہتا ہے۔ متقدمین نے اسکے بہت کچھ حالات بھی لکھے ہین، مگر وہ سب عموماً اُن روایتون سے اخذ کیے گئے ہین جو انسانی تمدن کے بچپن اور میتھالوجی یعنی دیومالا کے زمانے کی ہین۔ فی الحال عنقاء سے عموماً ہر ایسی چیز مراد لی جاتی ہے جو صرف وہم و گمان مین ہو مگر کبھی ظہور مین نہ آئی ہو۔

ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ کا ابتدائی دور افتتاحی زمانہ اُس کی دیومالا سمجھا جاتا ہے۔ جس مین عموماً ایسی باتین ہوتی ہین جو بعید از عقل اور انسان کے بچپن کے خیالات و اوہام کا نمونہ ہوتی ہین۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہر قوم کی دیومالا مین اس قسم کا کوئی نہ کوئی جانور بیان کیا گیا ہے۔ ابتداءً اُسے دیوتاؤن کی ایسی وقعت دی گئی۔ بعد والون نے اُسکے وجود سے انکار تو نہین کیا مگر اُس کے طرح طرح کے حالات بیان کیے۔ اور کہا اُن مقامات مین رہتا ہے جہان انسان کا گذر نہین ہوتا۔ لیکن اب جبکہ محققین اور خاصۃً علم حیوانات کے

ماہرین نے ساری دُنیا چھان ڈالی تو سب کو تسلیم کرلینا پڑا کہ وہ محض ایک خیالی چڑیا ہے جسے خدا نے نہیں بلکہ قدما کے وہم وگمان نے پیدا کیا تھا۔

غور طلب یہ ہے کہ عنقاء کا خیال اصل مین عربون کا ایجاد کیا ہوا ہے یا ایسے اُنھون نے کسی قوم سے اخذ کیا؟ اگر خود لفظ کو دیکھا جائے تو "عنقاء" کا لفظ خالص عربی ہے۔ اور کسی عجمی زبان سے نہین لیا گیا ہے۔ عربی مین "عنق" گردن کو کہتے ہین۔ اور حیوٰۃ الحیوان مین دمیری شافعی نے عنقاء کی وجہ تسمیہ دو بتائی ہین۔ ایک یہ کہ عربون کے خیال کے مطابق اِس عظیم الشان اور خیالی طائر کے گلے مین ایک سفید طوق سا بنا ہوتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ اسکی گردن بہت لمبی ہوتی ہے۔ غرض انھین دونون مین سے کسی خیال کی بنیاد پر اس کا نام "عنقاء" قرار دیا گیا۔

لیکن یہ صرف نام کی بنا پر ہے۔ ورنہ یہ خیال اور اس قسم کا کوئی نہ کوئی طائر ہر قوم کی دیو مالا مین موجود ہے۔ قدیم مصریون نے اس قسم کے ایک خیالی طائر کی تصویرین اپنی عمارتون پر بنائین اور اُس کی بڑی بڑی عظیم الشان مورتین تراشی تھین۔ جس کا سر کہین آدمی کا سا کہین مینڈھے کا سا اور کہین عقاب کا بنایا تھا دھڑ شیر کا اور اُس مین عقاب کے ایسے دست و بازو لگائے تھے۔

اسی طرح نسروس نام ایک طائر کی صورت اہل بابل کی دیو مالا مین تھی جسے وہ اپنا ایک زبردست دیوتا خیال کرتے تھے۔ اُنکے مذاق مین نسروس کا دھڑ آدمی کا تھا۔ اور چونچ اور پر عقاب کے ایسے تھے۔ یونانیون اور رومیون کے عقائد مین بھی اسی قسم کا مجتمع الاضداد طائر موجود تھا جسے وہ گرِفن کہتے تھے۔ اُس کا دھڑ شیر کا اور چونچ اور بازو عقاب کے تھے۔ ہندوؤن کے اعتقاد مین بھی اسی قسم کا ایک زبردست طائر موجود ہے جسے وہ گرڑ کہتے ہین۔ اُن کی دیو مالا مین اگرچہ اس طائر کے متعلق چوپایون یا انسان کا دھڑ تو نہین تجویز کیا گیا۔ مگر صرف عظمت و قوت کے لحاظ سے اُسے بہت کچھ ترقی دی گئی۔ بتایا گیا کہ سری کرشن جی مع تمام خاندان کے اُس پر سوار ہو کے سیر کرتے تھے۔ اور مہابھارت کے نامور سورما اُسی پر سوار ہو کے میدان رزم مین آئے تھے۔ اسکے ساتھ اُس کا یہ بھی روحانی

کمال بتایا گیا کہ اُڑتے وقت اُس کے پروں سے مقدس وید کے اشلوک سُنے جاتے ہیں۔ ایرانیوں میں بھی سیمرغ موجود تھا جسنے رستم کے باپ زال کی پرورش کی تھی اور وقتاً فوقتاً رستم کی مدد کو آیا کرتا تھا۔

اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ عربوں میں اس وہمی طائر کا خیال کس قوم سے آیا۔ ظہور اسلام سے پیشتر اُن کا تمدن تین قوموں کے خیالات کا مجموعہ تھا۔ اول عرب عاربہ جو آل قحطان کہلاتے تھے اور جن کا اصلی وطن ملک یمن تھا۔ اور دراصل یہی لوگ اصلی عرب تھے۔ دوسرے یہود جو حضرت اسمٰعیل کے زمانے ہی سے یہاں آنا شروع ہو گئے۔ جن سے اور قحطانیوں کے امتزاج سے ایک نئی نسل پیدا ہوئی جو عرب مستعربہ کے نام سے مشہور تھی۔ اور اس گروہ کے قائم ہو جانے کے بعد بھی موسوی آداب و تمدن کا بہت کچھ اثر عربوں پر پڑا ہوا تھا اور تیسرے ایرانی جو قدیم الایام سے اہل عرب کے ساتھ تعلقات رکھتے آتے تھے اور جن سے پیشتر اُنھیں کے ملک میں سے صائبین جو حقیقۃً قدیم بابلی مذہب کے پیرو تھے سارے عرب میں پھیل چکے تھے۔ ایرانیوں اور صابئین میں کسی ایسے طائر کا خیال موجود ہونا خود اُن کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔ یہود کے مسلمات میں بھی کوئی نہ کوئی ایسا طائر ضرور موجود ہوگا۔ اس لیے کہ گو اُن کی کتابوں میں ڈھونڈھنے کی ہمیں نوبت نہیں آئی مگر عربی کہانیاں جو اسرائیلی روایتوں سے ماخوذ ہیں اس کی شہادت دے رہی ہیں۔ باقی رہے اصلی عرب اور قحطانی اُن کے زمانے کی کوئی کتاب یا تحریر موجود نہیں ہے۔ مگر زیادہ تر قیاس اسی طرف جاتا ہے کہ عربوں میں عنقاء کا خیال اُنھیں لوگوں سے شروع ہوا۔ اس لیے کہ عنقاء کے جتنے خالص عربی قصے کتب عربیہ میں نقل کیے گئے ہیں سب ملک یمن اور صنعاء ہی سے علاقہ رکھتے ہیں۔

اتنی تاریخی تنقید کے بعد اب ہمیں بتانا چاہیے کہ اہل عرب کے نزدیک عنقاء کیا چیز ہے؟ اُس کی صورت کیسی ہے؟ اور وہ کب اور کہاں پایا گیا؟ ربیع الابرار سے صاحب حیوٰۃ الحیوان نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے جو یقیناً بنی اسرائیل کی روایتوں اور کہانیوں سے ماخوذ ہے۔ کہ "اللہ جل شانہ نے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے مین ایک چڑیا پیدا کی جس کا نام عنقاء تھا۔ اسکے جسم مین چارون طرف چار بازو تھے۔ چہرہ آدمی کا سا تھا۔ اور خدا نے اُسے ہر چیز مین سے کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرمایا تھا۔ اور اُسکے لیے اُسی کا سا ایک نر بھی پیدا کیا۔ پھر جناب موسیٰ پر وحی نازل کی کہ مین نے دو عجیب و غریب چڑیان پیدا کی ہین اور اُن کا رزق اُن وحشی جانورون کو قرار دیا ہے جو بیت المقدس کے گرد رہتے ہین۔ اسکے بعد اُن کی نسل بڑھنا شروع ہوئی۔ مگر جب حضرت موسیٰ کا انتقال ہو گیا تو یہ طیور ارض فلسطین چھوڑ کے نجد مین چلے آئے۔ جہان وحشی درندون کو کھانے اور بچون کو اُٹھا لے جاتے تھے۔ یہان تک کہ حضرت رب العزت نے بنی عبس مین سے خالد بن سنان عبسی کو پیغمبر بنا کے مبعوث کیا۔ لوگون نے اُن کی خدمت مین حاضر ہو کے فریاد کی تو اُنھون نے درگاہ خداوندی مین دعا کی۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ اس جانور کی نسل ہی فنا ہو گئی"۔

یہ تو وہ روایت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عنقاء کا خیال اہل عرب مین بنی اسرائیل سے آیا۔ مگر دوسری روایتین جن سے اس طائر کا وجود عرب عاربہ اور بنی قحطان مین مین ثابت ہوتا ہے۔ عربون مین زیادہ مشہور ہین۔ اور اُن روایتون کے ذریعے سے قوم رس کے زمانے مین اِس طائر کا ظاہر ہونا پایا جاتا ہے۔ سہیلی نے لکھا ہے کہ قوم رس کا مرکز شہر عدن تھا۔ اور جو قوم وہان آباد تھی وہ قوم ثمود کی باقیماندہ یادگارون مین تھی۔ انھین لوگون کے زمانے مین عدن والون کے لیے پانی کے وہ قابل حیرت عظیم الشان حوض اور کنوین بنائے گئے جو آج تک موجود ہین اور جن مین بارش کا پانی پہاڑون سے اُتر کے جمع ہوتا اور برس بھر تک اہل شہر اور دیگر مخلوق کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اِسی سرزمین مین اور اِسی مذکورہ قوم کے زمانے مین علامۂ عکبری طائر عنقاء کا ظہور بتاتے ہین۔ وہ لکھتے ہین کہ اُنکے علاقے مین ایک پہاڑ تھا جو مخ کہلاتا تھا اور اُس کی چوٹی زمین سے ایک میل اونچی تھی (غالباً اس سے وہ مقام مراد ہے جہان آج کل شہر مخا آباد ہے) اس پہاڑ پر انواع و اقسام کے طیور رہا کرتے تھے جن مین عنقاء بھی تھا۔ یہ بہت بڑا قوی ہیکل طائر تھا جس کا چہرہ آدمی کا ایسا تھا۔ اور دنیا مین جتنے جاندار ہین اُن سب کی

اُس میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور موجود تھی۔ باوجود اس عظمت کے یہ نہایت خوبصورت چڑیا تھی۔ اور اس پہاڑی پر ہر سال میں ایک مرتبہ آیا کرتی تھی۔ اور اسکے تمام طیور کا شکار کر لیا کرتی تھی۔ ایک سال یہ اتفاق پیش آیا کہ پہاڑ کی چڑیاں اُسکے لیے کافی نہ ہوئیں اور بھوک نے ستایا تو انسانوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ پہلے ایک لڑکے کو جھپٹ لے گئی۔ پھر ایک لڑکی کو اُٹھا لے گئی۔ ان دنوں حضرت حنظلہ بن صفوان علیہ السلام موجود تھے جو قوم رس پر مبعوث ہوے تھے۔ لوگوں نے اُن کی خدمت میں جاکے شکایت کی۔ حنظلہ نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی۔ جس کی مقبولیت یوں ظاہر ہوئی کہ عنقا پر بجلی گری اور وہ جل بھُن کے خاک ہو گئی۔

اسی مضمون کو تھوڑے اختلاف کے ساتھ علامہ قزوینی نے عجائب المخلوقات میں بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”عنقا سب سے بڑا طائر ہے۔ ہاتھی کو اس طرح اپنے پنجے میں اُٹھا لے جاتا ہے جس طرح کہ چیل چوہے کو اُٹھا لے جاتی ہے۔ اگلے دنوں یہ چڑیا آدمیوں میں رہتی تھی جنھیں اُس سے اذیت پہونچنے لگی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ ایک دولھن کو جبکہ وہ زیور سے آراستہ و پیراستہ بیٹھی ہوئی تھی اُٹھا لے گئی۔ یہ حالت دیکھ کے حضرت حنظلہ نبی نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔ اور خدا نے اُسے وہاں سے اُڑا کے بحر اعظم کے کسی جزیرے میں پہونچا دیا جو خط استوا کے اُس پار ہے آدمیوں کا وہاں تک گذر نہیں ہوتا۔ اور بڑے بڑے وحشی جانور اور درندے وہاں کثرت سے ہیں جن کو شکار کر کے وہ اپنی زندگی بسر کرتی ہے عنقاء جس وقت اُڑتا ہے اُسکے پروں سے گرج اور پانی کے دھڑ دھڑا کے گرنے کی سی آواز نکلتی ہے۔ اُسکی عمر دو ہزار برس کی ہوتی ہے۔ اور پانچ سو برس کا پٹھا بالغ ہوتا اور انڈے دیتا ہے۔ اور انڈا دینے کے وقت اُسے نہایت سخت تکلیف ہوتی ہے۔ عرب لوگ عنقاء کو عنقاء مغرب کہتے ہیں۔ جسکی وجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے خیال میں اس کا اصلی وطن سرزمین مغرب ہے۔

یونانیوں میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ اس قسم کا ایک طائر مشہور ہے جو گرفون کہلاتا ہے۔ غالباً اسی کا حال ارسطو نے اپنی ایک کتاب میں بیان کیا ہے جس سے عربی مصنفین کو اپنے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اور اُن واقعات کو اُنھوں نے عنقاء

سے کے تذکرے مین نقل کر لیا - ارسطو طالیس نے سب سے بڑھ کے یہ کمال کیا ہے کہ کہتا ہے "اس طائر کا شکار بھی کیا جاتا ہے - اور اُسکے پنجون سے پانی پینے کے نہایت نفیس اور بڑے بڑے کاسے بنائے جاتے ہین" پھر خود ہی اُس کے شکار کی یہ تدبیر بتاتا ہے کہ "لوگ دو بیل لا کے کھڑے کرتے ہین اور اُن کے درمیان مین ایک بڑا بھاری تھیلا رکھتے ہین جو دونون جانب اُن مین باندھ دیا جاتا ہے اور اُسکے اندر بہت بڑے بڑے وزنی پتھر بھر دیے جاتے ہین - جن کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے اور اُس تھیلے کے سامنے ایک کوٹھری بنائی جاتی ہے جس مین کوئی آدمی چھپ کے بیٹھ رہتا ہے - اور وہ اپنے پاس آگ تیار رکھتا ہے - عنقا اوپر سے گرتا ہے کہ اُن بیلون کو جھپٹا مار کے اُڑا لے جائے - مگر وہ بیل اُن پتھرون کی وجہ سے نہین اُٹھ سکتے - اور اُسکے پنجے اُن کے جسم مین پیوست ہو جاتے ہین - یہ دیکھتے ہی آدمی کوٹھری سے آگ لیے ہوے نکلتا ہے اور اُسکے پرون مین آگ لگا دیتا ہے" - ارسطو اس جانور کا حلیہ یہ بتاتا ہے کہ "اُس کا پیٹ بیل کے مثل ہوتا ہے اور ہڈیان درندون کی ایسی ہوتی ہین"

ارسطو نے تو اس کے شکار ہی کی تدبیر بتائی تھی - مسلمان مصنفین مین سے بعض بزرگون نے اُسے دیکھا بھی تھا - چنانچہ علامۂ ابن خلکان کہتے ہین احمد بن عبد اللہ بن احمد فرغانی نے (جو ارض مصر مین آکے اقامت گزین ہو گئے تھے) اپنی تاریخ مین لکھا ہے کہ "خلفاء بنی فاطمہ مصر کے خاندان والون مین سے عزیز بن نزار بن معز نے اپنے یہان طرح طرح کے زندہ جانورون کا ایک عجائب خانہ قائم کیا تھا جس مین ایسے ایسے عجیب جانور لا کے جمع کیے گئے تھے جیسے کہ شاید اُس سے پیشتر کبھی نہ جمع کیے گئے ہون گے - انھین مین عنقا بھی تھا - جو بلندی مصر کے علاقون سے لایا گیا تھا"

عربون مین اسی حیثیت و شان کا ایک جانور رُخ کے نام سے بھی مشہور ہے - جس کا الف لیلہ مین ذکر آیا ہے - اور شاید وہ الف لیلہ ہی کی ایسی کہانیان تھین جن سے اخذ کر کے اُسکے حالات عجائب المخلوقات اور حیوٰۃ الحیوان مین درج کر دیے گئے ہین - مگر اب عنقا، سیمرغ، اور رُخ، ان تینون نامون کا مفہوم ایک

ہی خیال کیا جاتا ہے جو گولر کے پھول یا کسی ایسی چیز کے مترادف ہے جسکا وجود صرف خیالات میں ہو۔ اور ظاہری و مادی دنیا میں اُس کا کبھی پایا جانا نہ ثابت ہوتا ہو۔

تخلیق عالم اور نیچرل ہسٹری کے موجودہ محققین کی رائے اب یہ قائم ہوتی جاتی ہے کہ انسان کی پیدایش سے پیشتر اور اُس کے ابتدائی دور میں کرۂ زمین ایسے ایسے عظیم الشان، عجیب وغریب اور خوفناک پرندوں، چوپایوں اور چھپکلی کے ایسے جانوروں سے بھرا ہوا تھا جن کی نسلیں باہمی لڑائیوں اور خلقت کی کشمکش سے فنا ہو گئیں۔ اُن میں سے بعض کی ہڈیوں کے ڈھانچے بھی برفستانی مقامات میں پڑے مل گئے جو دُنیا کے بڑے عجائب خانوں میں لا کے رکھے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی کوئی چڑیا اُس زمانے میں اور نوع انسانی کے بچپن میں موجود ہو۔ جس میں وہ پوری شان پائی جاتی ہو جو عنقا یا رُخ یا سیمرغ کی بتائی گئی ہے۔ فی الحال انسان نے زمین کے ہر ہر کونے کو چھان ڈالا اور ایسے کسی طائر کا پتہ نہیں لگا۔ لہذا تجربہ اور مشاہدہ ہمیں یہی کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ عنقا خارج میں نہیں بلکہ صرف ہمارے ذہن اور ہمارے خیال میں ہے۔

گریک فائر یا نفط

جن دنوں لڑائی کے میدانوں میں توپوں اور بندوقوں کی آوازیں نہیں گونجی تھیں۔ اور جان باز سپہگروں کو بارود کا استعمال نہیں معلوم تھا۔ شمشیر و خنجر اور نیزوں اور تیروں سے دشمن پر حملہ کیا جاتا تھا۔ اور گُرز وتبر کے ذریعے سے بہادر سورما اور سر بکف نبرد آزما جوش شجاعت ظاہر کیا کرتے تھے اُن دنوں یکایک آتش باری کی ایک نئی اور نہایت ہی خوفناک ترکیب ظاہر ہوئی۔ اور لوگ گھبرا اُٹھے۔ اس آگ کا نام یورپ والوں میں "گریک فائر" یا آتش یونان مشہور ہوا۔ اور عربوں میں "نفطہ" یا روغن نفط"

اس بارۂ خاص میں یونان سے مراد پُرانا یونان نہیں ہے جبکہ اُنکے ابتدائی تمدن اور اُنکے فلسفہ و حکمت کا عروج تھا۔ اور اُن میں لی کرغوس و سولن کے سے

مقننن۔ افلاطون اور ارسطو کے ایسے فلسفی اور فیلقوس و اسکندر کے ایسے بادشاہ پیدا ہو رہے تھے۔ نہین بلکہ یہ اُس یونان کا ذکر ہے جب قسطنطنیہ مین مشرقی سلطنت روم کے بعد یونانی مشرقی سلطنت قائم تھی جو کلیساے یونان کی حامی اور کلیساے روم کی دشمن تھی۔ جبکہ پوپ کو ان یونانی سلاطین سے عداوت تھی۔ اور یونانی پوپ کی عظمت و حرمت کو نہ مانتے تھے۔ غرض ان دنون اور ظہور اسلام کے بعد قسطنطنیہ مین پہلے پہل اس کا رواج مورخین یورپ کو نظر آیا۔ خود یونان والے اس آگ کو آتش یونان نہین کہتے تھے بلکہ وہ ایسے الفاظ سے یاد کرتے تھے جن کا ترجمہ ہے "آتش سیال" اور "آتش بحری" مگر مورخین یورپ نے اسے "آتش یونان" کہنا شروع کیا۔ اس لیے کہ یورپ کو اس کا پتہ پہلے پہل قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت ہی مین لگا۔ پھر اسکے بعد صلیبی لڑائیون کے موقع پر جب یورپ کی تمام قومین لڑائی اور جہاد کے لیے شام۔ ارض فلسطین اور مصر مین آئین تو اُنھون نے ان ممالک کے قابض مسلمانون کو اس آگ کے برسانے مین نہایت ہی باکمال اور مشاق پایا۔

نفطہ کا استعمال خشکی کی لڑائیون اور نیز بحری معرکہ آرائیون مین یکسان طریقے پر کیا جاتا تھا۔ اور اسکے استعمال کے طریقے یہ تھے کہ قلعون اور شہرون کی فصیل پر سے تانبے اور سیسے کی پچکاریون مین بھر کے پھینکتے تھے یا لوہے اور پتھر کی دیگچیان بھر بھر کے دشمن کی طرف پھینکتے تھے۔ جہازون مین عموماً تانبے کی پچکاریون کا رواج تھا۔ جو چارون طرف لگا دی جاتی تھین۔ اور اُنکے دہانے دشمن پر ہیبت ڈالنے کے لیے اژدھون، گرمچھون، شیرون اور دیگر مہیب جانورون کے ایسے بنے ہوے ہوتے تھے۔ چند روز بعد اس مین یہ ترقی کی گئی کہ یہ آگ بن جانے والا رقیق روغن لاکھ یا موم ملا کے موم سا بنا لیا جاتا۔ اور حملے کے وقت تیرون اور برچھون کے پھلون مین چپکا دیا جاتا۔ پھر جب تیر پھینکے جاتے اور نیزے گھما کے مارے جاتے تو حرکت کی گرمی اور ہوا کے اثر سے فوراً مشتعل ہو جاتے اور کسی کے بدن مین چھو بھی جاتے تو جلا کے خاک کر دیتے۔

ہوا مین پھینکنے سے اسے جو حرکت خط قوسی کی وضع پر ہوتی وہی اس کے

مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھی - ہوا میں چڑھتے ہی بڑے زور سے پھٹنے کی ایک آواز بلند ہوتی - سخت غلیظ دھواں نمودار ہوتا - اور ساتھ ہی شعلہ پیدا ہو جاتا - ژوان ویل مورخ جو فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کے ساتھ صلیبی جہاد کے لیے ارض مقدس میں آیا تھا اُسکے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیوں پر سب سے بڑی آفت یہی نفطہ تھا - جس سے وہ بالکل آشنا نہ تھے - وہ لکھتا ہے "یہ آگ رات کو برسائی جاتی تو سارا کیمپ روشن ہو جاتا - لوگ گھبرا گھبرا کے اوندھے منھ گر پڑتے - آستینوں سے منھ چھپا لیتے - یعنی اس ہولناک منظر کے دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکتی - اور دعا کرتے کہ خدا یا بچا - ہوا میں اس وضع و شان سے اُڑتی دکھائی دیتی کہ معلوم ہوتا جیسے کوئی پردار اور لمبی دُم کا آتشیں اژدہا اُڑتا چلا آتا ہے - رعد کی کڑک اور بجلی کی چمک دونوں چیزیں اُس میں موجود ہوتیں - اور اندھیری رات میں ایک ہیبت ناک روشنی عالم پر چھا جاتی -

فرانسیسی مورخ جوزف فرانسوا مشو اپنی تاریخ صلیبی میں لکھتے ہیں "صلیبیوں کو اس مہیب آگ کی صورت پہلے پہل نظر آئی تو نائٹ لوگ بدحواسی کے ساتھ دوڑے کہ اپنے چوبی برجوں کو بچائیں - بعض نے اپنے مددگاروں کو پکارنا شروع کیا - دوسرے لوگ زمین پر گر پڑے یا گھٹنوں پر جھک کے درگاہ الٰہی میں التجائیں کرنے لگے - خود لوئی نہم بھی اپنے اُمرا اور نائٹوں سے کم مرعوب و ہیبت زدہ نہ تھا - اور جیسے ہی اُس نے گریک فائر کے پھٹنے کی گرج سُنی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے - اور چلا اُٹھا: "خداوندا! اے عیسیٰ مسیح! مجھے اور میرے ساتھیوں کو بچا!"

مسٹر گبن کے بیان کے مطابق اُسی زمانے کا ایک نائٹ جو مسلمانوں کی سپہ گری کا نہیں قائل تھا اور اُنکے اسلحہ کی نہایت توہین و تحقیر کیا کرتا تھا گر آتش یونان کی نسبت نہایت سادگی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ "جن منجنیقوں سے نفطہ کی پچکاریاں ماری جاتی تھیں اُنکی صورت دیکھ کے یا اُن کی آواز سُن کے میرا اور میرے تمام ساتھیوں کا دل دہل جایا کرتا تھا"

مگر یونانیوں کی مشرقی سلطنت قسطنطنیہ میں اس کا رواج اس سے بہت پیشتر تھا - اس لیے کہ گبن اور دیگر مورخین بیان کرتے ہیں کہ قسطنطنیہ پر عربوں نے جو

ابتدائی دو حملے جناب معاویہ اور ولید بن عبدالملک کے عہد میں کیے تھے اُن میں اسی آتش یونان کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی - اور مشرقی قیاصرہ کے زمانے میں اُنھیں حوصلہ شکن ناکامیاں ہی ہوئی تھیں - لہذا یورپ کے مورخین مسرت ظاہر کرتے ہیں کہ مسیحیوں کی اُنھیں دو فتحوں کی بدولت یورپ عربوں کی اطاعت سے محفوظ رہ گیا - صرف اسی قدر نہیں بلکہ عربوں کو مغلوب کرنا یا انکی رفتار ترقی کو روک دینا اُس زمانے میں اتنی بڑی حیرت انگیز اور خلاف اُمید کامیابی تھی کہ سارے فرنگستان اور کل مغربی ممالک یورپ میں قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت کی دھاک بیٹھ گئی - اور سب اُس سے ڈرنے اور کانپنے لگے - جس رعب کا اصلی اور قوی باعث یہی آتش یونان تھی -

چونکہ قسطنطنیہ کی عظمت کا سارا دارومدار اسی پر قرار پا گیا تھا لہذا اس کے نسخے اور اسکے استعمال کی ترکیب کو وہ لوگ ایک نہایت ہی مخفی راز سلطنت کی طرح چھپاتے تھے - قرب و جوار کی دوست اور معاہد سلطنتوں کو ضرورت کے اوقات میں بڑی بڑی منجنیقیں ، فوجیں ، اور بہت سے جہاز عاریۃً دیدیے جاتے تھے مگر یہ ممکن نہ تھا کہ گریک فائر کی پچکاریاں یا اس کا سامان کسی قریب سے قریب دوست کو بھی عاریت دیا جائے - اس رازداری پر مذہب نے اپنا رنگ جمایا - اور مقتدایان دین سے روایتیں تصنیف کرلیں - چنانچہ خود سلطنت مشرقی یہ ظاہر کرتی تھی کہ "گریک فائر کا راز ایک فرشتے کے ذریعے سے خاص قسطنطین اعظم کو بتایا گیا تھا - اور بتانے سے پہلے اُس سے شرط کرائی گئی تھی کہ اس برکت ربانی اور رحمت خداوندی سے کوئی اور شخص عام اس سے کہ دوست ہو یا دشمن ہرگز نہ مطلع کیا جائے" - نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہ اور رعایا سب کے سب مذہبی احکام کے ذریعے سے مجبور کیے گئے تھے کہ اس بارۂ خاص میں اپنی زبان کو ہمیشہ کے لیے بند رکھیں - اور اگر کوئی اس حکم سے انحراف کرتا تو اُسکے لیے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی سخت سزائیں تجویز کی گئی تھیں - بلکہ اس سے بھی بڑھ کے یہ اندیشہ دلایا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص اس جرم کے ارتکاب کا ارادہ بھی کرے گا تو ملک و قوم پر خدا کا غضب نازل ہو جائے گا - الغرض رازداری

کی ان تاکیدوں کا یہ اثر تھا کہ کچھ اوپر چار سو برس تک یہ راز قسطنطنیہ والوں ہی میں محفوظ اور قسطنطنیہ کی چار دیواری کے اندر محدود رہا۔

اس کا نسخہ اگرچہ مکمل طور پر نہیں بتایا گیا ہے مگر انسائیکلوپیڈیا اور نیز گبن کی تحریروں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا جزوِ کامل تو یہی روغنِ نفط ہے جسے ہم مٹی کا تیل کہتے ہیں اور جو اب ہمارے گھروں میں اور ہمارے لیمپوں میں کثرت سے جلا کرتا ہے۔ اس میں کچھ حصہ گندھک کا ملایا جاتا تھا۔ صنوبر کا گوند بھی پڑتا تھا۔ اور غالباً کچھ اور اجزا بھی ہوں۔

یورپ والوں کا عام خیال ہے کہ اس کا نسخہ سب کے پہلے گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں شہر پیسا والوں نے جو اُن دنوں سب سے بڑے جہاز راں خیال کیے جاتے تھے یونان والوں سے چُرا کے حاصل کر لیا۔ اور اسی کے قریب زمانے میں مسلمانوں نے بھی خواہ چُرا کے معلوم کیا یا خود ہی ایجاد کر لیا۔ اور صلیبی لڑائیوں میں اسے اس کمال کے ساتھ کام میں لانے لگے کہ جس حربے سے معاویہ اور ولید کے زمانوں میں اُنھوں نے قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے شکست کھائی تھی اُسی حربے سے حملہ آور صلیبیوں کو پسپا کیا

مگر غور کرنے اور تحقیق و تنقید سے کام لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں محقق مورخان مغرب سے سخت غلطی ہو گئی ہے۔ اول تو انسائیکلوپیڈیا کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "گریک فائر کا استعمال زیادہ قدیم زمانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اسیریا والوں کی جو یادگاریں موجود ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ بھی اس کا استعمال جانتے تھے"۔ کتاب "لیٹن کنگڈم آف جروسلم" کے مصنف مسٹر کانڈر بھی لکھتے ہیں کہ "آتش باری کی یہ ترکیب وسط ایشیا کے مغلوں اور یونانیوں کو مدت ہائے دراز سے معلوم تھی"۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ قدیم الایام والوں کی اس سخت آتش باری کے مفصل و مشرح حالات بالکل ہمیں نہیں معلوم ہو سکتے اور نہ ہمیں یہ متیقن ہو سکتا ہے کہ وہ اسی نفط کے ذریعے سے آتش باری کرتے تھے یا کسی اور طریقے سے۔ قرون وسطیٰ اور تحقیق و تنقید کے زمانے میں یورپ والے اسے قسطنطنیہ ہی کے محاصروں میں

بتاتے ہین -

غور طلب یہ امر ہے کہ یونانیون کو اس کا نسخہ کیونکر معلوم ہوا - آیا اُنھون نے اسے ایجاد کیا یا کسی اور شخص سے حاصل کیا؟ اس سوال کا جواب مسٹر گبن سے یہ ملتا ہے کہ کالی نیکوس نام ایک شامی نژاد شخص جو شہر بعلبک کا رہنے والا اور مسیحی المذہب تھا خلیفۂ اسلام کی ملازمت چھوڑ کے قسطنطنیہ چلا گیا - اور شہنشاہِ یونان کی ملازمت اختیار کر لی - اُس شخص سے پہلے پہل یونانیون کو یہ نسخہ ہاتھ لگا - جس نے یا تو خود ایجاد کیا تھا، یا کسی اور سے سیکھا - یہ خیال غالباً غلط ہے - کالی نیکوس کو عرب لوگ لوقا بن قسطا کے نام سے یاد کرتے ہین جو سلیمان بن عبدالملک کے عہد مین قلمرو اسلام سے ناراض ہو کے چلا گیا تھا -

میسو مشو نے اپنی تاریخ کے ضمیمہ جات مین سوانحعمری سلطان صلاح الدین مصنفہ "رینو دہ" کے ایک قلمی نسخے سے نفطے کے حال مین کچھ کیفیت نقل کی ہے - اُس مین بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ پُرانے یونانیون مین ایک ایسی ہی چیز موجود تھی مگر اُسکو اس آخر وقت کی آتش یونان سے کوئی علاقہ نہین - جو قسطنطنیہ مین عربون کے محاصرے کے وقت ظاہر ہوئی - مسیحی لوگ صرف اس بنیاد پر اسے آتش یونان کہنے لگے کہ تاثیر اور کیفیت مین دونون ملتی جلتی تھین - اس مین کالی نیکوس کا صرف اتنا حال بتایا گیا ہے کہ قسطنطین پوگوناطوس کے عہد مین اُس نے اسکے استعمال کی کلین اور منجنیقین تیار کرائین - اور تانبے کی پچکاریان بنائین - جن کے ذریعے سے یہ دشمنون پر پھینکی جا سکتی تھی - اسکے بعد وہ اُسی مین لکھتا ہے کہ ابن المجاس نام ایک شخص نے (جو بالکل مسلمانون کا سا نام ہے) اسے بالکل نئی صورت سے ایجاد کیا - افسوس کہ ہم کو عربی اور انگریزی دونون زبانون کی کتابون سے پتہ نہین لگ سکا کہ یہ ابن المجاس کون شخص ہے - مگر مسیو رینو دہ نے جس طرح ابن المجاس کا نام بتایا ہے اُسی طرح یہ بھی نئی بات کہی ہے کہ "اس کے نام کے متعلق مختلف قومون کو سخت دھوکا ہوا - یعنی یونان والے تو اسے مسلمانون کی آگ کہتے تھے - لاطینی مسیحی اسے یونانیون کی آگ کہتے تھے - اور اہل مشرق نفطہ کہتے تھے" -

ابن المجاس کا پتہ لگانے سے تو ہم عاجز ہین - مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ کالی نیکوس

کون شخص تھا اور کس عہد مین تھا۔ بیٹن کی بیاگرفیکل ڈکشنری مین اسکا صرف اتنا حال لکھا ہے کہ "وہ فن عمارت کا ایک قدیم ماہر تھا۔ جس نے آتش یونان کو ایجاد کیا۔ اور اس کا نسخہ راز کے طریقے پر قسطنطین ثالث ملقب بہ پوگوناطوس کو بتا دیا۔ جس نے اس کے استعمال سے عربون کے جہازون کے بیڑے کو ۶۷۳ء مین جلا دیا۔ وہ قلمرو مصر کے شہر ہلیوپولی مین پیدا ہوا تھا"۔ ہلیوپولی ارض شام کے شہر بعلبک کو کہتے ہین۔ اس لیے یہ غلط ہے کہ وہ مصر کا رہنے والا تھا۔ بلکہ دیگر مصنفین اور خود شہر بعلبک دونون تصدیق کر رہے ہین کہ کالی نیکوس ایک شام کا مسیحی المذہب شخص تھا۔ مسٹر گبن لکھتے ہین اور یہی انسائیکلوپیڈیا مین بھی ہے کہ وہ خلیفہ اسلام کی ملازمت چھوڑ کے قسطنطنیہ چلا گیا تھا اور قسطنطین ثالث کی ملازمت اختیار کی تھی جو ۶۶۸ء مین مشرقی سلطنت کے تخت پر بیٹھا تھا۔ یہ زمانہ خلافت اسلامی کی تاریخ مین جناب معاویہ کا تھا۔ لہذا یہ سمجھنا چاہیے کہ کالی نیکوس حضرت معاویہ کی نوکری چھوڑ کے گیا ہوگا۔ اور گریک فائر کی ایجاد بھی اسی دور مین ہوئی۔ مسلمان مورخین اپنی تحریرون مین کہین اس بات کا پتہ نہین دیتے کہ انھین قسطنطنیہ کی دیوارون کے نیچے یا اُس کے قریب کے سمندر مین جو شکستین ہوئین اُن مین دشمنون کی طرف سے آتشباری کی گئی تھی۔ اور وہی آتشباری باعث شکست ہوئی۔ تاہم مغربی مورخین مین یہ واقعہ انتہا سے زیادہ مشہور ہے۔ اور ہم اُسے تسلیم کیے لیتے ہین۔

لیکن یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ کالی نیکوس ہی نفطے کا موجد تھا؟ کیا یہ ممکن نہین ہے کہ بعلبک مین اُس نے نفطے کو مسلمانون سے سیکھا ہو؟ اور قسطنطنیہ پہونچ کے جب دیکھا ہو کہ تمام لوگ اس سے ناواقف ہین تو موجد کی حیثیت سے اُس نے لوگون کو اسکی تعلیم کی ہو؟

یورپ والے سمجھ رہے ہین کہ اُسکے بعد بہت صدیون تک نفطہ کا استعمال قسطنطنیہ والون مین ایک راز سربستہ رہا۔ کسی کو اسکی خبر نہ تھی۔ اور مسلمانون مین بھی اس کا استعمال پہلے پہل صلیبی لڑائیون کے وقت دیکھا لیا۔ لیکن ہمارے پاس اسکی کافی شہادتین موجود ہین کہ کالی نیکوس کے زمانے کے قریب ہی مسلمان نیک کامیابی کے ساتھ نفطہ کا استعمال کر رہے تھے۔

چچ نامہ اور میر معصوم بھکری کی تاریخ سندھ میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ ۷۱۲ء مطابق ۹۴ھ کے قریب یعنی جناب معاویہ کے ۳۹ برس بعد جب سندھ میں محمد بن قاسم اور راجہ داہر سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کی طرف سے نفطہ کے ذریعے سے آتش باری کی گئی۔ راجہ داہر جس ہاتھی پر سوار تھا اُس پر عربوں نے حقہ ہاے آتش بازی (آگ کے بھرے ہوے ظروف) برسائے۔ چچ نامے کے دو نسخوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "محمد بن قاسم کے ہمراہ نو سو تیر انداز تھے جو تیروں کے ذریعے سے حریف پر نفطہ برسا کے آگ لگاتے تھے"۔ میر معصوم کی "تاریخ" کا ممکن ہے کہ اعتبار نہ کیا جائے۔ مگر چچ نامے کے بیان پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلیے کہ مسٹر الییٹ کے نزدیک بظن غالب وہ کتاب ۷۵۳ء مطابق ۱۳۶ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔

اُسی زمانے اور اُسی پایے کی ہم ایک اور شہادت بھی پیش کر سکتے ہیں۔ جس سے یہی ثابت نہیں ہوتا کہ عرب لوگ نفطہ کے استعمال کو اُن دنوں جانتے تھے بلکہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ صرف وہی اپنے آپ کو اس فن کا مالک خیال کرتے تھے۔

"تاریخ یعقوبی مطبوعہ لیڈن میں ہے کہ جنید بن عبد الرحمٰن مری نے (جسے خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے عہد ۱۰۷ھ (۷۲۶ء) میں بصرے کے گورنر جنرل خالد قسری نے والی سندھ مقرر کرکے بھیجا تھا) چین[ع] کے ایک مضبوط قلعے کا محاصرہ کیا۔ ایک زمانے تک سرگرمی دکھانے میں جب کامیابی نہ ہوئی تو اُس نے روغن نفط برسانا شروع کیا۔ لیکن اُسے یہ دیکھ کے حیرت ہو گئی کہ اس آگ اور روغن کے شعلوں کو قلعے والے فوراً بجھا دیا کرتے تھے۔ جنید نے ذرا تامل کرکے کہا معلوم

عہ چین سے مراد ہنری الییٹ کی تحقیق میں شہر چیناپٹ ہے جہاں کنشک نے اپنے چینی کفیلوں کو رکھا تھا۔ یہ شہر پنجاب میں دریاے بیاس سے مغرب جانب دس میل کے فاصلے پر تھا چینی سیاح ہوین ٹسانگ نے ۶۳۵ اور ۶۹۹ کے درمیان میں اسے دیکھا تھا۔ اور چودہ مہینے تک وہ یہاں رہا۔ سر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے خیال کے مطابق حملۂ عرب کے زمانے میں یہاں ایک حکومت قائم تھی جس کے فرمان روا کو عرب بادشاہ چین کہتے تھے۔

ہوتا ہے اس قلعے مین کچھ عرب لوگ بھی موجود ہین - اس لیے کہ بغیر انکی تعلیم کے یہ آگ نہین بجھ سکتی - اس شبہے کی وجہ سے اُس نے محاصرے مین اور سختی کی - آخر قلعے والون نے عاجز آکے پیغام صلح دیا - اور اطاعت قبول کی - بعد تکمیل معاہدہ جنید قلعے مین داخل ہوا اور ہر طرف تلاش کرنا شروع کیا تو واقعی دو عربی الاصل شخص ملے - اور تفتیش سے ثابت ہوگیا کہ اُنھین کی حکمت سے وہ آگ بجھائی گئی تھی - ان دونون کی اس قومی نمک حرامی پر جنید کو سخت غصہ آیا - اور اُنھین قتل کر ڈالا "

اب اس تصدیق کے دیکھنے کے بعد شبہہ نہین کیا جا سکتا کہ عرب لوگ اس فن مین اپنے آپ کو یکتا اور فرید عصر خیال کرتے تھے - اور اُنکے علم مین بھی نہ تھا کہ نفطہ کا استعمال اُنکے سوا کوئی اور بھی جانتا ہے - اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یونانیون کی طرح اُنھین بھی اسکے مخفی رکھنے مین اہتمام تھا - چنانچہ مسٹر ایلیٹ کو بھی اپنی تاریخ ہند مین یہ لکھ دینا پڑا کہ " اگر یہ سچ ہے تو داہر کی لڑائی (۷۱۲ء) پہلا موقع ہے جبکہ عربون نے نفطہ یا آتش یونان کا استعمال کیا -

ان تمام واقعات کے ملانے سے نفطہ کی ایجاد کے متعلق جو صحیح اور قابل وثوق رائے قائم کی جا سکتی ہے یہ ہے کہ روغن نفط کے کنوؤن کے گرجستان اور عراق مین موجود ہونے کے باعث اس کا نسخہ قدیم بابلیون اور مغلون کو مدت ہاے دراز سے معلوم تھا - اُن سے مسلمانون نے اپنے ابتدائی عہد مین اخذ کیا اور ترقی دینے لگے - اسی اثنا مین اُنکے ملک کا ایک مسیحی شخص اِس نئی چیز کا حال دریافت کرکے قسطنطنیہ مین بھاگ گیا - اور وہان کی حکومت کو اُس سے مطلع کر دیا - قسطنطنیہ والے اسے اُسی کی ایجاد سمجھے - اور ایک نعمتِ ربانی تصور کرکے اُسے چھپانے لگے -

عربون نے چند روز بعد اُسے اپنے فوجی حربون میں شامل کر لیا - اور دشمنون کے مقابل کام مین لانے لگے - یورپ والون کو جو اُن دنون مشرقی دنیا کے حالات سے بالکل ناواقف تھے اسکی خبر نہ ہونے پائی - اور سمجھتے رہے کہ یہ چیز قسطنطنیہ والون ہی کے اندر محدود رہے - مگر جب صلیبی لڑائیون کے زمانے مین اُولوالعزمی سے کام لے کے شام و فلسطین مین آئے تو مسلمانون کو نفطہ کے ذریعہ سے آتش باری کرتے دیکھ کے ہکا بکا

رہ گئے۔

عربوں کا سب سے بڑا کمال اس بارۂ خاص میں وہ تھا جسے ہم اس سے پیشتر دلگداز کے ایک نمبر میں بتا چکے ہیں کہ عکہ کے محاصرے کے وقت انھوں نے اسکی قوت اتنی بڑھا دی کہ جو چیزیں آگ نہیں پکڑتیں اُن میں بھی اس کے خوفناک اثر کو قائم کر دیا۔ اور وہ برج جلا کے خاک کر دیے جو بڑے اہتمام کے ساتھ فائرپروف بنائے گئے تھے اور جن پر آگ سرایت ہی نہ کر سکتی تھی۔ نفط میں قیامت کی یہ بات تھی کہ اسکی آگ پانی سے بجائے بجھنے کے اور مشتعل ہوتی تھی۔ سمندر اور تالاب کی سطح پر وہ اسی طرح مشتعل رہتا تھا جس طرح کسی لکڑی کی چیز پر مشتعل ہو۔ اور اس کی بجھانے والی صرف تین چیزیں تھیں۔ بالو۔ پیشاب اور سرکہ۔ جن لوگوں کو یہ اجزا نہ معلوم ہوتے وہ اس کے بجھانے سے عاجز تھے۔

مغربی یورپ والوں اور فرنگیوں کو اس کا نسخہ یونانیوں اور قسطنطنیہ والوں سے نہیں حاصل ہوا۔ بلکہ صلیبی لڑائیوں کی بدولت انھیں یہ چیز مسلمانوں سے ہاتھ لگی۔ مسٹر کانڈر اپنی کتاب لیٹن کنگڈم آف جروسلیم میں لکھتے ہیں کہ فرانس کا بادشاہ فلپ دوم تھوڑا سا روغن نفط عکہ سے واپس جاتے وقت اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ جس کی مدد سے وطن پہونچ کے اُس نے شہر ڈی اپ کی لڑائی میں انگریزوں کا پورا بیڑا تباہ کر دیا۔ مگر پھر بھی مدت ہائے دراز تک فرانسیسیوں کو اس کے بنانے کی ترکیب نہیں معلوم تھی۔ اور انسائیکلو پیڈیا برٹانکا میں ہے کہ ۱۷۵۵ء میں دو فرانسیسی شخصوں نے جن کے نام گوبر اور ڈوپرے تھے اس آتش سیال کا از سر نو پتہ لگا لیا تھا۔ مگر وہ بھی اُس کے شائع کرنے سے روکے گئے۔

لیکن اسی نفط کے نسخے اور استعمال نے انسان کو بارود کا نسخہ بتا دیا جسکے ظاہر ہوتے ہی دنیا کا فن جنگ ہی بدل گیا۔ اور وہ آتش سیال اسکے مقابل دشوار اور دقت طلب ہونے کے باعث ایسی مٹی کہ آج دنیا میں شاید کوئی صحیح نسخہ جاننے والا بھی نہ موجود ہوگا۔ بارود کے متعلق ہم کسی اور موقعے پر بحث کریں گے۔ لہذا اس بحث کو یہیں پر ختم کرتے ہیں۔

ریش مقدس

انسان کی متلون مزاجیون کی جس قدر مکمل تصویر ڈاڑھیون کو دیکھ کے نظر آتی ہے ہم اور کسی جگہ نہیں دیکھ سکتے - تمام حیوانات خاص کر طیور میں پوری طرح نمایان ہے کہ قدرت نے نر و مادہ مین کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رکھا ہے - نر کو بعض قسم کے پر و بال زیادہ دیے ہین - جن مین طرح طرح کی رنگ آمیزی اور حیرت انگیز چمک دمک ہوتی ہے اور مادہ کی دلفریبی اور دلکشی مین چاہے کتنا ہی جذب و اثر ہو مگر غیر جنس کی نظر مین نر کی زیبائی و رعنائی مادہ سے کہین زیادہ ہے - ہم اپنے شوق اور اپنے تقاضاے نفس سے عورتون کو زیور پہناتے اور اُنھین ہر قسم کے سامانِ زینت سے آراستہ کرتے ہین - مگر قدرت نے اپنا خوشنما اور نظر فریب زیور نر ہی کو پہنایا ہے - اسی قدرتی زیور مین سے ایک ڈاڑھی بھی ہے جو قدرت کی جانب سے مرد کو دی گئی ہے - لیکن مرد نے بجاے قدر کرنے کے اس زیور مین ایسی ایسی قطع و برید کی اور اُس مین ترمیم و تغیر کر کے ایسی ایسی دھجین بنائین کہ حیرت معلوم ہوتی ہے -

ابتدائی زمانے مین جبکہ انسان نے زیادہ ہاتھ پانون نہین نکالے تھے اور جب تک نہ اُسترا ایجاد ہوا تھا نہ قینچی نہ کنگھی تھی نہ آئینہ - ڈاڑھیان اپنی اسی اصلی حالت پر رہین - جیسا کہ خدا نے اُنھین بنایا تھا - توراۃ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے منہ پر اچھی خاصی ڈاڑھی تھی - جو نظن غالب جھنڈولی اور ہر طرف پھیلی ہوئی تھی - پاپایان روم کے ایوان مین حضرت آدم کا ایک پرانا سنگی تابوت رکھا ہے جس پر آپ کی ایک تصویر بھی ترشی ہوئی ہے - اُس مین بھی سنگتراش نے آپ کی اسی وضع کی ڈاڑھی تراشی ہے - روایت توراۃ کی بنا پر یہود نے اس سنتِ آدمی کو اپنا اخلاقی قانون بنا لیا تھا - اور ہر یہودی کے منہ پر لمبی چوڑی مقدس ڈاڑھی ضرور ہوا کرتی تھی - اور اُنکا اعتقاد تھا کہ ڈاڑھی کی جس قدر خدمت کی جائے اُسی قدر ثواب ہوتا ہے - کیونکہ ڈاڑھی خدا کی ایک متبرک ودیعت ہے - یہود کو اپنی داڑھیون سے جس قدر محبت تھی اُس کا پتہ اس سے لگ سکتا ہے کہ مصر مین باوجودیکہ فراعنہ اور قبطی ڈاڑھی مُنڈاتے تھے اُن لوگون

کو گویا ڈاڑھی سے عناد سا تھا مگر یہودنے اُنکی وضع کو ہرگز اختیار نہ کیا۔ اور صدیوں کی غلامی کے بعد بھی اپنی ڈاڑھیاں بچا کے نکل آئے۔ یہودہی پر منحصر نہیں۔ اگلے زمانے کے اکثر شریف قوموں میں ڈاڑھی شرافت و عزت کا مرکز خیال کیجاتی تھی۔ سچے آدمی کے لیے ایک متبرک و محترم چیز اور مرد کی مردانگی کا تمغہ اور اُس کی شرافت و عزت کا مظہر خیال کی جاتی تھی۔ سچے آدمی کے لیے راست بازی کی نمایاں علامت ڈاڑھی ہی تصور کی جاتی تھی۔ کوئی شخص کسی بڑے کام کا حوصلہ کرے اور کسی دشواری کے مقابلے پر جائے تو اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہتا "انشاءاللہ!" کوئی کسی سے پناہ مانگے اور اپنے آپ کو امان میں دینا چاہے تو اُس کی ڈاڑھی کو ادب و نرمی سے چھولیتا۔ چنانچہ تاریخ توراۃ کا بہادر یوہاب اپنے حریف اماسا کے سامنے گیا تو فریب کی راہ سے اس کی ڈاڑھی چومی اور کہا "بھائی اچھے ہو؟" اماسا اس فقرے میں آکے غافل ہوگیا اور یوہاب نے اپنی تلوار اُسکے سینے میں بھونک دی۔ بچے۔ عزیز و اقارب۔ اور دوست احباب اپنے محترم عزیز یا دوست کی ڈاڑھی کو تعظیماً آہستہ سے ہاتھ لگاتے تو سمجھا جاتا کہ وہ نہایت ہی محبت و عزت سے پیش آئے۔ لیکن اگر کوئی شخص گستاخانہ حیثیت سے کسی کی ڈاڑھی پر ہاتھ ڈال دے تو سمجھا جاتا کہ اُس نے اُس کی سخت توہین کی۔ مصر میں فراعنہ اور امراے قبط اگرچہ سب کے سب ڈاڑھیاں منڈاتے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے ذہن میں ڈاڑھی کی قدر و منزلت کا خیال ضرور موجود تھا۔ چنانچہ بڑی عید دن اور خاص تیوہاروں میں فراعنہ مصنوعی ڈاڑھیاں منہ پر لگا لیا کرتے تھے جیسا کہ اُن کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور مردہ دیوتاؤں کے چہروں پر بھی نوکیلی ڈاڑھیاں بنایا کرتے تھے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانے والے فرعون کی ڈاڑھی موتیوں سے گندھی رہتی تھی۔

ادھر مشرق میں بھی ڈاڑھی کی قدر تھوڑی نہ تھی۔ شاہان فارس ڈاڑھی کے اوپر جو فولادی ریش پوش لگاتے اُسے سونے کے تاروں سے کستے تھے۔ اور زبردست تاجداران نینوا اپنی گھونگھردار ڈاڑھیوں میں تیل ڈال کے اور کنگھی کرکے بڑے بناؤ سے گھر سے باہر نکلا کرتے تھے۔ اگلے دنوں یہ بھی نظر آتا ہے

کہ بعض ملکوں اور سلطنتوں میں محض ڈاڑھی کے باعث لڑائی چھڑ گئی اور بڑی بڑی خونریزیاں ہوئیں۔ تاتاریوں اور ایرانیوں اور چینیوں اور تاتاریوں میں صرف اس اختلاف کے باعث لڑائی ہوئی کہ ایک قوم کہتی تھی ڈاڑھی مونڈی جائے اور دوسری کا دعوے تھا کہ مونڈی نہ جائے بلکہ اُسکے بال اُکھاڑے جایا کریں۔

یونانیوں اور رومیوں میں بھی ابتدائً سب کے مُنہ پر ڈاڑھی ہوتی تھی۔ اُنکے تمام فلسفی اور بڑے بڑے مشاہیر ڈاڑھی والے تھے۔ مگر حضرت مسیحؑ سے تین سو برس پیشتر جب صقلیہ (سسلی) کے نائی وہاں پہونچے تو لوگوں نے ڈاڑھیوں کو خیرباد کہنا شروع کیا۔ لیکن اب جو ڈاڑھیوں کے مُنڈنے کا رواج ہوا تو اس شدت سے کہ "باربرس" کا لفظ جسکے معنی ڈاڑھی والے کے ہیں تمام وحشی قوموں اور اُن جماعتوں کی نسبت استعمال کیا جانے لگا جو اُنکے حلقۂ اثر سے باہر تھیں۔ مگر پھر بھی اُن میں ڈاڑھی کی عزت کا اس قدر خیال ضرور موجود تھا کہ جو شخص عاقل و بالغ ہوتا اور اُسے مرد آدمی کہنا چاہتے تو "بارٹوس" یعنی صاحب ریش کہتے۔ اور اسی کا اثر تھا کہ اُنکے نوخیز امرد لڑکے روز ٹھڈّی میں تیل ملا کرتے کہ جلد ہی ڈاڑھی نکلے۔ اور ہمارا شمار قوم کے بڑوں میں ہو۔ زمانہ مابعد کے بعض قیاصرہ اور سلاطین کے مُنہوں پر بھی ڈاڑھیاں تھیں۔ اُنکے مصنفین ہومر۔ ورجل۔ پلینی۔ پلوٹارک۔ اسٹرابو۔ ڈیوڈورس۔ جووِنل۔ اور پرسیوس نے ڈاڑھی کے متعلق اسقدر مباحث لکھے ہیں کہ اگر اُنکو جمع کیا جائے تو اچھا خاصہ لٹریچر تیار ہو جائے۔ یہ سب تو ڈاڑھی رکھنے کے مؤیّد ہیں تھے مگر قیصر روم جولین نے ڈاڑھی کی مذمت میں بھی ایک کتاب لکھ ڈالی۔ لیکن باوجود اس مخالفت کے خود اُسکے منہ پر اگلے فلسفیوں کی تقلید میں جھنڈولی ڈاڑھی تھی۔ اور گو اُسکے سارے جسم پر بال تھے مگر اُسترا سوا سر کے کہیں نہیں لگنے پاتا تھا۔ پرسیوس کہتا ہے کہ دانائی ڈاڑھی سے وابستہ ہے۔

یہ خیال اگلے دنوں لوگوں کے دماغ میں اس قدر بسا ہوا تھا کہ کسی بادشاہ نے ایک بے ریش دبروت لڑکے کو ایلچی بنا کے کسی دوسرے بادشاہ کے دربار میں بھیجا۔ اس امرد سفیر کی صورت دیکھتے ہی اُس نے سخت برہمی کے ساتھ کہا

"میرے دربار میں ایک بے ریشے لونڈے کو سفارت پر بھیجا ہے"۔ یہ سن کے نوعمر ایلچی بولا "میرے آقا کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ حضور کے نزدیک ڈاڑھی کی اس قدر ضرورت ہے تو میرے عوض ایک بکرے کو بھیج دیتا"۔

اسکندر اعظم کے عہد میں معلوم ہوتا ہے کہ یونانیون اور مقدونیہ والون میں ڈاڑھی کا عام رواج تھا۔ مگر سکندر نے یہ بدعت ایجاد کی کہ سپاہیون کی ڈاڑھیان منڈوا دین۔ اور اس کارروائی کا محرک یہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو دشمن ان سپاہیون کی ڈاڑھیان پکڑ پائین اور بے بس کر کے مغلوب کرین لیکن اسکے بعد یورپ مین ڈاڑھیون کا پھر رواج ہوگیا۔ جس کا حال ہم آگے بیان کرین گے۔

قوم عرب مین مدت ہاے درازسے ڈاڑھی رکھنے کا رواج چلا آتا تھا۔ جسکو اسلام نے بھی شرافت و مردانگی کا تمغہ تسلیم کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے زمانے تک یہ بات اہل عرب کے وہم و گمان مین بھی نہ تھی کہ کوئی شریف قوم ڈاڑھی منڈواتی ہے۔ صرف عجمیون اور مجوس کی نسبت اتنا جانتے تھے کہ اُن کی ڈاڑھیان مُنڈی ہوتی ہین۔ جب داراے ایران خسرو پرویز کے سفیر یمن سے مدینے مین آئے۔ اور حضرت رسالت کے مہمان ہوئے تو اُن کی مُنڈی ہوئی ڈاڑھیان دیکھ کے آپ نے پوچھا "تم لوگ ڈاڑھی کیون منڈاتے ہو؟" انھون نے کہا "ہمارے مالک ہی حکم ہے"۔ یہ سن کے آپ نے ارشاد فرمایا "مگر میرے مالک (خدا) نے مجھے داڑھی کے چھوڑنے اور مونچھون کے کٹوانے کا حکم دیا ہے"۔ اسی واسطے آپ نے صحابہ کو تعلیم فرمائی "فطرت (انسانی یا ایمانی اس لیے کہ اسلام میں دونون متحد ہین) کا تقاضا یہ ہے کہ ڈاڑھی چھوڑ دی جائے اور مونچھین کٹوائی جائین"۔ حضرت رسالت کے اس ارشاد نے ڈاڑھی کا مرتبہ اور بڑھا دیا۔ صحابہ کی عام وضع یہ تھی کہ لمبی ڈاڑھیاں اور کتری ہوئی مونچھین۔ حضرت ابن عمر اور بعض دیگر صحابیون کا معمول تھا کہ مُٹھی سے ڈاڑھی کو ناپتے اور جتنی بڑھتی نظر آتی اُسے کاٹ ڈالتے۔ اور چارون طرف سے برابر کرنے کے لیے بھی کاٹتے تھے۔ مگر یہ بھی خاص خاص لوگون کی وضع تھی ورنہ عموماً سب کی ڈاڑھیان مطلقاً چھوٹی ہوئی تھین۔ اور مونچھین اس قدر کتری ہوئی کہ

جلد نظر آئے۔ اسلام اس وضع و حلیہ کی اشاعت کرتا ہوا عرب کی حدود سے باہر نکلا۔ اور جہان جہان پہونچا وہان ڈاڑھی کی قدر و منزلت بھی زیادہ ہوتی گئی اور چند روز مین شام و مصر۔ ایران و توران۔ اور افریقہ و اندلس مین جہان دیکھیے نورانی ڈاڑھیون کا جلوہ نظر آرہا تھا۔ اور حریف پر جتنا رعب لمبی ڈاڑھیونکا پڑتا تھا کسی چیز کا نہ پڑ سکتا تھا۔

مسلمانون کی یہ عام وضع تھی کہ لمبی داڑھیان ہوتین۔ اُن مین تیل ڈالا جاتا۔ کنگھی کی جاتی۔ اور سن رسیدہ شہسوارون کی ڈاڑھیون پر مہندی کی سرخی اور کبھی نیل کی سیاہی اپنا جلوہ دکھاتی۔ ڈاڑھی کو اپنی عزت سمجھتے۔ اور ساتھ ہی خیال کیا جاتا کہ ڈاڑھی چونکہ مردانگی کا فطری زیور ہے لہذا عورتین بھی بالطبع ڈاڑھی والے مرد کو بے ڈاڑھی والے سے زیادہ محبوب رکھتی ہین۔ ڈاڑھی کی شرم سب سے بڑی شرم ہوتی۔ اور ڈاڑھی کی عزت کرنا سب سے بڑی خاطرداری خیال کی جاتی۔ یہان تک کہ بچون کے ساتھ اظہار شفقت منظور ہوتا تو بڑے بوڑھے اُن کی ٹھڈیون کو اپنے ہاتھ مین لیتے۔ اور سمجھتے کہ گو ان کے ڈاڑھی نہیں مگر ڈاڑھی نکلنے کی جگہ پر ہاتھ لگانا اُنکی عزت بڑھانا ہے۔

اب بعد کا زمانہ آیا۔ اور مسلمان دیگر اقوام مین مل جُل کے اُنکی وضع و قطع اختیار کرنے لگے۔ پہلا تغیر تو بظن غالب عباسیہ کے آخری دور مین یہ ہوا کہ بعض مسلمان ایرانیون کی تراش خراش سے متاثر ہوئے اور ڈاڑھیان کتروانے اور چھوٹی کرانے لگے۔ اور ڈاڑھی کی اُس اگلی عزت و حرمت مین کمی ہونے لگی۔ یہان تک کہ عرب کے ہاتھ سے حکومت ہی نکل گئی۔ اور تاج و تخت کی وارث ترکی قوم ہوئی۔ جس نے مختلف ممالک مین مختلف سلطنتین قائم کین۔ اور ہر سلطنت کے مسلمان اپنی قلمرو کے لوکل اثرون سے متاثر ہونے لگے۔ اُدھر دولت عثمانیہ کے وارث تاج و دیہیم سلطان سلیم اول نے (جس کا زمانہ ۱۵۱۲ء سے ۱۵۲۰ء تک تھا) غالباً مسیحیون کی وضع پسند کر کے سب کے پہلے ڈاڑھی کو خیرباد کہی۔ ادھر دولت مغلیۂ تیموریہ کے وارث شہنشاہ جلال الدین اکبر نے (جسکا عہد ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک تھا) اپنے سالے سسرون کے اثر سے متاثر ہو کے

ڈاڑھی کا صفایا بول دیا۔ ہندوستان مین اکبر کے اس فعل کو مسلمان سوسائٹی نے گو ناپسند کیا مگر سب نے ایسی خاموشی اختیار کی کہ نہ کسی نے مخالفت کی آواز بلند کی اور نہ کسی نے بادشاہ کی وضع اختیار کی۔ مگر سلطان سلیم کی مخالفت نے ذرا زیادہ جوش دکھایا۔ گو سلطان کے سامنے کسی کو زبان کھولنے کی مجال نہ تھی مگر شیخ الاسلام نے جی کڑا کر کے پوچھا "حضور نے ڈاڑھی کیون منڈا ڈالی"۔ سلیم نے ہنس کے مسخرے پن سے کہا "تاکہ وزیر کے ہاتھ مین میری کوئی ایسی چیز نہ آسکے جسے پکڑ کے وہ مجھے جدھر چاہے کھینچ لیجائے"۔

مگر اسلام کی گرفت ایسی نہ تھی کہ اسلامی ممالک مین یورپ کی طرح بادشاہ کی وضع کا اثر عام سوسائٹی پر پڑ جاتا۔ نہ اکبر کی وجہ سے مسلمان شرفا و امرا نے اپنی ڈاڑھیان منڈائین۔ اور نہ سلیم کی وجہ سے ترکی امرا و ارکان دولت نے۔ بلکہ خود اُنکے جانشینون مین بھی یہ وضع نہ قائم رہ سکی۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے تو البتہ ڈاڑھی منڈائی تھی مگر بعد جو دیکھا گیا تو ساری دنیا کے مسلمان تاجدارون کے مُنہ پر لمبی اور نورانی ڈاڑھیان تھین۔

اب موجودہ مسلمانون کی ڈاڑھیون کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ہمین یہ بتانا چاہیے کہ ظہور نیر اسلام کے بعد یورپ کی سرزمین مین غریب ڈاڑھی پر کیسی کیسی آفتین نازل ہوئین۔ اور وہان اُسے کن کن مصیبتون کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاڑھی نے نشیب و فراز عالم اور انسانی تلون مزاجیون کے جیسے جیسے کرشمے اس مغربی حصۂ زمین مین دیکھے کہین نہین دیکھے تھے۔ کبھی تو بڑی بڑی لمبی ڈاڑھیان تھین اور کبھی صفاچٹ۔ مذہب عیسوی اگرچہ یہود مین سے نکلا تھا۔ اور حضرت مسیح اور آپ کے حواری سب ڈاڑھی والے بزرگ تھے مگر مذہب نے اسکی کچھ پروا نہ کی۔ کلیسائے روم و کلیسائے یونان مین جہان اور اختلافات ہین وہان یہ بھی ہے کہ کلیسائے یونان ڈاڑھی کا موید و حامی ہے اور کلیسائے روم غالباً رومیون کے آخری مذاق کی پابندی مین ڈاڑھی کے خلاف۔ بلکہ مغربی مقتدا ڈاڑھی کو عیب خیال کرتے ہین۔ اسوقت خود پوپ اور اُنکے تمام کارڈنل (جن مین سے پوپ منتخب ہوتے ہین) سب کی ڈاڑھیان خوب منڈی

ہوتی ہیں۔ لیکن شاید یہ آخر عہد کے پاپاؤں کا بنایا ہوا قانون ہے۔ کیونکہ قدیم الایام کے اکثر پاپا ڈاڑھی والے تھے۔ نیپلز میں قدیم پاپاؤں کی مورتیں پر اسنے ہی زمانے کی ترشی ہوئی رکھی ہیں۔ جن میں پوپ کلیمنٹ سابع (۱۵۲۳ء) سے لے کے پوپ اسکندر ہشتم (۱۶۸۹ء) تک کی مورتیں ترتیب وار نظر آتی ہیں۔ اور موجودہ پوپوں کی منڈھی ہوئی ڈاڑھی موچھوں کے بعد اُنکے چہروں پر نظر ڈالیے تو حیرت معلوم ہوتی ہے۔ آخر عہد میں جب پوپ نے ڈاڑھی منڈانے کا فتویٰ دیا تو ہر طرف ڈاڑھیوں پر ظلم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ بلجیم کے ریفارمروں نے خواہش کی کہ ڈاڑھی والے مسیحی لامذہب اور دین عیسوی سے خارج کیے جائیں۔

تیرہویں صدی عیسوی تک انگلستان میں بھی ڈاڑھی رکھنے کا عام فیشن تھا۔ مگر پندرہویں صدی میں ڈاڑھیوں پر ایسے ہاتھ صاف ہونے لگے کہ ڈاڑھی والے چند ہی چہرے باقی رہ گئے تھے۔ ہنری ہشتم کے عہد میں لنکنز ان کے معزز و محترم ارکان نے یہ قاعدہ جاری کیا کہ جس کے منہ پر ڈاڑھی ہو وہ بغیر دونی فیس ادا کیے بڑے میز پر نہ بیٹھ سکے۔ لیکن ابھی تک اکثر لوگوں کو ڈاڑھیاں اس قدر عزیز تھیں کہ باوجود ان جابرانہ قواعد کے ڈاڑھیوں سے دست بردار نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۵۵۵ء میں ملکہ میری نے اپنے چار معزز اُمرا کو روس کے دربار میں سفیر بنا کے بھیجا تو اُن چاروں کے چہروں پر ڈاڑھیاں تھیں۔ خصوصاً اُن میں سے ایک شخص جارج کلنگ وِتھ کی ڈاڑھی پانچ فٹ دو انچ لمبی تھی۔ جس کی صورت دیکھتے ہی شہنشاہ روس ایوان مہیب" کو بیساختہ ہنسی آگئی۔ جارج کی ڈاڑھی گھنی چوڑی اور دراز تھی۔ اور کھانے کے بعد ایوان اُس سے کھلونے کی طرح کھیلنے لگا۔

لیکن انگلستان میں اُنکے بعد جب ملکہ ایلزبتھ کا زمانہ (۱۵۵۸ء سے ۱۶۰۳ء تک) شروع ہوا تو ڈاڑھیوں پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ اس لیے کہ اس اقبالمند مگر درشت مزاج ملکہ کے حکم سے ڈاڑھیوں پر محصول لگا یا گیا۔ اور حکم جاری ہوا کہ ہر ڈاڑھی والا شخص اپنی ڈاڑھی کی طرف سے سالانہ ۳ شلنگ ۴ پنس محصول ادا کرے۔ اور جس کسی کے چہرے پر پندرہ دن اُسترا نہ پھرے یعنے

اُس کا خط پندرہ دن کا ہوگیا ہو اُسکے ذمے یہ محصول واجب ہو جائے۔ ہم نہین جانتے کہ اُن دنون انگلستان مین نائیون کو ڈاڑھی مونڈنے کی کیا اُجرت دینی پڑتی تھی لیکن اس مین شک نہین کہ یہ سرکاری ٹکس نائیون کی سالانہ اجرت سے زیادہ ہی دینا پڑتا ہوگا۔ کیونکہ انگلستان مین اُن دنون زندگی بسر کرنا اس قدر گران نہ تھا جس قدر کہ اب ہے۔ اور اس مین شک نہین کہ انگریزون مین جو رواج ہوگیا ہے کہ ہر شخص صبح کو منہ دھوتے وقت اپنی ڈاڑھی آپ مونڈ لیا کرتا ہے یہ اُسی دَور کی برکت ہے۔ تاہم بہت سے لوگون نے اب بھی ڈاڑھی نہ منڈائی۔ بلکہ سرکاری محصول ادا کرنے سے اور زیادہ خوش ہو ہو کے اپنی ڈاڑھیون پر ہاتھ پھیرتے کہ محصول دینے پر بھی انکی محبت ہمارے دل مین باقی ہے۔

اسکے تقریبًا نوے برس بعد پیٹر اعظم نے روس مین بھی ڈاڑھیون پر محصول لگا دیا۔ مملکت ہسپانیہ مین جو دو صدی پیشتر عروج پر تھی غالبًا عربون کے اثر سے ڈاڑھی کی اچھی داشت ہوتی تھی۔ اور کل معززین کے چہرون پر ڈاڑھیان ہوا کرتی تھین۔ لیکن ۱۷۰۰ء مین فلپ پنجم کی تخت نشینی کے ساتھ ڈاڑھیون کی قسمت بھی پلٹ گئی۔ انکی بدنصیبی سے فلپ مذکور خوسا تھا یعنی قدرت ہی نے اُسے ڈاڑھی کے زیور سے محروم رکھا تھا۔ ڈاڑھی والون کی سوسائٹی مین اپنے اس پیدائشی نقصان کو وہ برداشت نہ کرسکا۔ اور اپنی خفت مٹانے کے لیے حکم دیدیا کہ تمام اہل دربار ڈاڑھی مُنڈا ڈالین۔ اور گو شاہی اثر نے ڈاڑھی مُنڈانے کو اسپین کا فیشن بنا دیا۔ مگر پھر بھی بہت سے لوگ ڈاڑھی کو حسرت سے یاد کرتے اور ایک آہ کے ساتھ کہتے تھے "ہماری ڈاڑھیون کے ساتھ ہماری جانین بھی چلی گئین"

پرتگیزون مین اس سے پیشتر ڈاڑھی کی بڑی قدر تھی۔ اور وہ بھی عربون کی سنت پر چل رہے تھے۔ مگر جب زمانے کی ہوا بگڑی تو وہ بھی یورپ کے عام فیشن کے گرویدہ ہوے۔ اور اس قوم نے بھی ڈاڑھیون کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا

فرانس مین غالبًا یورپ کے دیگر مقامات سے پہلے ہی ڈاڑھیان منڈ گئی تھین۔ مگر مغرب ہی مین "روسکولنی کی" نام ایک مسیحی مبتدع فرقہ نے دعوٰی کیا

کہ مذاکی "ربانی مووّت ڈاڑھی میں ہے" تاہم پوپ صاحب کا مُنڈ انے کا فتویٰ سب پر غالب تھا۔ لیکن وہاں ڈاڑھیاں مُنڈتے ہی منڈتے ایک ایسا زمانہ آگیا کہ یکایک ڈاڑھی کا نصیبہ چند روز کے لیے از سر نو جاگ اُٹھا۔ فرینسس اول جو فرانس کے ۔ ائل کالج اور رائل لائبریری کا بانی ہے ۱۵۱۵ء میں تخت پر بیٹھا۔ اُسکی ٹھوڑی پر ایک زخم کا داغ تھا جو نہایت ہی بدنما معلوم ہوتا تھا۔ اس عیب کے چھپانے کے لیے اُس نے ڈاڑھی رکھ لی۔ چند روز میں سارے دربار کا یہی فیشن ہوگیا۔ اور جسے دیکھیے اُسکے چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ مگر فرینسس کے بعد پھر وہاں زمانے نے ڈاڑھی کے ساتھ سرد مہری کی۔

چند روز پیشتر آخری شہنشاہ فرانس نپولین نے ایک نئی وضع کی ڈاڑھی رکھی یعنی دونوں طرف کلّے مُنڈے ہوے اور ٹھوڑی پر داڑھی۔ کچھ دنوں کے لیے فرانس کی یہی وضع رہی۔ جس کا اثر اب بھی کسی قدر باقی ہے۔ اس کے بالکل برعکس جرمن کے بوڑھے شہنشاہ اور نیز روس وآسٹریا کے شہنشاہوں نے دونوں جبڑوں پر ٹھپکے رکھوائے اور درمیان میں ٹھڈّی منڈا ڈالی۔ یہ وضع یورپ کے بعض فوجی افسروں کو زیادہ پسند آئی۔ اور غالباً اُنھیں کی دیکھادیکھی ہندوستان کے بعض اُمرا نے بھی ٹھپکے رکھوالیے۔ جس وضع کا زیادہ مشہور نمونہ فی الحال حضور نظام حیدرآباد میر محبوب علی خان بہادر کی ڈاڑھی ہے۔

فی الحال یورپ میں ہر جگہ ڈاڑھی مُنڈانے کا عام رواج ہے۔ اور جو ڈاڑھی رکھے اُسکی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ اُسکے مزاج میں صفائی نہیں ہے۔ آج کل یورپ میں سب جگہ سے زیادہ ڈاڑھیاں جرمنی میں نظر آتی ہیں۔ اور اسکا کچھ رواج باقی بھی ہے تو اُس قوم میں جو اکثر موقعوں پر سلطان کی طرفداری کرتی ہے۔

ابھی چند روز ہوے جرمنی نقاش (مصوّر) "جوہان ٹاپو" کی ڈاڑھی دُنیا بھر میں سب سے بڑی ڈاڑھی تصور کی جاتی تھی۔ اور واقعی اتنی بڑی داڑھی الف لیلہ کی پری بانو کے قصے کے سوا اور کہیں نہیں نظر آسکتی۔ اُسکی ڈاڑھی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اتنی لمبی تھی کہ کھڑے ہونے میں بھی زمین پر

لوٹا کرتی۔ اور اکثر مجبور ہو کے وہ اُسے کمر میں لپیٹ لیا کرتا۔

لیکن ہمارے موجودہ فرمان روا قیصر ہند حضور ایڈورڈ ہفتم نے اپنے زمانۂ ولیعہدی ہی سے ایک نئی وضع کی چھوٹی اور نوکیلی ڈاڑھی ایجاد کی جو مسلمانوں کے شرعی حدود کے اندر آجاتی ہے۔ اور اگر قوم میں "من تشبہ بقوم فہو منہم" کے مرض تفرق اتصال کا اندیشہ نہ پیدا ہو اور اس حدیث کا حکم صرف امور دینی تک محدود رکھا جائے تو یقین ہے کہ اس دور کی فیشن ایبل ڈاڑھیاں خلاف شرع نہ سمجھی جائیں گی۔

یہ ڈاڑھی اب یورپ میں بھی رواج پاتی جاتی ہے اور ہندوستان میں بھی یہاں تک کہ شہنشاہ روس نے بھی اپنے آبا و اجداد کی وضع کے خلاف اس وضع کی ڈاڑھی رکھ لی۔ اکثر شاہزادگان یورپ کے چہروں پر اس ڈاڑھی کا جلوہ نظر آرہا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے ہمارے ولیعہد سلطنت پرنس آف ویلز بہادر ہم میں اور ہمارے ملک میں تھے۔ اور اُن کا خوبصورت چہرہ بھی اسی ڈاڑھی کی خوشنمائی کا ثبوت دے رہا تھا۔

ہم تو سمجھتے ہیں کہ اسلام کو ہمارے شہنشاہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کیونکہ اسلام ڈاڑھی کا سب سے زبردست حامی ہے اور یورپ کی موجودہ دست برد سے امید نہ تھی کہ کسی شخص کی بھی داڑھی بچنے پاتی۔ ہمارے شہنشاہ کی توجہ سے یہ غریب اُنکے زیر حمایت آگئی۔ ورنہ دوسری قومیں درکنار مسلمانوں کے چہروں پر بھی شاید اتنی ڈاڑھیاں نہ ہوتیں جتنی کہ اب نظر آتی ہیں۔ سلیم اور اکبر کا ڈاڑھی منڈانا تو مسلمانوں پر کچھ اثر نہیں ڈال سکا تھا مگر مغربی تہذیب کے عروج اور یوروپین اقوام کے میل جول سے اکثر ترقی یافتہ ممالک کے مسلمان اپنے قومی کیرکٹر اور اپنے پُرانے حلیوں کو بھول گئے۔ سب نے ایک سرے سے ڈاڑھی کو خیر باد کہدی۔ اُدھر ترکوں نے بے تکلف ڈاڑھیاں منڈانی شروع کر دیں۔ اودھر ایرانیوں نے۔ اور چونکہ یہ دونوں ملک فی الحال مسلمانوں کی سوسائٹی کے مرکز خیال کیے جاتے ہیں لہذا دیگر ممالک کے مسلمان بھی انکو دیکھ کے اور نیز مغربی حکام کی وضع و قطع پسند کر کے عموماً ڈاڑھیاں منڈانے لگے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں سنیوں کے مقابل شیعوں نے ڈاڑھیوں کی

کی طرف سے پہلے بے پروائی کی۔ اُنکے مقتدایان دین نے بھی فتویٰ دیدیا کہ کوئی لمبی ڈاڑھی رکھنے پر مجبور نہین بلکہ قصر بھی جائز ہے۔ بس اتنی داڑھی ہونی چاہیے کہ دُور سے کوئی دیکھے تو یہ نہ سمجھے کہ منڈی ہوئی ہے۔ مگر اُنکے پیرو اس حد سے گذر گئے۔ بے تکلف منڈانے لگے۔ اور لکھنؤ کا فیشن ہوگیا کہ ڈاڑھی ندارد اور موچھین بڑی۔ تقریبًا کچھ کم ایک صدی سے ہندوستان مین یہ امتیاز چلا آتا تھا کہ شیعونکی ڈاڑھی منڈی ہوتی اور سنیون کے مُنہ پر ڈاڑھیاں۔ یہانتک کہ انگریزی تعلیم اور علی گڑھ کالج کے جدید فیشن نے یہ امتیاز بھی اُٹھا دیا۔ اوراب سنی و شیعہ سب ایک وضع کے ہیں

ختنہ

یہ رسم قدیم الایام سے بعض پُرانی قومون مین چلی آتی ہے۔ اوراس کے سب سے بڑے حامی یہود اور مسلمان ہین۔ مسیحی اگر سچے پیرو مسیح ہوتے تو اُن مین بھی ضرور اس کا رواج ہوتا۔ مگر انھون نے غیر مختون یونانیون اور رومیون کے اثر سے جہان سؤر کو جائز کیا۔ ہیکل سلیمانی یعنی مسجد اقصیٰ کی تعظیم ترک کی وہاں ختنے سے بھی آزاد ہوگئے۔

دنیا کی مختلف اقوام کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو نظر آتا ہے کہ اگلے زمانے کی بہت سی اور قومین بھی بغیر اسکے کہ مذکورہ ختنہ کرنے والی قومون سے متأثر ہوئی ہون ختنہ کرتی تھین۔ قدیم اہل مصر فراعنہ کے دَور مین ختنہ کراتے تھے۔ مصر مین قرناق کی ہیکل خنسو کے کھنڈروں مین ایک دیوار پر تصویر بنی ہے کہ دو لڑکون کا (جو بظاہر اسباب فرعون رامیس دوم کے بیٹے معلوم ہوتے ہین) ختنہ کیا جارہا ہے۔ ان لڑکوں کی عمرین چھ سال اور دس سال کے درمیان ہیں اور ختنہ کرنے والا مقتدائے اعظم ہے۔ وسط امریکہ کی بعض شایستہ و متمدن پرانی قومون بین بھی ختنہ کا رواج تھا۔ دریائے امیزن کے علاقے مین ٹیٹا اور مناؤ قوموں ہیں یہ طریقہ آج بھی مروج ہے۔ اس قدیم دُنیا کے جنوبی جزائر مین بھی بہت سی مختون قومیں آباد ہین۔ آسٹریلیا کے اکثر اقوام بھی ختنہ کراتے ہین۔

پاپوان لوگون نیوکلیڈ دنیا والون اور نیوہبریڈس کے رہنے والون مین بھی ختنہ مروج ہے۔

برِ اعظم افریقہ پر اگرچہ فتوحات عرب کا بے انتہا اثر پڑا مگر وہان بھی بعض ایسی وحشی اور غیر اثر پذیر قومون مین ختنہ کیا جاتا ہے کہ اُسے عربی اثر کا نتیجہ بتانا ذرا دشوار ہے بہاں یہ کافر لوگون مین مروج ہے۔ بچوانا قوم مین یہ حالت ہے کہ مختون لڑکے اپنی صحبت الگ قایم کرتے ہین اور غیر مختونون کو اُس مین شریک نہین ہونے دیتے۔ بعض مورخین سمجھتے ہین۔ کہ ختنہ دراصل قوم عرب کا شعار تھا یہودیون نے اُن سے سیکھا۔ اور بعض سمجھتے ہین کہ یہود سے یہ طریقہ عربون مین آیا۔ غرض یہ بہت پرانا رسم ہے جس کی نسبت یہ پتہ لگانا کہ کس سے نکلا اور کس سے کس مین پہونچا نہایت دشوار بلکہ غیر ممکن ہے۔

یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہے کہ دنیا مین اس عجیب رسم کا رواج کس غرض سے ہوا۔ مصر والون اور نیز شام کے فینقیین مین یہ مشرکانہ مقولہ پھیلا ہوا تھا کہ "را (سورج) دیوتا جب اپنے عضو کے کاٹنے کی خواہش کرتا تو اُس سے خون بہنے لگتا"۔ علیٰ ہذا القیاس یہ دیومالا بھی اس سے تعلق رکھتی ہے کہ "ایل نے اپنے باپ اُرانوس کا یا خود اپنا ختنہ کیا۔ اور خون چشمون اور ندیون مین بہنے لگا"۔ مگر ختنہ کو بت پرستی کے ان افسانون سے متعلق کرنا غلطی ہے۔ یونان کا پرانا مورخ ہیرو ڈوٹوس کہتا ہے کہ "مصر والون مین ختنہ کا رواج صفائی کے خیال سے تھا"۔ یون تو حفظ صحت کے اصول سے بھی ختنہ کو تعلق ہے مگر سچ یہ ہے کہ اس رسم کی بنیاد دنیوی مصالح کے مقابل دینداری پر زیادہ ہے۔ اصل مین یہ ایک قسم کی قربانی تھی۔ جس سے مقصود یہ تھا کہ اپنی خواہشِ نفسانی کا خون کرکے خدا کی حکومت اپنے اوپر تسلیم کی جائے۔ یا ایک حصہ جسم فدیہ مین دے کے باقی جسم کے محفوظ رکھنے کی اُمید رکھی جائے۔

مورخین ان باتون کی چھان بین جا ہے جہاں
مگر اس مین شک نہین کہ مذہبی روایات نے قطعی طور پر
آغاز حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے خدا کے ایک عہد کیط

کی کتاب تخلیق کے ۱۷ باب مین آیات ذیل اِس مضمون کو صاف طور پر بتا رہے ہین
"(۹) پھر خدا نے ابرہام (ابراہیم) سے کہا کہ تو اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں - (۱۰) اور میرا عہد جو میرے اور تمھارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم مین سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے - (۱۲) تمھاری پشت در پشت ہر لڑکے کا جب وہ آٹھ روز کا ہو ختنہ کیا جائے گا - کیا گھر کا پیدا کیا پڑوسی سے خریدا ہوا - (۱۴) اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہی شخص اپنے لوگون مین سے کٹ جائے کہ اُس نے میرا عہد توڑا"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم سے یہ خدا کا ایک عہد تھا جس کی پابندی پوری نسل ابراہیم نے کی اور آج تک ہو رہی ہے - ایک طرف بنی اسرائیل سختی سے پابند تھے حتیٰ کہ خود جناب مسیح کا بھی ختنہ ہوا - اور دوسری طرف بنی اسمٰعیل مین اسکا پورا رواج تھا - جن کی کوشش سے چند ہی روز مین ایسا زمانہ آگیا کہ کوئی خطۂ زمین نہین جہان مختون خدا پرست نہ موجود ہون -

توراۃ سے پتہ چلتا ہے کہ خدا اس رسم کو اپنے پوجنے والون اور اپنے خاص بندون کے لیے نہایت اہم جانتا تھا - چنانچہ حضرت موسیٰ جب بی بی بچون کو لے کے مصر کی طرف واپس چلے تو راستے مین اُنھین خدا ملا - اور چاہا کہ موسیٰ کو ہلاک کر ڈالے (اس کا سبب سباق عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھون نے اپنے بیٹے کا ختنہ نہین کیا تھا) تب آپ کی بی بی سفورہ نے ایک تیز پتھر سے بیٹے کا ختنہ کر کے کٹی ہوئی کھال خدا کے قدموں پر پھینکی اور کہا "تو بیشک تون کے سبب سے میرے سسرے کی جگہ ہوا - تب اُس نے (خدا نے) اُسے (موسیٰ کو) چھوڑ دیا" [ع۵]

ع۵ یہ واقعہ مسلمانون کے عقائد کی رو سے نہایت لغو اور موحدین کی جگہ مشرکین کے مذاق کا
یاہیں اور ختنہ کرے
یہ خرابیان پیدا کردین - عبرانی زبان کے محاورات پر حکومت رکھنے والا
پرانی قومون مین بھی
[illegible] الفاظ کا مفہوم کیا تھا - محاورات کا لفظی ترجمہ ہمیشہ ایسی خرابیان
قومون میں یہ طریقہ آن
"بین یدیہ" کے لفظی معنی ہین اُسکے دونون ہاتھون کے درمیان - مگر اسکے
بہت سی غیر مختون قومیں
اُسکے سامنے - اب فرض کیجیے کہ خدا نے کسی جگہ فرمایا ہو مین یہ

حضرت مسیح کے زمانے زمانے مین پولوس نے مسیحیون کی گنتی بڑھانے کی بے نکان دُھن مین جب ہر قسم کے مشرکانہ رواج کو گوارا کر لیا تو ختنہ کی ضرورت بھی اُٹھا دی۔ جس کے باعث یروشلیم کے اصلی مسیحی اور خاص حضرت مسیح کے صحبت یافتہ لوگ اُسکے دشمن اور خون کے پیاسے ہوگئے۔ لیکن مغرب کی آزاد مسیحیت بڑھتی گئی اور اصلی مسیحیت جو ارض مقدس مین تھی کمزور ہوکے فنا ہوتی رہی۔ یہانتک کہ سچا مسیحی فرقہ جو "ناصری" کہلاتا تھا دُنیا سے ناپید ہوگیا۔ اور حضرت رسول آخرالزمان علیہ السلام کو مبعوث ہوکے پکار دینا پڑا کہ اصلی مسیحیت نہین باقی رہی۔

اب مسیحیت یہود کے ساتھ مختونیت کا بھی استیصال کر رہی تھی۔ اور قریب تھا کہ رومی بت پرستی جو مسیحیت کے جامے مین نمودار تھی اس ابراہیمی عہد کو خدا کے بندون سے تڑوا دے کہ حضرت سرورکائنات کی بعثت سے عرب کا دور شروع ہوا۔ اور بنی اسماعیل جو اب سنتِ ابراہیمی کے سچے حامی تھے توحید کی صدا بلند کرتے ہوے دنیا مین پھیلے۔ اور چندہی روز مین یہ معجزہ دکھا دیا کہ خدا کا یہ عہد صرف ارض فلسطین مین نہین بلکہ ہر جگہ پورا ہو رہا تھا۔

مگر یہود کے اور اسلام کے ختنے مین تھوڑا فرق ہے۔ یہود لازمی طور پر ہر بچے کا ختنہ اُسکی ولادت کے آٹھوین دن کیا کرتے تھے۔ اور مسلمانون مین اسکی پابندی نہیں۔ وہ ولادت سے بلوغ تک جب چاہین ختنہ کرا سکتے ہین۔ بلکہ قدیم زمانے مین عربون کے ختنے کا زیادہ تر رواج بالغ ہونے کے وقت تھا۔

لیکن تعجب یہ ہے کہ بعض قومون مین عورتون کا ختنہ بھی مروج تھا۔ اُنکی شرمگاہ سے گوشت کا کچھ زائد حصہ کاٹ لیا جاتا تھا۔ اور بعض خاص عورتین تھین جن کے ہاتھ سے اس رسم کی تکمیل ہوتی تھی۔ قدیم اسٹرابو کے زمانے مین یعنی اسلام سے بہت پہلے مصر اور عرب کی عورتون مین عموماً ختنہ ہوا کرتا تھا۔ مسٹر لین تصدیق کرتے ہین کہ خلیج فارس کے دونون جانب یعنی بحرین عمان۔ عراق اور فارس مین یہ عموماً

؎ سمجھ والے اُس کا مطلب یہی سمجھین گے کہ میرے سامنے۔ مگر محتاط لفظی ترجمہ کرنے والا کہے گا۔ "میرے دونون ہاتھون کے بیچ مین"۔ ایسی خرابیان توراۃ مین کثرت سے پیدا ہوگئی ہیں۔ اور چونکہ عبرانی زبان مردہ ہوگئی اس لیے اصلی راز کا کھلنا میرے نزدیک امکان سے باہر ہوگیا۔

مروج ہے - افریقہ کے بعض مغربی اضلاع میں بھی عورتیں مختون کی جاتی ہیں - چنانچہ ڈھومی قوم بھی اس کی پوری طرح پابند ہے -

مسلمانون اور عیسائیون مین امتیاز لباس

عام مسلمانون مین یہ بے بنیاد واقعہ کثرت سے مشہور ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ نصارٰی چھوٹے دامنون کے کپڑے پہنین اور گھوڑون کی دُمین کٹوا ڈالین - حالانکہ جہان تک کتب تواریخ کا تتبع کیا جاتا ہے خلافت راشدہ کے پُرامن و عدل عہد مین کسی ایسی تفریق کا ہرگز پتہ نہین لگتا - گھوڑون کی دُمین کاٹنے کا ایک عجیب واقعہ صحابہ ہی کے آخر دور مین ہندوستان کی سرحد پر پیش آیا جسے علامہ بلاذری نے فتوح البلدان مین بیان کیا ہے - یعنی حملہ آور عربون نے حریف کے چند سوارون کے گھوڑون کی دُمین کٹی ہوئی دیکھین - روشن خیالی اور وسیع النظری اُن دنون مسلمانون مین اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس وضع کو عربون نے پسند کیا اور کہا ”ہم لوگ ان لوگون سے زیادہ اس بات کے مستحق ہین کہ اپنے گھوڑون کی دُمین کاٹ دین“ یا تو اُنھین مسلمانون کا یہ مذاق تھا کہ دشمنون اور مخالفون کی ہر اچھی اور مفید بات کے اخذ کرنے کو تیار رہتے - اور یا یہ زمانہ ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ معاشرتی امور پر ”من تشبہ بقوم فھو منھم“ کا اصول پیش کر کے کفر و الحاد کا فتوے دے دیا جاتا ہے.

رہا لباس کا فرق - اس بارے مین قرون اولیٰ کی کوئی ایسی شہادت ہمارے پاس موجود نہین ہے جس سے یہود و نصارٰی اور مسلمانون کے وضع و لباس کی تفریق کے متعلق اسلامی حکومت کا کوئی خاص حکم ثابت کیا جا سکے - ہان مصر کے خلفائے بنی فاطمہ مین سے جنھین اکثر مورخین ”عبیدیین“ کے لفظ سے یاد کر کے بدنام کرتے ہین ”حاکم بامر اللہ“ نے ایک مرتبہ یہ بھی حکم جاری کر دیا تھا کہ حمام کے اندر بھی اور باہر سڑکون پر بھی عیسائیون کا لباس مسلمانون کے لباس سے جدا ہوا کرے - مگر حاکم بامر اللہ کے احکام و افعال کا ذمہ دار نہ اسلام ہے اور نہ مسلمان ہین - وہ ایک مجنون سا خلیفہ تھا اور روز ایک نیا اور انوکھا حکم جاری کیا کرتا تھا - اگر

اُس کی حالت اور اُسکے احکام کو دیکھیے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے۔

۳۹۵ھ مین اُس نے حکم جاری کیا کہ شہر مصر کے گلی کوچون مین اور کل عالیشان مسجدون اور مکانون کے درو دیوار پر صحابہ کرام کے نامون کے ساتھ (معاذ اللہ) گالیان لکھی جائین۔ اسی قدر نہین۔ ساری مملکت اور قلمرو مین یہ حکم جاری کر دیا کہ علانیہ صحابہ کے نامون کی توہین کی جایا کرے۔ اسکے بعد ۳۹۷ھ ہجری مین کچھ ایسی مت پلٹی کہ یکایک فرمان خلافت جاری ہوا کہ جو کوئی صحابہ کرام کے محترم نامون کے ساتھ کوئی سخت لفظ استعمال کرے یا اُنکے نامون کی توہین کرے اُس کا فوراً سر اُڑا دیا جائے اور سخت سزا دی جائے۔ ایک مرتبہ بیٹھے بیٹھے یہ فرمان واجب الاذعان نافذ ہو گیا کہ تمام کُتّے مارڈالے جائین۔ گلی کوچون مین جو کُتا ملا فوراً مارڈالا گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ سارے شہر مین کہین کتون کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ایک بار حکم ہوا کہ کھیرے کی قفلیان ہرگز نہ بکنے پائین۔ پھر یہ فرمان جاری ہوا کہ کشمش ہرگز نہ بکنے پائے۔ جو کوئی کشمش تھوڑی ہو یا بہت ہو بیچتا نظر آئے واجب التعزیر ہے۔ یہ مالیخولیا اس قدر بڑھا کہ پانچ سو دینار صرف کر کے جتنی کشمش ملی خرید کے جلا دی گئی۔ اسکے بعد یہ حکم قضا شیم جاری ہوا کہ انگور ہرگز نہ بکنے پائے۔

انہین احکام کے ذیل مین ایک یہ حکم بھی تھا کہ یہود و نصاریٰ مسلمانون کا سا لباس نہ پہنین۔ نہ حمام کے اندر اور نہ حمام کے باہر سڑکون اور راستون مین۔ پھر اُسکا جوش زیادہ بڑھا تو ایک حمام یہود کے لیے، ایک نصرانیون کے لیے، اور ایک مسلمانون کے لیے الگ الگ تعمیر کرو دیا گیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیون کے ساتھ اُسکا تعصب روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ لباس کی تفریق کے بعد یہ حکم ہوا کہ آراستہ و پیراستہ زین پر یہود و نصاریٰ نہ سوار ہوا کرین۔ اُنکے گھوڑون کی زین لکڑی کی ہوا کرے۔ کسی مسلمان کو وہ خدمتگاری پر نوکر بھی نہ رکھین۔ مسلمان گدھے والے کے گدھے پر کرایہ دے کے سوار بھی نہ ہون۔ جس کشتی کے ملاح مسلمان ہون اُس پر بھی سوار نہ ہون۔

ان احکام سے مین یہ جانتا ہون کہ امتیاز و تفاخر تو بعد کی چیزین ہین شہر کے مسلمانون، گدھے والون، اور کشتیبانون کا نقصان پہلے ہوا ہوگا۔ اسکے بعد ۴۰۰ھ

مین اُس نے حکم دیا کہ بلاد مصر مین عیسائیون کے جتنے کنیسے ہین سب منہدم کرڈالے جائین اور اُن کا مال و اسباب مسلمانون کو دیدیا جائے۔ اور چونکہ بیت المقدس بھی اُس کی قلمرو مین شامل تھا اس لیے حکم دیا کہ وہان کا عظیم الشان کنیسہ القمامہ ڈھا دیا جائے۔ پھر حکم ہوا کہ خبردار کوئی شخص علم نجوم سے تعلق نہ رکھے۔ اور جتنے نجومی ہون سب اُس کی قلمرو سے نکال دیے جائین۔ پھر حکم ہوا کہ جتنے گویے ہین سب خارج البلد کر دیے جائین۔ اسکے بعد مصداق نزلہ برعضو ضعیف می ریزد حکم ہوا کہ خبردار عورتین چاہے دن ہو یا رات اپنے گھرون کی دہلیز سے باہر قدم نہ نکالین۔ اور جس قسم کی جوتیان پہن کے عورتین آمدرفت کیا کرتی تھین اُنکے بنانے کی موچیون کو قطعی ممانعت کر دی گئی۔ عورتین مصر مین اور تمام ممالک اسلامیہ مین ہمیشہ سے باہر آمدورفت کرتی ہین اور اپنے دوستون اور عزیزون کے گھرون مین عموماً پیدل جایا کرتی ہین۔ مگر اس حکم کی بدولت سات برس تک وہ اپنے گھرون مین قید رہین اور کسی عورت کی مجال نہ تھی کہ گھر سے باہر نکلے۔ یہان تک کہ سات برس بعد اُس کے جانشین الظاہر نے اُنھین اُنکی پرانی آزادی دی۔ پھر اسکے بعد یکایک عیسائیون کے حال پر مہربانی ہوئی اور حکم جاری ہوا کہ اُنکے جتنے معبد اور کنیسے کھودے گئے تھے سرکاری روپیہ سے پھر تعمیر کرا دیے جائین۔ اور اُن کا جو مال لوٹا گیا تھا وہ لوگون سے چھین کے پھر اُنکے حوالے کیا جائے۔

غرض یہ تھے وہ احکام جن کے سلسلے مین ایک بار تفریق لباس کا حکم بھی جاری ہوگیا تھا۔ لیکن اس کو اسلام کا کوئی فعل خیال کرنا اگر مسلمانون کی بیوقوفی ہے جو اسے اپنا فخر و ناز سمجھ کے بیان کیا کرتے ہین تو اُن لوگون کی بھی بڑی بیوقوفی ہے جو اس کی بنیاد پر خلافت اسلامیہ کو تعصب کا الزام دیتے ہین۔

الحاکم کی موت کا واقعہ بھی حیرت انگیز ہے۔ اُس کا ایک عمدہ سفید گدھا تھا جس کا نام "قمر" رکھا گیا تھا۔ ۱۷ شوال ۴۱۱ھ ہجری کو دوشنبے کی رات تھی کہ وہ اُس گدھے پر سوار ہو کے سیر کو نکلا۔ اور چونکہ تنہائی پسند کرتا تھا اس لیے ہمراہیون کو ساتھ آنے سے منع کیا۔ مصر کی آبادی کے باہر رات بھر پھرتا رہا صبح کو حلوان کا رُخ کیا جو دارالسلطنت سے ۵ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا شہر تھا جسکی نزہت کا ہین نہایت ہی

دلکش و روح افزا تھین - اسوقت دو سوار ہمراہ رکاب تھے - ایک ایک کرکے اُن دو نون کو بھی رخصت کر دیا اور آگے کی راہ لی - بس اُسوقت سے اُس کا پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا اور کہان گیا - زمین کھا گئی یا آسمان؟ ماہ شوال کی ۳۰ - تک لوگ روز جلوس کا سامان اور سواری کے گھوڑے لے کے شہر کے باہر نکلتے اور شام کو ناکام واپس آتے - آخر ۲ - ذیقعدہ کو اُسکے غلامون اور ترک سپاہیون کا ایک گروہ اُسکی جستجو مین نکلا - جب ڈھونڈھتے ہوے پہاڑون کے درون مین گھُسے تو اُسکی سواری کا گدھا تو ملا - مگر اس حالت مین کہ اُسکے چارون پانؤن تلوار سے کٹے ہوے تھے - مگر زین و چارجامہ بدستور اُس کی پیٹھ پر تھا - اس سے آگے بڑھے تو ایک گدھے کے اور اُسکے آگے پیچھے دو پیدل آدمیون کے نقش قدم نظر آئے - اُنکو دیکھتے ہوے وہ سب ایک تالاب پر پہونچے جو حلوان کے مشرق جانب تھا - تجسس کرنیوالون مین سے دو شخص پانی کے اندر اُترے تو اُس کا پورا شاہی لباس بھی مل گیا جس مین سات جُبے تھے اور پائجامہ بھی اس وضع مین ملا کہ گویا کھول کے اُتارا نہین گیا تھا - مگر چھُریون کی ضرب سے کپڑے کٹے نظر آتے - بہرتقدیر اُسکے کپڑے محل مین لائے گئے - اور سب کو یقین ہوگیا کہ وہ دشمنون کے ہاتھ سے مارڈالا گیا - اور بعض لوگون کا خیال تھا کہ یہ خود اُسکی بہن کی سازش کا نتیجہ تھا - لیکن بہت سے ایسے بے وقوف ایسے بھی پیدا ہوگئے جو حلف اُٹھاتے تھے کہ الحاکم مرا نہین صرف غائب ہوگیا ہے اور اس غیبت کے بعد عنقریب ظاہر ہوگا -

انہار بحر

قدرت نے دنیا مین عجیب و غریب چیزین پیدا کی ہین - موجودہ زمانے کی سائنس کی ترقیان اور بڑے بڑے شاندار تجربات ہر چیز کے وجوہ اور اسباب دریافت کرتے جاتے ہین مگر اب بھی بہت سی چیزین ایسی ہین جن مین عقل انسانی حیران ہے - انھین مین سے ایک انہار بحر ہین جنکے متعلق کوئی قطعی طور پر نہین کہہ سکتا کہ کیون جاری ہین - قرآن مجید مین خداوند جل و علا فرماتا ہے "مرج البحرین یلتقیان بینہما برزخ لا یبغیان" - اس کی پوری اور سچی تفسیر سچ پوچھیے تو ان انہار بحر کا پتہ لگنے سے پہلے

دنیا میں کسی کو نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ لیکن اب موجودہ تحقیقوں اور جستجوؤں کے بعد دیکھتے ہیں کہ سمندر ہی کے اندر کس طرح نہریں جاری ہیں اور کیونکر بغیر کسی حجاب و برزخ کے ایک پانی خاموش و متحرک رہتا ہے اور دوسرا زور و شور سے جاری ہے

انہار بحر سمندر کے دریا ہیں۔ ہمارے بہت سے ناظرین حیران ہونگے کہ سمندر میں دریا کیسے؟ مگر خدا کی قدرت ایسے ہی معجزات دکھاتی رہتی ہے۔ جس طرح خشکی پر ہزارہا ندیاں بہ رہی ہیں بالکل اُسی طرح سمندر میں بھی ہیں۔ اس بارے میں کہ یہ سمندر میں کیونکر جاری ہیں بہت سی رائیں قائم کی گئی ہیں۔ مگر اُن میں سے کوئی توجیہ ایسی نہیں جو دل میں جم کے بیٹھ جائے۔ پہلی وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ آفتاب کی تمازت سے خط استوا اور اُس کے آس پاس کا پانی گرم ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ عام قاعدہ ہے کہ گرم چیز پھیلتی ہے اس لیے یہ گرم پانی بھی پھیلتا، اپنی سطح سے کسی قدر اونچا ہوکے بہتا، اور قطبین کی طرف چلتا ہے۔ جہاں کا پانی ٹھنڈا اور خط استوا کے پانی کی سطح سے کسی قدر نیچا ہے۔ اس طریقے سے پانی کا ایک بہاؤ قائم ہو جاتا ہے اور گرمی کے اُبھارے جو جوف پیدا ہوتا ہے اُس کی جگہ بھرنے کے لیے قطبین کے پاس سے سرد پانی نیچے ہی نیچے بہ کر خط استوا کی طرف آتا رہتا ہے۔ یہی سمندر کی بالائی اور اندرونی نہریں ہیں۔ قطبین کی طرف سے جو نہریں خط استوا کی طرف آتی ہیں وہ اکثر سطح آب کے نیچے ہوتی ہیں اور دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر بعض سطح آب کے اوپر بھی ہوتی ہیں۔ اگر سطح زمین پر ہر جگہ ایک ہموار گہرائی کا سمندر ہوتا تو اُس کے دَور کی وجہ سے سب جگہ کے پانی کی حرارت ایک ہی درجے پر رہتی۔ مگر سمندر کی گہرائی کہیں کم ہے کہیں زیادہ۔ کہیں اُسکی سطح کے اوپر زمین بھی نکل آئی ہے۔ لہذا اس پانی کی رفتار کے خاص خاص راستے مقرر ہو گئے ہیں جو عظیم الشان نہروں کی طرح سمندر ہی میں بہتے بہتے قطبین کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے سطح آب کے اندر ہی اندر خط استوا تک آتے ہیں۔

اس پانی کے دَور کے خاص راستے مقرر ہو جانے کے مختلف وجوہ ہیں ایک تو یہ وجہ پیش کیجاتی ہے کہ جس طرف سطح آب پر ہوا چلتی رہتی ہے اُسی طرف ان نہروں کا بھی رُخ ہو جاتا ہے۔ اور بعض زمانۂ حال کے جغرافیہ دان اسی کو

ان انہار کے جاری ہو جانے کا اصلی سبب بتاتے ہیں۔ اور اصل بھی یہی ہے کہ ہوا سمندر کی سطح پر بہت بڑا اثر کرتی ہے۔ اور بہت سی سمندر کی چھوٹی چھوٹی نہریں محض ہوا کی رفتار سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ بحر ہند میں چونکہ ہوا کا رخ موسم کے ساتھ بدلتا رہتا ہے لہذا جس طرف کی ہوا ہوتی ہے اُسی طرف ان نہروں کا بھی رُخ ہو جاتا ہے لیکن سمندر کی اندرونی یعنی سطح آب کے نیچے کی نہروں کے لیے یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔ سمندروں کے بعض حصوں میں ہوا ہمیشہ شمال و مغرب کی طرف چلا کرتی ہے اور بعض مقامات پر جنوب و مغرب کی طرف۔ بس ان حصوں میں سب سے بڑی بڑی نہریں ہمیشہ مغرب ہی کی جانب بہتی ہیں۔ بعض مقامات پر نہریں مشرق کی جانب بھی جاری ہیں۔ مگر وہاں ہوا کا رخ بھی مشرق ہی کی طرف ہوتا ہے۔

عام قاعدہ ہے کہ زمین کی گردش کی وجہ سے کوئی چیز اگر کرۂ زمین پر حرکت کرتی ہو تو اگر وہ خط استوا سے شمال میں ہو تو داہنی جانب اور اگر جنوب میں ہو تو بائیں جانب کسی قدر ہٹ جائے گی۔ اسی وجہ سے یہ سمندر کی نہریں بھی جو مغرب کی جانب بہتی ہیں کسی قدر اپنے داہنے یا بائیں جانب مُڑ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی زمین کا حصہ ملتا ہے جو روک کے اُن کا رُخ بالکل پلٹ دیتا ہے۔ اور وہ بجائے مغرب کی طرف جانے کے بالکل مشرق کی طرف منہ کر کے بہنے لگتی ہیں۔ بحر اٹلانٹک کی بڑی نہر مغرب کی طرف چلتی ہے۔ یہ اتنی بڑی ہے کہ چوڑائی میں خط استوا کے شمال اور جنوب دونوں جانب ہوتی ہے۔ جو خط استوا کے شمال میں ہے وہ کسی قدر اپنے داہنے جانب ہٹ جاتی ہے۔ اور وہ بھی ساحل امریکہ سے ٹکرا کے اور دوسری طرف سے مُڑ کے مشرق کی طرف واپس ہوتی ہے۔

اگر کرۂ زمین پر تمام سمندر ہی سمندر ہوتا تو غالباً ان سب نہروں کا رخ قریب قریب مغرب ہی کی جانب ہوتا۔ لیکن خشکی کے بڑے بڑے حصے سمندر کی سطح کے اوپر نکلے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے یہ نہریں شمال اور جنوب کی طرف مڑ جاتی ہیں کی طرح سے ایک دَور قائم رہتا ہے تاکہ قطبین کا سرد پانی خط استوا کے قریب آ کر یہاں کے پانی کی حرارت کو کم کرتا رہے اور خط استوا کے پاس کا گرم پانی وہاں جا کے کسی قدر حرارت پیدا کر دے۔

بحر اٹلانٹک کی شمالی نہر جب ساحل امریکہ سے ٹکراکے اور خلیج میکسکو مین سے گھوم کے نکلتی ہے تو انگریزی جغرافیہ دان اسکو گلف اسٹریم یعنی خلیج کی نہر کہتے ہین یہی نہر بہتے بہتے برطانیہ کے جزائر اور شمالی یورپ کے ساحلون سے گذرتی ہوئی بحر منجمد شمالی مین پہونچ کے غائب ہو جاتی ہے۔ ملک ناروے کے بندرگاہ اسی کی وجہ سے سال بھر جہازون کی آمد و رفت کے لیے کھلے رہتے ہین۔ اگر اس کا گرم پانی وہان سے نہ گذرتا تو یقیناً سال کے زیادہ حصے مین وہان برف ہی برف ہوتی۔ کیونکہ بحیرۂ بالٹک کا دہانہ جو اس سے ۲۰۰ سال خط استوا کی طرف ہٹا ہوا ہے سال کے زیادہ حصے مین برف سے بند رہتا ہے اور بحیرۂ اسود جو اس سے بھی زیادہ خط استوا کی طرف ہٹا ہوا ہے وہ بھی جاڑون مین اکثر جم جاتا ہے۔ مگر ناروے کے بندرگاہ ہمیشہ کھلے رہتے ہین اور اُن کا سمندر کبھی نہین جمتا۔

اچھا اب اُس نہر کو دیکھو جو بحر منجمد شمال کی طرف سے بہتی ہوئی ملک لیبرڈر کے ساحل کے پاس سے گذرتی ہے۔ لیبرڈر اور انگلستان قریب قریب ایک ہی خط مین واقع ہوے ہین۔ یعنی خط استوا سے دونون کا فاصلہ قریب قریب برابر ہے اور اس لحاظ سے دونون جگہ سردی اور گرمی برابر ہونی چاہیے تھی۔ مگر انگلستان کے سواحل ہمیشہ برف سے صاف رہتے ہین اور لیبرڈر کے ساحل سال مین ۹ مہینے سے زیادہ برف کی وجہ سے بند رہتے ہین۔

بعض جگہ سمندر مین ٹھنڈی اور گرم نہرین مل جاتی ہین یہان اکثر کہرا پڑا کرتا ہے اور وہان کے پانی مین تلاطم بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔

عام سمندر کے پانی مین اور ان نہرون کے پانی مین اکثر اختلاف بھی ہوتا ہے۔ اگر نہر خط استوا کی طرف سے آتی ہے تو اُس کا پانی سمندر کے پانی سے زیادہ گرم ہوگا اور رنگ مین بھی کسی قدر زیادہ سیاہی مائل ہوگا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جہاز کے ایک طرف تو سمندر کا پانی ہے اور دوسری جانب نہر کا پانی۔ ایک طرف ڈول ڈال کے پانی نکالا جائے تو ٹھنڈا نکلے گا اور دوسری جانب اُس سے زیادہ گرم اور زیادہ سیاہی مائل۔ مگر ایسے مقامات سے جہاز کو بہت جلد نکال لے جاتے ہین کیونکہ جہاز مین غیر معمولی حرکت ہونے لگتی ہے۔

یہ سمندر کی نہریں جن ملکوں میں ہو کے گذرتی ہیں وہاں کی آب وہوا پر بھی بہت بڑا اثر ڈالتی ہیں۔ مثلاً انگلستان کے موسم میں اسی گلف اسٹریم کی بدولت ایک خوشگواری پیدا ہو گئی ہے ورنہ وہاں سردی بہت زیادہ ہوتی۔ تجارت کو بھی ان نہروں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بہت سے مقامات کی بندرگاہیں محض انھیں کے اثر سے جہازوں کی آمد و رفت کے لیے سال بھر کھلی رہتی ہیں ورنہ برف سے بند رہتیں۔ بعض مقامات پر جہاز کو اپنی رفتار میں ان سے مدد ملتی ہے۔ مثلاً جو جہاز افریقہ کے جنوبی راس امید کے پاس سے ہو کر گذرتے ہیں اگر وہ انگلستان سے آسٹریلیا کی طرف جاتے ہوتے تو وہ ساحل سے بہت دور ہٹ کے نکل جاتے ہیں تاکہ ان کو اس نہر میں ہو کے چڑھاؤ نہ کاٹنا پڑے جو وہاں ساحل کے قریب جاری ہے۔ اور جو جہاز انگلستان کی طرف جاتے ہیں وہ ساحل سے قریب قریب جاتے ہیں تاکہ انکو اپنی رفتار میں اس کے بہاؤ سے مدد ملے

یہ نہریں خشکی کی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ بہت لمبی چوڑی ہوتی ہیں۔ گلف اسٹریم کی چوڑائی تقریباً ۴۰ میل ہے اور ۳۰۰۰ فٹ سے زیادہ گہری ہے بعض جگہ اس کی چوڑائی اس سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ پانی کے رنگ میں بھی ایک بہت ہی نمایاں اختلاف ہے کیونکہ اس کا پانی گہرے نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔

جاپان کے قریب سے جو نہر بہتی ہے اُس کا رنگ سیاہ ہے اور اسی وجہ سے وہاں کے لوگ اُسے "کوروسیوا" یعنی کالی ندی کہتے ہیں۔ یہ نہر بھی جاپان کو وہی سب فائدے پہونچاتی ہے جو گلف اسٹریم انگلستان اور ناروے کے موسم اور سواحل کو پہونچاتی ہے۔

غرضکہ تمام دنیا کے سمندروں میں اسی طرح کی ہزاروں نہریں جاری ہیں جو ہمیشہ بہتی رہتی ہیں اور تمام جہان پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا اسٹیمر ٹائٹانک جو سال ڈیڑھ سال قبل تباہ ہو گیا تھا محض انھیں انہار بحر میں سے ایک کی بدولت تباہ ہوا جو برف کا ایک بہت بڑا پہاڑ جو بیس بائیس میل لمبا چوڑا تھا اسکو گلف اسٹریم قطب شمالی سے بہا کر بحر اٹلانٹک میں لے آئی اور جہاز مذکور اُس سے ٹکرا کر تباہ و برباد ہو گیا۔

الغرض یہ سمندر کی نہریں عجائباتِ قدرت میں سے ہیں جن سے دنیا بے انتہا فائدہ اُٹھا رہی ہے۔

کہانت

کہانت کے لُغوی معنی فال گوئی کے ہیں۔ اور اسی لیے اُس شخص کو جو غیب کی باتیں بتائے اور اپنے آپ کو مخفی اسرار سے واقف ظاہر کرے "کاہن" کہتے ہیں۔ اسلام سے پہلے تمام مذاہب کے حالات پر غور کیجیے تو صاف نظر آتا ہے کہ دینی پیشوائی اور مقتدائی کے لیے کہانت لازمی تھی۔

مصریوں کے مقتداؤں نے اپنے آپ کو نامعلوم اسرار و رموز کا خزانہ بنا رکھا تھا قوم تیوں، مگرمچھوں، بیوں، پرواؤں وغیرہ کی پرستش کرتی تھی۔ لیکن الٰہیات کے مسائل رموزِ باطنی کی طرح صرف مقتداؤں تک محدود تھے جو آدابِ مذہبی کی تعلیم کے ساتھ غیب کی باتیں بھی بتا دیا کرتے۔ بابل والوں نے رمل اور نجوم کے فن کو ہندؤوں کی طرح جزوِ دین بنا لیا تھا جس کی مدد سے وہ ہر امر میں آئندہ کی بابت حکم لگایا کرتے۔ اُن کی اسی دینی جستجو نے علم ہیئت کو مدوّن کیا۔ کواکب کے اثرات اور اُنکے افعال و خواص مقرر کیے۔ اجرام فلکی کے نام رکھے۔ انکی حرکتوں کا پتہ لگایا اور باور کرا دیا کہ نجوم کے ذریعے سے جو الٰہیات سے وابستہ تھا انسان غیب کی باتوں کو بتا دیا کرتا ہے۔ ہندوؤں اور بابلیوں کے قدیم مسائل بہت ملتے جلتے ہیں۔ اور نجوم و الٰہیات کے لحاظ سے ضرور ماننا پڑتا ہے کہ یا تو نجوم و ہیئت کو بابلیوں نے ہندوؤں سے لیا یا ہندوؤں نے بابلیوں سے حاصل کیا۔ لیکن چونکہ یہ امر تاریخ کا ایک طے شدہ مسئلہ ہو گیا ہے کہ آریہ لوگوں نے سمٹک لوگوں (بنی سام) کے بعد ترقی کی اس لیے زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ بابل والوں کے علوم ہیئت و نجوم بعد کے زمانے میں پورے پورے ہندوؤں میں منتقل ہو آئے۔ اور اسی وجہ سے دونوں کی کہانت بھی ایک ہی قسم کی ہے۔ ہندو پنڈت پتّرہ دیکھ کے اور زائچہ کھینچ کے جس طرح بعد والی باتیں بیان کیا کرتے ہیں اسی طرح بابل کے پوجاری اور

مرتاض لوگ بھی بتایا کرتے تھے۔ آتش پرستوں میں بھی کہانت تھی۔ اور غالباً اسی قسم کی ہوگی جیسی کہ اہل بابل میں تھی۔ اگرچہ اُن کی کہانت کے زیادہ مشرح حالات ہمیں نہیں معلوم ہو سکے۔

یونانیوں میں بھی کہانت تھی مگر بابل والوں کی کہانت سے بہت ادنی درجے کی۔ اگرچہ انھوں نے بھی ہیأت و نجوم کو حاصل کر لیا تھا مگر جہاں تک پتہ لگایا جاتا ہے یہ فنون اُن کے دین کے اصلی عنصر نہیں بننے پائے تھے۔ اُن کے کاہن بڑے بڑے مندروں کے پوجاری تھے۔ اور اُن کی کاہنہ عورتیں وہ کنواری لڑکیاں تھیں جن کی زندگی بتخانوں اور مندروں کی نذر ہو جاتی۔ اپالو کے مندر میں جو قدیم یونانیوں کا سب سے بڑا مندر تھا لوہے کی ایک تپائی پر یہ لڑکیاں برہنہ کر کے بٹھائی جاتیں اور نیچے کچھ بخور سلگا دیے جاتے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس لڑکی کے دماغ پر کچھ ایسا اثر پڑتا کہ حواس مختل ہونے لگتے۔ اور بیہوشی کے عالم میں وہ بکنا شروع کرتی۔ اُس کے الفاظ پر مجذوبوں کی بڑ کی طرح غور کیا جاتا اُن میں طرح طرح کے معنی پہنائے جاتے۔ اور انھیں سے اپنی آرزوؤں اور مرادوں کے موافق یا مخالف جواب حاصل کر لیا جاتا۔ یہی یونانیوں کی وہ فالیں تھیں جنکا اگلے دنوں بڑا شہرہ تھا۔ اور جنکے سچ ثابت ہونے اور پورے اُترنے پر اکثر قدیم مورخین عقیدتمندانہ حیرت ظاہر کرتے ہیں۔

رومی چونکہ علوم و فنون کی طرح مذہب میں بھی یونانیوں کے پیرو تھے اور اپنے دیوتاؤں کی کہانیوں۔ اُنکے حالات و خیالات اور واقعات کو یونانی دیوتاؤں کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اس لیے اُن کی کہانت بھی یونانیوں کی کہانت سے ملتی ہوئی تھی۔ یہ بات لطف سے خالی نہیں ہے کہ مشرق و مغرب کی کہانت میں ایک نمایاں فرق تھا۔ مشرق میں بابل والوں ایرانیوں اور ہندوؤں سب میں کہانت کا دارومدار ایک باضابطہ فن نجوم پر تھا۔ اور کسی برکت و نعمت کے حاصل کرنے یا کسی مصیبت و آفت کے دور کرنے کی تدبیریں بھی یہ مشرقی لوگ انھیں فنون کے اصول کی پابندی میں کیا کرتے تھے۔ بخلاف اسکے یونانیوں اور رومیوں کی کہانت کو مجذوب پرستی سے زیادہ وقعت نہیں حاصل تھی۔

بنی اسرائیل مین بھی کہانت تھی۔ مگر اُنکی کہانت بالکل جداگانہ تھی۔ اُن مین حضرت ابراہیمؑ اور جناب موسیٰؑ کی تعلیمات نے نبوت کی ایک خاص شان پیدا کردی تھی۔ حضرت موسیٰ کے بعد سے اُن مین نبیون کے پیدا ہونے کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔ جو عابد وزاہد نیک نفس و پاک باطن لوگ ہوتے اور ریاضت داتقا کے ذریعے سے تزکیۂ نفس کیا کرتے۔ ان لوگون کو مراقبے مین مکاشفہ ہوتا۔ اور جو باتین اُن سے پوچھی جاتین اُن کا جواب گویا وہ خدا سے پوچھکے دیا کرتے۔ اور اپنے آپ کو اسرار باطن اور رموز ربانی سے واقف ظاہر کرتے۔ انھین انبیا کا طریقہ اُن کے کاہنون نے بھی اختیار کیا۔ اور جب انبیا نہ ہوتے یا بعد کے ایام مین جب نبیون کے مبعوث ہونے کا سلسلہ موقوف ہوگیا تو ہر جگہ اور ہر زمانے مین اُن کے مرتاض و نفس کش مقتدا آنکھین بند کرکے عالم ملکوت کی سیر کرتے۔ اور قوم کو اُس کے خیالات وعقائد کے مطابق عجیب قسم کے تحکمانہ لہجے اور انوکھے دلچسپ الفاظ مین بتا دیا کرتے کہ اس معاملے مین یہ ہوگا۔ اور یہ بات یون ہونے والی ہے۔

اس قسم کی کہانت دوسری قدیم قومون مین بھی تھی۔ بلکہ یون کہنا چاہیے کہ ساری مشرقی و مغربی قومون مین اسی قسم کے غیب دان اور اسرار باطنی کے جاننے والے کاہن ریاضت و مجاہدۂ نفس کے ذریعے سے پیدا ہوا کرتے تھے۔ ادھر بابلیون اور ہندوؤن مین بھی جہان نجومیون اور اجرام فلکی کے اثر جاننے والے پنڈتون کا زور تھا وہان ایسے مرتاض اور تارک الدنیا اشخاص بھی موجود تھے جن کے لہجے اور طرز گفتگو سے ظاہر ہوتا کہ مبدأ فیاض کی طرف سے غیب کی باتین اور مشکل سے مشکل مسائل کے حل اُن کے دلون پر القا ہوجاتے ہین اور الہام کے ذریعے سے انکو معلوم ہوجایا کرتا ہے کہ آیندہ یہ ہونے والا ہے۔ اور فلان شخص کی قسمت مین یہ لکھا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یونانیون اور رومیون مین بھی مندرون کے معمولی پوجاریون کے علاوہ اس قسم کے رموز باطن جاننے والے راہبون اور عزلت گزینون کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس قسم کی کہانت کا آغاز تاریخی طور پر بنی اسرائیل کے انبیا اور کاہنون ہی سے

شروع ہوا۔ اگرچہ آخر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے صابی لوگوں کی کہانت بنی اسرائیل پر غالب آ گئی تھی۔ اسی کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ سحر بابل کی ساری دنیا میں شہرت ہو گئی اور عیسائی حضرت مسیح کی پیدائش سے پیشتر ہی انکی آمد کا منتظر اور انھیں ایک ستارے کے ذریعے سے پہچان سکے ایمان لانے والا چند بابلی کاہنوں ہی کو بتاتے ہیں جیسا کہ اناجیل میں مذکور ہے۔

یہ کہنا کہ یہ زاہد و مرتاض لوگوں کی کہانت کس قوم سے شروع ہوئی اور کس ملک نے کس سے لیا فضول ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک فطرتی چیز تھی۔ انسان کی فطری کرشمہ پرستی اُسے ہر جگہ پیدا کر لیتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ روح چونکہ لطیف اور مخفی شے ہے اس لیے وہ ہر مخفی راز کا پتہ لگا سکتی اور اسرار سرمدی کے ہر حرم میں پہونچ سکتی ہے بشرطیکہ اُس کا تزکیہ کیا جائے جسمانی کثافتوں سے مبرا کر لی جائے اور اُس میں خلوص پیدا ہو جائے۔ اسکے ساتھ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس جگہ اپنی تدبیروں میں عاجز آتا ہے نامعلوم ذرائع ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اور بڑی بے صبری کے ساتھ چاہتا ہوتا ہے کہ کوئی اس مشکل کا دفیعہ بتا دے۔ لہذا ہر وحشی سے وحشی قوم میں نوع انسانی کے اس فطری تقاضے نے کہانت کو کسی نہ کسی عنوان سے ضرور پیدا کرا دیا۔

عرب کے بت پرستوں سے جاہل کون ہوگا جنکی بت پرستی نہایت ہی مزخرف اور بے اصول طریقے کی تھی۔ مگر اُن میں بھی ہر جگہ کاہن موجود تھے۔ پھر اُس کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں بیرونی مذاہب کا ہجوم روز بروز بڑھتا گیا پارسی بھی تھے، یہودی بھی تھے، عیسائی بھی تھے۔ اور تو اور بابل کے وہ بت پرست جو اپنے آپ کو سب سے بڑا موحد خیال کرتے ساری دنیا میں فنا کر دیے گئے تھے اور عراق میں اُن کا نام و نشان بھی نہیں باقی رہا تھا مگر ارض حجاز میں وہ بھی موجود تھے۔ اور اُن سب کے کاہن عرب میں ہر جگہ موجود تھے اور کہانت کا کام اختیار کرتے ہی وہ مذہب کی طرف سے کچھ ایسے غیر متعصب ہو جاتے کہ سب ہی [illegible] کسی مذہب سے وابستہ ہوں بلا لحاظ مذہب اپنی مشکلیں لے کے اُنکے سامنے آتے اور وہ اُنکو ایسے جواب دیتے کہ اُنکی تسلی

و تشفی ہو جاتی۔ اور اپنے نزدیک کامیاب اور بامراد ہو کے اپنے گھروں کو واپس جاتیں۔ اُن دنوں عرب کی اصلی حکومت اگر سچ پوچھیے تو اُنھیں کاہنوں کے ہاتھ مین تھی۔ جنکے سامنے نہ کسی سردار قبیلہ کی چلتی اور نہ کسی تاجدار و فرمانروا کی۔

جاہلیت عرب کے کاہنوں کے احکام و الفاظ اگر ایک جگہ جمع کر دیے جائین تو ایک عجیب قسم کا پُر لطف لٹریچر بن جائے گا۔ جن کے الفاظ مین غیر معمولی لطافت معنی خیزی۔ فصاحت و بلاغت۔ قافیہ بندی۔ اور پیغمبرانہ حکومت ہوتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ جس شخص کی زبان سے وہ الفاظ سنے جاتے ہین وہ نہین بول رہا ہے بلکہ اُس کے جسم کے اندر سے کوئی فرشتہ باتین کر رہا ہے۔ اس قسم کے صدہا کاہن اور صدہا کاہنہ عورتین ارض عرب کے مشہور مقامات مین پھیلی ہوئی تھین جن کے پاس دور دور سے بڑے بڑے قافلے اپنی آرزوئین اور تمنائین لے کر آیا کرتے اور شاد کام و مطمئن واپس جاتے۔ جس طرح یونانی مندروں کی فالون کی نسبت بتایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ پوری اُترین اُس سے زیادہ حیرت سے ہم دیکھتے ہین کہ عرب کے کاہنوں اور کاہناؤن کے احکام پورے اُترا کرتے تھے۔ اور بعض موقعوں پر تو اُنھوں نے ایسے سچے حکم لگائے اور اس طرح غیب کی باتین بیان کر دین کہ اگر ان واقعات کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو اُن غیب کی باتین بتانے والوں کی غیب دانی کی کوئی توجیہ نہین ہو سکتی۔

اگلی دنیا چونکہ اُن تمام واقعات کو باور کرتی تھی لہذا ادنیٰ و اعلیٰ۔ جاہل و عالم سب نے تسلیم کر لیا کہ انسان کسی ذریعے یا کسی ریاضت سے ایسا کمال حاصل کر لیا کرتا ہے کہ غیب کی باتین بتا دے۔ اور جب یہ مان لیا گیا تو ہر شخص اپنے مذاق و خیالات کے مطابق اس کی توجیہین بھی کرنے لگا۔

چنانچہ یونانیوں اور رومیوں نے باوجود فلسفہ و منطق مین اعلیٰ نمود حاصل کرنے کے اس امر کو قبول کر لیا کہ انسان غیب کی باتین بتا سکتا ہے۔ بعض نے اسکی یہ توجیہ کی کہ نفوس انسانی تصفیۂ باطن کے ذریعے سے اسرار فطرت سے واقف و آگاہ ہو جاتے ہین۔ اور جیسا وہ چاہتے ہین ویسا ہی ہو جایا کرتا ہے۔ اس لیے کہ اُن کے خیال مین تمام اشیا کی صورتین مثل افلاطون کی رو سے عالم کلّی مین موجود تھین

جہان تک بار پانے کے بعد انسان اُن پر تصرف بھی کر سکتا تھا۔ یہ تو اعلیٰ درجے کے نازک خیال علماے روحانی کا خیال تھا۔ مگر بعض نے کہدیا کہ روحین جو جسمون کے قفس سے آزاد ہین اور نیز اجنہ اُن کے بس مین ہوکے اُن کے مؤکل بن جاتے ہین اور وہی اُنھین رموز غیب سے آگاہ کر دیتے ہین۔

عیسائیون نے جو قرون وسطیٰ مین کہانت کے تماشے اور ولایت کے کرشمے سب سے زیادہ دکھایا کرتے تھے اپنے کاہنون کی غیب دانی اور اُنکے تصرفات باطنی کا یہ اصول قرار دیا کہ حضرت مسیح خدا ہونے کی وجہ سے غیب کی باتین جانتے تھے۔ لہذا اُن کا نفس ربانی جس پر اثر کرے وہ بھی اُن رموز باطنی سے واقف ہو جاتا ہے۔ قطع نظر اسکے مسیحیون مین علم کا دیوتا یا خدا روح القدس ہے۔ اور جسے کچھ بھی معلوم ہو یا کسی قسم کا علم حاصل ہو اُس کی نسبت سمجھا جاتا ہے کہ اُسپر روح القدس نے آکے اپنا کمال دکھایا ہے۔ اور اگلے دنون چیذر و زتک نیچے اور خالص العقیدہ مسیحیون پر روح القدس کے آنے کی یہی شان رہی جو شان کسی کے سر پر کسی جن یا پریت کے آنے کی ہوتی ہے۔ اس لیے غیب کی باتین بھی مسیحیون کے خیال کے مطابق روح القدس آکے مقدس لوگون کی زبان سے ظاہر و آشکارا کر دیا کرتا تھا۔

صابئی لوگون مین غیب دانی وکہانت کی یہ تھیوری تھی کہ اَزدیاسیس اور اَوالس اول و دوم جن سے مراد ہرمس اور اغاثیمون ہین اصلی دانایان غیب تھے۔ انکو صابئی لوگ اپنے مذہب کے پیغمبر بتاتے تھے۔ انھین کی توجہ و برکت سے اور لوگ بھی غیب کی باتین جانتے ہین۔ خلاصہ یہ کہ یہی لوگ اُنکے روح القدس تھے جنکا فیض بعد والون کو بھی غیب دان بنا دیا کرتا۔ اس سے اُن کو قطعاً انکار رہا کہ اجنہ یا مؤکل روحین آکے انسان کو غیب کی باتین بتاتی ہین۔ بلکہ اُن کا یہ خیال تھا کہ مذکورہ پیغمبرون کو مجاہدہ و تزکیۂ باطن کے ذریعے سے ایسی صفاے قلب حاصل ہو گئی تھی کہ اسرار غیب سے مطلع ہو گئے تھے۔

کہانت کا سکہ قدیم الایام مین اس قدر بیٹھا ہوا تھا کہ اُس عہد کے فلسفی اور علماے طبیعی بھی کاہنون کی غیب دانی کے قائل تھے۔ اور اس کی توجیہ یہ

یہ کرتے کہ کہانت ایک لطیف جذبۂ نفسانی ہے جو صفائی قلب اور اتقائی قوت اور حس کی لطافت سے انسان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض نے اسے علم نجوم اور آثار فلکی سے وابستہ کرکے کہا جو بچہ ایسے طالع میں پیدا ہو کہ عطارد محل شرف پر ہو۔ اور باقی سیارات سعد بھی اچھے عقدوں میں ہوں اور عمدگی سے ایک دوسرے کی طرف ناظر اور متواضع واقع ہوں وہ لڑکا ان ستاروں کے اثر سے لازمی طور پر کاہن اور غیب داں ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ اسکے طرفدار اور ماننے والے ہمارے روحانیین تھے جن کا بیان تھا کہ نفس ناطقۂ انسانی جب قوی اور زبردست ہوتا ہے تو وہ طبیعت کو مغلوب کرکے دبا دیتا ہے۔ اور انسان پر لطیف راز کو آشکارا کرکے ہر رمز معنوی سے واقف کر دیتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ انسان میں دو چیزیں ہیں روح اور جسم۔ جسم بغیر روح کے کوئی چیز نہیں جب روح نہ ہو تو اس میں نہ قوت ہوتی ہے اور نہ عقل و فہم۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حس حرکت اور ادراک و فہم سب چیزیں روح میں ہیں۔ اور روحوں کی مختلف حالت ہے۔ بعض میں حس زیادہ ہوتی ہے۔ بعض میں دانائی زیادہ ہوتی ہے بعض میں جلاء اور روشن ضمیری بڑھی ہوتی ہے۔ لہذا جس روح میں روشن ضمیری زیادہ ہو اس پر عجیب عجیب انکشافات ہوتے ہیں۔ اور اسرار غیب کو وہ معلوم کر لیتی ہے۔

بہرحال دنیا انھیں اختلافات میں پڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے ساتھ طرح طرح کے خرافات بڑھتے اور پھیلتے چلے جاتے تھے جن کو انسانی عقل کی کمزوری اور بڑھا رہی تھی۔ اور بجائے اسکے کہ تحقیق و تنقید سے کام لے کے کوئی نتیجہ حاصل کیا جائے لوگ اس کی توجیہیں کرتے اور طرح طرح کے معنی پہنا کے کہانت کو اور چمکاتے جاتے تھے۔

یہاں تک کہ دنیا میں نور اسلام چمکا۔ اور خدا نے ہر چیز کو ایک نئی روشنی میں دکھا کے تمام اگلی غلط خیالیوں کو دور کر دیا۔ اسلام نے صاف کہدیا کہ غیب کو سوا خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ اور غیب دانی کے جو کچھ دعوے کیے جاتے ہیں سب لغو۔ مہمل اور بے سروپا ہیں۔ اس طریقے سے اسلام نے اپنے ظہور کے

ساتھ ہی نجوم و کہانت کا چراغ گل کر دیا۔ اور اس قسم کے مدعیان غیب دانی کا زور طلسم توڑ دیا گیا۔ یہ اصلاح سچ یہ ہے کہ اسلام کے اولیات میں سے ہے یعنی ایسے وقت میں جبکہ سارے عالم پر کہانت کی حکومت تھی اور دینی پیشوائی کا لازمی جوہر غیب دانی تھا اور دنیا میں کسی کی نظر اُسکے ابطال کی طرف نہیں گئی تھی۔ یک بہ یک اسلام کی طرف سے اس بات کا ڈھنڈھورا پٹ گیا کہ عالم الغیوب سوا خدا کے کوئی نہیں اور جو کوئی اس کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔

بے شک خود جناب سرور کائنات صلعم نے چند غیب کی باتیں یا بعض پیشین گوئیاں فرمائیں لیکن اُن کی نسبت صاف طور پر بتا دیا گیا کہ خدا نے فرشتے کو بھیج کر اپنے پیغمبر کو اُن سے آگاہ کر دیا۔ دراصل وہ خدا کی غیب دانی کا جلوہ تھا اُسے حضرت رسالت کی غیب دانی ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ اور جب آنحضرتؐ کی وفات کے بعد جبرئیلؑ کے آنے کا سد باب اور سلسلۂ نبوت کا اختتام ہو گیا تو پھر کوئی وجہ ہی نہیں باقی رہی کہ دنیا میں کوئی شخص اسرار غیب سے واقف ہونے اور آیندہ کی باتیں بتانے کا دعوے کر سکے۔

بہرحال اسلام نے نجوم و کہانت کو بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ کے پھینک دیا۔ مگر افسوس چند روز بعد اسلام کے زہاد و عباد نے اسلامی مذاق کے سادے بے ریا اور غیر مضر زہد و تقویٰ کو چھوڑ کے قدیم مذاق کے متصوفانہ زہد و عبادت کو اختیار کر لیا۔ ولی اللہ کا عام لفظ جو ہر دیندار کے لیے تھا عباد و زہاد کے ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اور اُن میں نیک نفسی و اتقا اور اعمال و افعال کے بدلے کرامات اور غیب دانی کے کرشمے ڈھونڈھے جانے لگے۔ اور مجذوبوں کے الفاظ میں معنی پہنائے جانے لگے تو وہی کہانت جس کے استیصال کے لیے اسلام آیا تھا خود اسلام میں پیدا ہو گئی۔ اور جاہل تو جاہل اکثر پڑھے لکھے مسلمان بھی صوفی سالکوں اور مجذوبوں کے پاس اُنھیں مقاصد و اغراض کو دل میں لے کے جانے لگے جن کے واسطے اگلی قومیں اپنے کاہنوں۔ نجومیوں۔ اور بتخانوں کے پوجاریوں کے پاس جایا کرتی تھیں۔

اصل یہ ہے کہ بعد کی آمیزشوں نے نہ اسلام ہی کو وہ اسلام باقی رکھا

جیسے حضرت رسالت (روحی فداہ) لائے تھے۔ اور نہ اُسکے معتقداون ہی کو ویسا رہنے دیا جیسے معتقد اکہ اسلام کے لیے ہونے چاہیے تھے۔ افسوس۔

معراج

مسلمانون مین سرور کائنات صلعم کی معراج کا تسلیم کرنا نہایت ہی اہم عقیدۂ دینیہ مین ہے۔ جس مین آنحضرت صلعم کو خدا کے فرشتے جبرئیل نے مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک کی اور پھر وہان سے آسمانون کی۔ سارے ملاء اعلیٰ کی اور جنت و دوزخ کی سیر کرائی تھی۔ آپ نے جنت کی نعمتین اور دوزخ کے عذاب اپنی آنکھون سے دیکھے تھے۔ اور آسمانون پر انبیاے سلف۔ فرشتون اور حورون سے ملے تھے۔ اس معراج کے مفصل و مشرح حالات احادیث مین موجود ہین۔ صحابہ کے زمانے مین بہت سے مستند و معتبر لوگون کے نزدیک یہ معراج روحانی تھی۔ یعنی آپ کا جسد انور اسی دُنیا مین رہا اور روحِ اطہر ملاء اعلیٰ کی سیر کو گئی تھی۔ مگر بعد کے زمانے مین معراج کے روحانی ہونے کا خیال کم ہوتا گیا اور عام اہل اسلام معراج جسمانی کے قائل و معتقد ہوتے گئے۔ یہان تک کہ آخری صدیون مین یہ حال ہوگیا کہ جو مسلمان معراج کو روحانی بتائے وہ ملحد و بے دین ہے۔ چنانچہ سرسید نے جب بعض اکابر صحابہ کی پیروی مین معراج کے روحانی ہونے کا مسئلہ چھیڑا تو ہر طرف سے اُن کے کافر و بے دین ہونے کی صدائین بلند ہوئین۔ مگر معراج روحانی ہو یا جسمانی اس مین شک نہین کہ اُس نے دنیا مین بڑا کام کیا۔ اور آنحضرتؐ کے ذریعے سے گویا سارے مسلمانون کو عالم بالا اور واقعات مابعد الموت کا مشاہدہ ہوگیا۔

ہم اس موقع پر معراج کی تفصیل اور اُس کی شرعی حیثیت سے بحث کرنا نہین چاہتے۔ ہمین اس وقت اس بات پر غور کرنا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے معراج کا خیال کسی اور قوم مین بھی تھا یا نہین۔ یا آنحضرت صلعم کے بعد کون لوگ معراج کے مدعی ہوے ہین۔ اسلام کی زیادہ باتین اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے ملتی جلتی ہین۔ جسکی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کسی نئے دین کے لانے کے مدعی

نہ تھے۔ بلکہ آپ کا دعوے یہ تھا کہ دین حق جس کی تبلیغ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دیگر پیمبران سلف کرتے آئے تھے وہی دین اسلام ہے۔ اصل دین میں کسی قسم کی ترمیم نہین کی گئی بلکہ بعد والون نے دین مین جو رد و بدل کر دیا تھا اور جو بدعات بعد کو رواج پا گئے تھے اُن کا استیصال کیا گیا۔ الغرض اس مین شک نہین کہ شریعت اسرائیلی کی زیادہ باتین اسلام مین موجود ہین۔ مگر توراۃ و انجیل مین جہان تک ہمارا خیال ہے اور کسی پیغمبر کو معراج ہونے کا ذکر نہین ہے۔

دیگر مذاہب سلف کی کتابون مین بھی اس قسم کی کسی آسمانی سیر کا تذکرہ نہین۔ روم و یونان کے بت پرستون کو سچ یہ ہے کہ معراج کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لیے کہ اُن کے عہد اولین کے دیوتا (وہ انسان جو دیوتا بنا دیے گئے) ایسی زبردست روحانی قوت رکھتے تھے کہ جب جی چاہتا بام فلک پر چڑھ جاتے اور سرد شتان والون سے مل آتے۔ مصر اور بابل و اسیریا والون مین ہمین اس قسم کی کوئی معراج نہین ملتی۔ ممکن ہے کہ اُن مین کسی کو معراج ہوئی ہو مگر افسوس کہ ہم کو اُنکے مذہب و عقائد اور اُن کی قومی روایات کا بہت ہی محدود حصہ معلوم ہے۔ لیکن اس مین شک نہین کہ معراج کا خیال پہلے پہل اسی سرزمین مین سنا گیا۔

زرتشت کی نسبت اکثر کہا جاتا ہے کہ اُسے معراج ہوئی تھی۔ مگر معراج زرتشت کا واقعہ اس قدر مختصر بتایا گیا ہے کہ اُسکی تفصیل کے متعلق کوئی راے نہین قائم کی جا سکتی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے مین آتش پرستون کے مذہب مین اس خیال کو بہت اہمیت دی گئی۔ یہان تک کہ سکندر کے بعد مملکت عجم مین جو طوائف الملوکی قائم ہو گئی تھی اُسے جب اردشیر بابکان نے دفع کر کے سارے ملک کو اپنے زیر نگین کیا اور اصلی مذہب زرتشتی کا پتہ لگانا چاہا تو اُسے بھی معراج ہی کی نردبان لگا کے عالم بالا کے حالات معلوم کرنا پڑے۔

طوائف الملوکی کے زمانے مین دین زرتشتی غارت ہو گیا تھا۔ سلطنت کے ساتھ مذہبی اتحاد بھی مٹ گیا تھا۔ ہر شہر اور ہر گروہ کا نیا مذہب تھا۔ اور سب اپنے عقائد کو زرتشت کا اصلی مذہب خیال کرتے تھے۔ چونکہ مباحثہ اور استدلال

کے ذریعے سے سب میں اتحاد پیدا کرنا دشوار تھا اس لیے اردشیر بابکان نے یہ نیا طریقہ ایجاد کیا کہ اپنی ساری قلمرو کے شہروں اور اضلاع میں حکم جاری کیا کہ ہر ضلع اپنے کسی ایسے شخص کو منتخب کر کے اُس کے دربار میں بھیجے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہو۔ اس طریقے سے ملک کے ایک سو منتخب اور مسلّم الثبوت عابد و زاہد اُس کے دربار میں جمع ہوئے۔ تب اُس نے کہا کہ تم سب اپنے میں سے ایسے دس آدمی منتخب کر دو جن کو اپنے گروہ میں سب سے زیادہ پاک اور عبادت گزار جانتے ہو۔ اور جب یوں دس عابد چن لیے گئے تو اُن دسوں سے کہا کہ اب تم اپنے میں سے کسی شخص کو چُنو جو سب سے اعلیٰ و افضل اور سب سے بڑا خداشناس و خداپرست ہو۔ اس طریقے سے ایک ایسا شخص منتخب ہو گیا جو اردشیر بابکان کے خیال کی ساری دنیا سے زیادہ افضل اور زہد و تقویٰ میں بے مثل و بے نظیر تھا۔ اس شخص کا نام ویراف تھا۔

اس انتخاب کے بعد اردشیر نے ویراف سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اُس دوسرے عالم میں بھیج کے وہاں کے سچے حالات اور سچا دینِ الٰہی معلوم کروں۔" ویراف نے طالبِ حق بادشاہ کی خواہش قبول کی۔ اور اُس کے روحانی سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایک بڑے حلقے میں آگ روشن کی گئی۔ اُس کے درمیان میں ایک تختہ بچھایا گیا۔ اور اُس تختے پہ ویراف بھنگ یا اور نشّی دوا کھلا کے لٹا دیا گیا اور وہ سوؤں عابد جو سارے ملک سے منتخب ہو کے آئے تھے اور نیز ویراف کی پارسا بہنیں گرد بیٹھ کے خدا سے دعا کرنے لگیں کہ ویراف کے ذریعے سے دنیا کو عالمِ آخرت اور سروشستان کا حال معلوم ہو جائے۔ یہ سب لوگ تین شبانہ روز تک یونہیں دعا و عبادت میں مشغول رہے۔ اور ویراف آگ کے درمیان میں غافل و مدہوش پڑا رہا۔ آخر تیسرے چوتھے دن اُس نے بیدار ہو کے سر اُٹھایا۔ سب نے دوڑ کے اُسے آگ کے حلقے سے باہر نکالا اور بے صبری کے ساتھ پوچھنے لگے کہ آپ نے کیا دیکھا؟" اُس نے کہا کہ "پہلے مجھے کھانا کھلا دو پھر بیان کروں گا۔ اس لیے کہ بھوک کی شدت سے میں بے دم ہو رہا ہوں۔ فوراً کھانا سامنے لا کے رکھ دیا گیا۔ اور جب وہ کھا پی کے بیٹھا اور اُسکے حواس ذرا

ٹھکانے ہوے تو اردشیر کی طرف مخاطب ہو کے کہنے لگا "اے بادشاہ میری آنکھ بند ہوتے ہی عالم بالا کا ایک سروش (فرشتہ) آیا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے اوپر لے گیا۔ جہان اُس نے دوزخ و جنت کی سیر کرائی۔ اور دکھایا کہ نیکو کارون کو اعمال نیک کے ثواب مین کس طرح اور کیسی کیسی نعمتین اور لذتین حاصل ہو رہی ہین اور بدکارون کو بدکاری کی پاداش مین کس کس طرح اور کیسی کیسی سخت ایذائین اور تکلیفین پہونچ رہی ہین۔ اسی سلسلے مین اُس نے مذہب زرتشتی کی صحت اور اُس کے باعث نجات اخروی ہونے کے ثبوت دیے ہین۔ ساری نیکیون کے ثواب اور جزا کی صورتین اور اُسکے مقابل ساری بدکاریون کی سزائین بتائی ہین۔ الغرض مذہب زرتشتی کی تمام چیزین جو عالم آخرت سے تعلق رکھتی ہین سب بہ تفصیل ظاہر کر دی ہین۔

ویراف کا یہ روحانی سفر نامہ بڑی تفصیل کے ساتھ پہلوی زبان کی ایک کتاب مین درج ہے جو "ویراف نامہ" کہلاتی ہے وہ اصلی پہلوی خط مین مع انگریزی کے ساتھ لنڈن مین چھپی ہے۔ اور پارسیون مین بہت مقبول ہے۔ یہ کتاب اگر صحیح روایات سے اور سند کے ساتھ اسلام سے پیشتر کی ثابت ہو جائے تو اس بات کے کہنے کی گنجایش ہے کہ اسلام مین حضرت سرور کائنات صلعم کی معراج اسی ویراف نامے سے ماخوذ یا آپ کی سیر عالم بالا ویراف کے سفر افلاک کی نقل ہے۔ لیکن ویراف نامہ ایک ایسی کتاب ہے جو آج سے چھ سات صدیون پیشتر بالکل مجہول اور نامعلوم تھی۔ پہلے پہل اُس کا ایک نسخہ ہندوستان کے شہر نوساری مین جسے پارسیون نے اپنا مرکز قرار دے لیا تھا کسی پارسی موبد کے پاس ملا۔ اُس سے پیشتر نہ کسی کو اس کا نام معلوم تھا اور نہ کبھی قدیم الایام مین کسی کی زبان سے اسکا تذکرہ سُنا گیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ان کی کتاب دساتیر کو بعد والے پارسیون نے تصنیف کر کے اپنی پُرانی آسمانی کتاب بتا دیا اُسی طرح اس کتاب کو بھی کسی شخص نے تصنیف کر لیا۔ لہذا بجاے اسکے کہ آنحضرت کی معراج اُس سے ماخوذ ہو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہمارے پیغمبر عربی کی معراج سے حاصل کی گئی ہے۔

لیکن بڑے لطف کی یہ بات ہے کہ تیرہوین صدی عیسوی یعنی ساتوین یا آٹھوین

صدی ہجری میں اٹالیہ کے ایک رومی شاعر ڈینٹ نے الیگری میں اپنی معراج کا واقعہ منظوم کیا ہے جس میں معراج سرورِ کائنات سے فائدہ اُٹھا کے شاعرانہ طبع آزمائی کی اور خیال آرائی کی گئی ہے - اور اُس سے دینِ مسیحی کو فائدہ پہونچایا گیا ہے - یورپ میں اس نظم کی بہت تعریف کی جاتی ہے - اور اُسے لوگ اعلیٰ ترین طباعی و خیال فریبی کا نمونہ بتاتے ہیں -

اس نظم میں ڈینٹ کہتا ہے کہ انسانی دانائی (ورجل شاعر) کی صورت میں آ کے میری رہبر ہوئی - جسے آسمانی دانائی (بیٹرس دیوی) نے میری مدد پر آمادہ کیا در نور بخشنے والی حور (لوشیا) کے ذریعے سے ورجل کے پاس یہ حکم بھیجا - اور لوشیا کو (رحمتِ الٰہی) نام ایک دیوی نے بیٹرس کے پاس اسی غرض کے لیے بھیجا تھا -

الغرض ڈینٹ کو ایک روحانی خواب میں ورجل اس عالم سے باہر نکال لے گیا - بہت دور تک ادھر اُدھر پھرنے کے بعد وہ ایک تیرہ و تار جنگل میں جا پھنسا جہاں کی ہر چیز سے وحشت ہوتی تھی اور مہیب درندوں اور وحشی جانوروں کو دیکھ دیکھ کے وہ ... رہا تھا - اب اُسے دوزخ کی حالت دکھائی گئی جسے اُس نے اپنے خیال میں دامن کوہ صیہون میں ایک بڑے بھاری غار کی صورت میں دیکھا - اسکے کنارے چکنے اور آسانی سے گذرنے کے قابل نہیں ہیں بلکہ چاروں طرف زینوں کے حلقے پھیلتے چلے گئے ہیں جو جس قدر نیچے ہوتے جاتے ہیں اُسی قدر تنگ بھی ہوتے جاتے ہیں - زینوں کا ہر حلقہ اس قدر وسیع اور دوسرے سے الگ ہے کہ بجائے خود ایک طبقۂ جہنم ہے - اور انھیں اسباب سے اس غار میں اُترنا یا اُس سے نکلنا بغیر اسکے کہ تائیدِ ایزدی رفیقِ حال ہو غیر ممکن ہے -

پہلا حلقہ "لمبو" کہلاتا ہے - اس میں وہ تمام لوگ ہیں جنکو بپتسمہ نہیں نصیب ہوا اور جو حضرت مسیح سے پیشتر تھے - باقی تمام حلقے گنہگاروں کے عذابوں کے نمونے پیش کر رہے ہیں - جس گنہگار کا جتنا بڑا گناہ ہے وہ اُتنے ہی زیادہ گہراؤ اور زینے کے نشیبی حلقے میں ہے - اور جس قدر زینے تنگ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں اُسی قدر عذاب بڑھتا جاتا ہے - ان مبتلائے عذاب گنہگاروں میں ڈینٹ نے بہت سے

پُرانے تاریخی مجرموں کو دیکھا جو طرح طرح کے عذاب بھگتتے نظر آئے۔

اس دوزخ میں اُس نے خون کی ندیان دیکھیں۔ خوفناک عفونتوں کو برداشت کیا۔ قیر کی ایک جھیل دیکھی۔ مبتلاے عذاب روحوں کے غول دیکھے جن میں سے بعض ہوا مین معلق ہیں۔ بعض برف مین دفن ہین۔ بعض درختون مین مقید ہین۔ ناامیدی کی آہین۔ اور درد و تکلیف کی چیخین کانون مین گونج رہی ہین۔ بہت سے مجرم مختصر الفاظ مین اپنی دہشت ناک سزائین اور اپنے گناہون کی سرگذشتین بیان کر رہے ہین۔ اور عجیب عجیب قسم کی حسرتناک داستانین اور خدا کی عظمت و کبریائی کی باتین سُننے مین آ رہی ہیں۔

اس غار کے انتہائی نشیب مین شیطان ہے۔ جو ایک خونخوار موذی ہے اُسکے تین سر ہین۔ اور ہر منہ سے کسی گنہگار آدمی کی ہڈیان چبا رہا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ یہودا اسخریوطی (وہ حواری جس نے دغابازی کرکے حضرت مسیح کو دشمنون کے ہاتھ مین گرفتار کرا دیا تھا) اُنھیں دوزخیون مین ہے جنھیں شیطان چبا رہا ہے۔ مگر اس پر البتہ تعجب ہوتا ہے کہ رومی بروطوس اور قاسیوس (قاتلین جولیس قیصر) بھی اُسے اُنھین لوگون مین نظر آئے۔

اب ڈینٹ اور ورجل دونون شیطان کے جسم پر چڑھ گئے اور بڑھتے چڑھتے کوہ صیہون کے دوسرے پہلو پر جا اُترے جہان کوہ مذکور ایک مخروطی شکل مین نمایان ہے۔ جنوبی سمندر کے ایک جزیرے مین قائم ہے اور عالم برزخ کا پہاڑ کہلاتا ہے۔ اس پہاڑ کے گرداگرد نیچے سے اوپر تک زینے بنتے چلے گئے ہین جو مندرجۂ ذیل سات فانی گناہون کے مجرمون کی جاے قرار ہین۔ غرور۔ حسد۔ غصہ۔ کاہلی حرص۔ جوع البقر اور شہوت۔

اس پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ کے شاعر سے بیٹرس دیوی سے ملاقات ہوئی جو اُسے اپنے ساتھ لے کے آسمان پر چڑھ گئی۔ اور یکے بعد دیگرے اُسے چاند اور دیگر سیّارون مریخ۔ زہرہ۔ آفتاب۔ مشتری۔ عطارد اور زحل سے ملایا۔ یہان سے چڑھ کے وہ بیٹرس کے ہمراہ اُس عالم بالا مین پہونچا جو ثوابت کا مرکز ہے۔ اور آخر کار اصلی فردوس برین مین پہونچ گیا۔ جہان اُسے عیسیٰ مسیح اور مریم عذراء کے

جلوے نظر آئے اور آخر ایک جھلک دیدار الٰہی کی بھی نصیب ہوگئی۔
اسی دیدار الٰہی پر ڈینٹ کی معراج اور اسکے ساتھ اُس کی مثنوی ختم ہوگئی ہے۔ لیکن اس روحانی سیر کے سلسلے مین اُس نے جیسے تاریخی واقعات پیش کرکے اپنی تاریخ دانی کا اعلیٰ ثبوت دیا ہے اور اُنکے اظہار مین جیسی کامل درجے کی قادر الکلامی ظاہر کی ہے اہل یورپ کی نظر مین بہت ہی قابل تعریف ہے۔ اگرچہ اُسکی شاعری کی ہم بھی تعریف کرین گے مگر یہ کہے بغیر نہین رہ سکتے کہ مضمون سرقہ کا ہے۔ اور سوا اسکے کہ اُسے مسیحی خیالات کا جامہ پہنا دیا گیا ہو اُس مین کوئی جدت نہین ہے۔ اُس سے بہت زیادہ جدت آفرینی ملٹن نے اپنی پیراڈائز لاسٹ (فردوس گم شدہ) مین کی ہے۔ اگرچہ وہ بھی ایک مذہبی نظم ہے اور حضرت آدمؑ و حوا کے جنت سے نکالے جانے کے واقعے سے ماخوذ ہے لیکن اس مین شاعری نے اپنے عقائد کی نگہداشت کے ساتھ بہت ہی انوکھی اور پُر لطف باتین پیدا کی ہین۔

توحید

اس موقع پر نہ ہم نے اپنے کرم فرما مولانا حسن نظامی کے اخبار توحید پر ریویو لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا ہے اور نہ وحدت باری تعالیٰ کی تعلیم و تلقین کے لیے۔ بلکہ ہم اس وقت مسئلۂ توحید کی تاریخ کے متعلق اپنے چند خیالات ظاہر کرنا چاہتے ہین۔
خدا کے ایک جاننے اور ایک ہی خدا ماننے کو توحید کہتے ہین۔ ظاہر مین دیکھیے تو کس قدر سادی اور کتنی سیدھی بات ہے کہ ہمارا اور سارے عالم کا پیدا کرنے والا ایک ہی خدا ہے۔ اُس کا کوئی شریک و ہمتا نہین۔ کل موجودات اُسی کے بنائے ہوے اور اُسی کے تابع فرمان ہین۔ مگر پھر بھی اس سیدھے سادے مسئلے مین انسانی جہالت نے (جسے وہ حماقت سے عقل آرائی خیال کرتا ہے) ایسے اُلجھاؤ ڈال دیے ہین کہ اگر مذاہب اور مقتدایان مذاہب کے دعوؤن کو دیکھیے تو ایک بھی موحد نہین نظر آتا۔
اس مین شک نہین کہ توحید کوئی ایسی اچھی چیز ہے کہ جی سب کا یہی چاہتا ہے کہ ہم موحّد ہون اور ہمارا خدا ایک ہو۔ فطرت انسانی کی کمزوریون نے سیکڑون

ہزارون باطنی قوٰی اور روحانی پہلوان تسلیم کرلیے - انسان جس سے مغلوب ہوا- جس سے دبا- جس سے ڈرا- یا جس کا معترف ہوا اُس کے آگے سر جھکا کے کھڑا ہو گیا- اُس نے سنسان بیابانون - خاموش جنگلون - سراپا عظمت پہاڑون - خوفناک گھاٹیون - ناپیدا کنار سمندرون اور ہمیشہ بہنے والی ندیون مین مرعوبیت کی آنکھون سے دیو اور دیوتا دیکھے - پریان اور دیویان دیکھین - جسمانی عالم مین اپنے خیال کی مدد سے اُن کے تشخصات پیدا کرلیے - اور اُنکے آگے سجدے کرنے لگا - یہ سب ہے لیکن زبان سے یہی کہے جاتا ہے کہ "ہم موحّد ہین" اور "ہمارا خالق ایک ہی ہے"۔

باوجودان مشرکانہ حرکات کے وہ مانتا ہے کہ خدا کو ایسا ہونا چاہیے کہ کوئی چیز اور کوئی طاقت اُس کی حکومت و قوت سے باہر نہ ہو- کوئی طاقت اُس کی مزاحم نہ ہو سکے - اور جب ایسا خدا ہوگا تو لازم ہے کہ کوئی دوسرا خدا نہ ہو- کیونکہ دوسرا ہوا تو اگر وہ پہلے کی قدرت و حکومت سے باہر ہوا تو پہلے خدا کی خدائی مین فرق آجائے گا اور وہ پورا خدا ہی نہ باقی رہے گا - اور اگر وہ پہلے خدا کا تابع فرمان اور مخلوق ہوگا تو وہ دوسرا خدا خدا نہ باقی رہے گا - کہنے کو تو کہہ دیا جا سکتا ہے کہ دونون کی قلمرو جدا ہوگی - انکے حدود و اختیارات مقرر و معیّن ہون گے - اور اپنی اپنی قلمرو پر دونون پوری قوت کے ساتھ قابض و متصرف ہون گے - لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ اس طرح دونون خدا خدا باقی نہ رہین گے - اس لیے کہ پہلے خدا کی حکومت سے دوسرے کی قلمرو باہر ہوگی - اور دوسرے کی حکومت سے پہلے کی قلمرو - اور جسکی حکومت سے کوئی چیز باہر ہو وہ خدا نہین-

اسی ضرورت اور اسی شبہے کی وجہ سے دنیا مین شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص ملے گا جو دو خداؤن کو اپنی زبان سے تسلیم کرتا ہو - ایسے لوگ مل جائینگے جو خدا کے منکر ہون اور بخت و اتفاق کو اپنا خالق بنا کے کسی قادر و توانا خدا کے ماننے ہی سے انکار کر دین - لیکن ایسے لوگ چراغ لے کے ڈھونڈھیے تو بھی نہ ملین گے جو دو برابر کے خدا مانتے ہون - یا توحید کے ماننے مین تردد اور پس و پیش کرتے ہون- تاریخ پر نظر ڈالیے تو ہر قوم اپنے آغاز مین بت پرست نظر آئے گی - لیکن اُن

دنون کے حالات اس قدر کم معلوم ہین کہ ہم ہر پُرانی قوم کے اصلی عقائد سے واقف نہین - اس بات کو ہم مانتے ہین کہ انسان نے جب حیوانیت چھوڑ کے انسانیت کا جامہ پہنا تو اپنی عقل کی کمزوری سے ہر اُس چیز کو جو مہیب یا باعظمت نظر آئی اس کے آگے سر جھکانے اور اُس کی پرستش کرنے کو تیار ہو گیا - لیکن اُسکی اس ضعیف الاعتقادی سے ہم یہ نتیجہ نہین نکال سکتے کہ کبھی وہ ایک سے زیادہ خداؤن کا بھی قائل تھا -

اگلی دنیا کے بعض بادشاہون نے بھی خدا بننے کی کوشش کی - جیسا کہ نمرود و فرعون کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے - لیکن سچ یہ ہے کہ وہ پولیٹیکل خدا تھے - دل مین اپنی مجبوریون اور کمزوریون کے معترف تھے مگر اپنی رعایا کے مطیع فرمان رکھنے کے لیے چاہتے تھے کہ مذہبی نہین بلکہ ہم اپنی قوم کے معبود بن جائین - تاریخ ہی بتا رہی ہے کہ ایسے دنیوی خدا جہان خدائی کا دعویٰ کرتے تھے وہان بتخانون مین جاکے بتون کی پرستش بھی کیا کرتے تھے

"تاریخ کی جستجو مین اگر قرائن سے مدد لی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے پہلے اُن چیزون کی پرستش کی جن سے خائف و مرعوب ہوا - پھر اُن لوگون کی جو قوت مین سب سے غالب تھے - اور اسی سلسلے مین اپنے بزرگون مورثون اور معزز نامور لوگون کو پوجنے لگا - لہذا جیسے معبود وہ بزرگ اور نامور لوگ تھے ویسے ہی معبود بادشاہ بھی بن جایا کرتے تھے - مگر اس معبودیت کے ساتھ قومی دیوتاؤن کے آگے بادشاہ اور رعایا - راجہ اور پرجا سب سجدے کیا کرتے تھے -

یہود کی تاریخ بہت پُرانی ہے - اُن کی تاریخ سے بابل و نینوا اور مصریون کی تاریخون پر بھی روشنی پڑتی ہے - وہ اپنے آپ کو موحد اور باقی تمام اقوام عالم کو بت پرست بتاتے ہین - مصر مین بڑے بڑے دیوتا تھے - بابل مین ہر جگہ بت تھے - یہود کے قریب ہی فنیقیون اور کنعانیون مین دیوتاؤن کی پرستش ہوتی تھی - اور اسرائیلی اُن سب کو بت پرست اور اپنے آپ کو موحد و حق پرست بتاتے تھے - لیکن جس طرح اُن قومون کی بت پرستی کے پردے مین توحید تھی ویسے اسرائیلیون کی توحید بھی ہمین مغشوش نظر آتی ہے - اس لیے کہ اسرائیلیون کا خدا "یہوا" اُنکے بیان سے خدا نہین بلکہ اُن کا قومی دیوتا

نظر آتا ہے - جو اور قومون کا نہین صرف اُن کا خدا تھا - جو اورون کے خداؤن پر غالب
تھا - اور اُن سے وعدہ کرتا تھا کہ مین تمھین سب قومون پر غالب اور سب سے
برگزیدہ بنا دون گا -

اس کے بعد یونانیون اور رومیون کا زمانہ ہے - یونانی بھی توحید کے قائل تھے
اگرچہ اُن کا خدا صرف علت تخلیق تھا اور جملہ صفات سے معرّا تھا - اور رومیون کا
خدا بھی ایسا ہی تھا - دونون کے نزدیک عالم تخلیق مین دیوتاؤن اور دیویون کی
حکومت تھی - نامور انسان - زبردست سپاہی اور بلند حوصلہ بادشاہ بھی دیوتا بن
جاتے اور اپنے روحانی اقتدارات سے دنیا پر اپنے اپنے علاقون مین حکومت کرتے
اور دنیا والون کو مدد دیتے -

مسیحیت نے دنیا مین آکے ابتدائی بڑے زور و شور سے توحید کا نعرہ بلند کیا اور
تمام مروج و معاصر مذہبون کو شرک بتایا - مگر سچ یہ ہے کہ یونانی ہون یا رومی اُنکے
افعال مشرکانہ تھے عقیدہ مشرکانہ نہ تھا - اس لیے کہ وحدت باری تعالی مین اُنھین
ہرگز شک نہ تھا -

سب سے بڑا الزام شرک کا مجوس کو دیا گیا جن کا مذہب ہزار سال سے فارس
اور خراسان وغیرہ مین جاری تھا - لیکن اس الزام دینے مین زیادہ دخل مسیحیون
کی تحقیق کو نہین بلکہ تعصب کو تھا - مسلمانون مین بھی آتش پرستی کو "ثنوی المذہب"
یا دو خداؤن کا ماننے والا مذہب کہا جاتا ہے - خود زرتشتی اپنے آپ کو اس الزام
سے بری بتاتے ہین - اور اگر غور سے دیکھیے تو جیسا الزام اُن کو دیا گیا ہے حقیقت مین
وہ ویسے ملزم نہین ہین - اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ دنیا مین نیکی و بدی
دو متضاد چیزین ہین جن کو اُنھون نے نور و ظلمت سے تعبیر کیا - خداے تعالی چونکہ
صرف صفات حسنہ سے متصف ہے اس لیے نور کو اُنھون نے اُس کا جلوہ بتایا -
اور شیطان چونکہ ضلالت و بدی کا مجموعہ ہے - لہذا اُس کا مظہر ظلمت کو قرار دیا - یہ وہ
مانتے ہین کہ خدا سب پر غالب ہے اور شیطان و ظلمت پر بھی وہ غالب آئے گا -
فی الحال خدا کی مرضی کے خلاف ظلمت موجود ہے اور شیطان لوگون کو گمراہ کرتا
رہتا ہے - ایسا نہین ہے کہ شیطان و ظلمت اُس کی حکومت و قدرت سے باہر ہون

نگر ہاں نا فرمان اور اُسکے حکم سے باہر ضرور ہیں۔ ایک دن آنے والا ہے جب شیطان پکڑ کے مارا جائے گا اور ظلمت دُور ہوگی۔ اگر غور سے دیکھیے تو اس مسئلے میں حقیت کا دعوا کرنے والے دیگر مذاہب سے وہ اچھے ہی ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ اُنکو الزام دے کے دو خداؤں کا ماننے والا اور مشرک بتا دیا گیا۔

فرق اتنا ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں شیطان کی تخلیق کا ایک واقعہ بیان کر دیا گیا ہے اور زرتشتیوں میں کوئی ایسا قصہ نہیں جس سے پتہ چلتا ہو کہ اہرمن (اُن کے شیطان) کو یزدان (اُن کے خدا) نے پیدا کیا تھا۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے آہرمن اسی شان سے چلا آتا ہے ہاں آخر میں البتہ مفتوح ہو کے مارا جائے گا۔ لیکن جب وہ اُسے فانی مان رہے ہیں تو اُسکے آغاز کا پتہ نہ لگنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُنکے نزدیک وہ ازلی و ابدی خدائے شر ہو۔

اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدائے مسیحیت کی توحید غیر مغشوش اور مکمل تھی۔ لیکن چند ہی روز میں نظر آگیا کہ بعوض اسکے کہ وہ اپنی توحید کا اثر دوسروں پر ڈالے خود ہی دوسروں کے شرک سے متاثر ہو کے مغشوش ہوگئی۔ ایک ہی صدی گذری تھی کہ اُس کی توحید میں تثلیث کا جوڑ لگ گیا۔ اور زرتشتیوں کو یہ کہنے کا موقعہ مل گیا کہ خیر ہم تو ثنوی (دو خداؤں کے ماننے والے) تھے مگر تم تثلیث والے ہو۔ اب پھر ساری دنیا میں توحید برائے نام تھی۔ اور ظاہری صورت میں جسے دیکھیے مشرک تھا۔

عرب کے جہلا علم و فضل سے محروم اور متمدن و مہذب قوموں سے دور ہونے کے باعث اب تک پرانے مذاق کی بت پرستی میں مبتلا تھے۔ اُن میں درخت، جانور اور بت سب ہی طرح کے معبود تھے۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورے پورے مشرک ہوں گے لیکن قرآن مجید جو اُن کے مذہب کے استیصال کے لیے آیا تھا وہی بتا رہا ہے کہ ایک سے زیادہ خداؤں کے وہ قائل نہ تھے۔ اور اگر اُن سے پوچھا جاتا کہ تمھارا خالق کون ہے تو جواب دیتے کہ "خدائے وحدہٗ لاشریک"۔ اسکے بعد جب الزام دیا جاتا کہ "پھر تم ان بتوں کو کیوں پوجتے ہو؟" تو کہتے "اس لیے کہ یہ بت خدا کی درگاہ میں ہماری شفاعت کریں گے"۔

اس بیان سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ اسلام سے پیشتر کے تمام مذاہب بت پرست ہوں یا خدا پرست توحید کے سب قائل تھے۔ شرک صرف عبادت اور پرستش میں تھا عقائد میں نہیں۔ یہ بھی نظر آ گیا کہ پرانے مذاہب حقہ بھی مشرکوں کے اثر سے متاثر ہو کے اپنی اصلی توحید کو بھول بیٹھے تھے۔ عقائد میں اکثر شرک تھا بھی تو اُسے وہ ایک تقاضا یہ عقیدہ خیال کرتے۔ مثلاً عیسائیوں نے تثلیث کو مانا بھی تو توحید کے لفظ کو نہ چھوڑا۔ اور تثلیث کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے رہے کہ ہم ایک خدا کو مانتے ہیں اور جب "تثلیث و توحید کے باہم متضاد ہونے کی نسبت سوال کیا گیا تو سینٹ آگسٹین نے کہہ دیا کہ" یہ مسئلہ اس لیے ہے کہ دنیا میں مانا جائے اور آخرت میں جا کے سمجھا جائے"۔ اسی طرح زرتشتیوں کو ساری دنیا ثنوی المذہب کہتی تھی۔ وہ خود بھی اہرمن (شیطان) کو اتنی وقعت و عظمت دیتے اور اُس سے اس قدر ڈرتے تھے کہ اُن کے طرز عمل سے دھوکا ہوتا کہ شاید یہ اہرمن کو خدا ہی کے برابر کی قوت مانتے ہیں۔ لیکن اگر اُن سے پوچھا جاتا تو یہی جواب دیتے کہ ہمارا خدا ایک ہے۔ اور اہرمن تو ایک دشمن حق بُرائی ہے جو فانی ہے۔

الغرض عقیدۂ خدا کے ایک ماننے میں سب متحد ہیں۔ شرک کا جو کچھ اظہار ہوتا ہے عبادات اور طرز عمل سے۔ اس راز تک سب سے پہلے بنی اسرائیل پہونچے جو قدیم الایام میں بت پرستی کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ توحید کی اس اصلی شان کو مکمل طریقے کو پہلے پہل اسلام نے سمجھا اور اُس نے بتایا کہ زبان اور عقیدے سے ہم چاہے کتنے ہی خدائے واحد کے قائل ہوں ہمارا طرز عمل ہمارا طریقۂ عبادت اور ہماری معاشرت مشرکانہ ہو تو توحید باطل ہو جاتی ہے اور ہم اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے آپ کو موحد کہیں۔

اسلام نے کسی مافوق قوت یا کسی رتبے سے بالا دست شخص کے ماننے میں حفظ مراتب کے درجے قائم کیے۔ اُس نے حکم دیا" اعبدوا الٰہکم و اکرموا اخاکم (اپنے خدا کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی تعظیم کرو) پھر اسکے بعد عبادت و تعظیم کا فرق بتایا۔ نماز اور حج میں جن جن طریقوں سے خدا کی عظمت ماننے کا اظہار کیا جاتا ہے ان کو عبادت قرار دیا اور انکے سوا اور جتنے طریقے عظمت ماننے کے ہوں

ان کو تعظیم بتایا۔ ہم کسی بزرگ اور معزز شخص کو دیکھ کے کھڑے ہو جائیں تو یہ تعظیم ہے۔ لیکن اگر اُس کے آگے سجدہ یا رکوع کریں تو شرک ہے۔

ایک یہ پُرانا خیال بھی تھا کہ خداوند جل و علا چونکہ مجہول الکنہ بیچون و بیچگون اور ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ اس لیے اُسکی ذات تک ہمارا خیال نہیں پہونچ سکتا۔ مگر عبادت کے لیے اُس کا خیال کرنے اور اُس کا دھیان رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس دشواری کو قدیم مذاہب نے اپنے اپنے مذاق کے موافق حل کیا۔ اس کو تو سب نے تسلیم کر لیا کہ اُس کی طرف دھیان لے جانے کا ذریعہ اُس کی قدرت کاملہ کے کسی مکمل نمونے کو یا کسی ایسی چیز کو جو اُس کی کسی اعلیٰ صنعت کو ظاہر کرتی ہو قرار دے لیا جائے۔ لیکن انتخاب میں اختلاف پڑا۔ کسی نے کسی حسینہ کی تصویر کو کسی نے کسی قوی ہیکل انسان کی مورت کو۔ کسی نے کسی زبردست جانور کو۔ کسی نے کسی بڑے بھاری درخت کو۔ کسی نے نور و نار کو نردبان حق قرار دے کے عبادت الٰہی کے واسطے قبلہ بنایا۔

اسلام نے ایسے تمام قبلوں کو قبلہ ہائے باطل بتایا۔ اس لیے کہ چند ہی روز میں لوگ خود اُن قبلوں میں کسی کرشمے یا کسی قدرت کو ماننے لگے۔ اور بجائے اسکے کہ وہ انسان کے خیال کو خدا کی طرف لے جائیں خود ہی معبود بن گئے۔ اُن کی تقدیس و تنزیہ کی جانے لگی۔ ان مشرکانہ نتائج سے بچانے کے لیے اسلام نے اُن تمام قبلوں کی تو تکذیب کر دی مگر اس اصول کو نہیں چھوڑا کہ خدائے بیچون کی عبادت کے لیے کسی سمت اور قبلے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسلام نے ایک مکان کو قبلہ قرار دیا جو موحدوں کا سب سے پُرانا عبادت خانہ تھا۔ اور اُسے بھی اس قید کے ساتھ کہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ میں اسے سجدہ کرتا ہوں یا نماز میں اُس کی طرف خطاب کرے تو وہ مشرک ہے۔ اس اصول کی سچائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تمام دیگر مذاہب میں جو چیزیں سمت عبادت یا قبلہ بنائی گئی تھیں وہ چند ہی روز میں معبود بن گئیں اور اُنھیں کی پرستش ہونے لگی۔ بخلاف مسلمانوں کے قبلے خانۂ کعبہ کے جو گذشتہ تیرہ سو برس میں قبلے کی حد سے تجاوز کر کے معبود نہیں بن سکا۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی مرور ایام کے ساتھ شرک پیدا ہوا

اور مشرکانہ رسوم ترقی کرتے رہے۔ ہزارہا چیزیں بچ گئیں۔ ہزاروں چلّوں۔ جھنڈوں قبروں اور فرضی تربتوں کے آگے سجدے ہونے لگے مگر خانۂ کعبہ کی جو حیثیت آنحضرت صلعم کے زمانے میں تھی آج تک قائم ہے اُس میں ذرہ بھی تغیر نہیں ہوا۔

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے جیسی خالص توحید بتائی کبھی نہیں بتائی گئی تھی۔ اور اگر اُسکے تعلیمات پر پورا پورا عمل کیا جاتا تو یقیناً دنیا میں ایک سچی موحد قوم موجود ہوتی۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں میں بھی نماز روزے کے ساتھ مشرکانہ رسوم پیدا ہوگئے۔ اور اُن کا انجام بھی یہی ہوا کہ توحید کے مدعی تو سب ہیں مگر صحیح معنوں پر دیکھیے تو اُن میں بھی شاذ ونادر ہی کوئی موحّد نظر آئے گا۔

موسیقی

موسیقی اُن فنون لطیفہ میں سے ہے جن سے انسانی طبائع پر اثر ڈالنے کے لیے ہمیشہ اور ہر ملک میں کام لیا گیا ہے۔ اسکے موجد فطرت انسانی کے ایسے سامنے کے جذبات ہیں کہ اسکے پہلے بانی کو کسی ترقی یافتہ ملک یا متمدن قوم میں ڈھونڈھنا نادانی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اسکی موجد ہر قوم اور ہر سرزمین ہے جس نے آغاز ہی میں اسے ایجاد کر لیا۔ ہر وحشی سے وحشی قوم نے اپنا موسیقی آپ ایجاد کیا۔ مثل مشہور ہے کہ "گانا اور رونا سب کو آتا ہے"۔ جس روز کوئی پہلا وحشی انسان کسی بات پر خوش ہوکے اُچھلا کودا اور گایا ناچا، اور جس دن تخلیق عالم کے آغاز ہی میں کوئی جاہل عورت کسی عزیز کی موت پر بیتابی کے ساتھ سر پیٹ کے روئی اور بین کرنے لگی اُسی دن جانیے کہ موسیقی کا فن ایجاد ہوگیا۔ اور غالباً اسی کا اظہار قدیم مذاہب نے اس عنوان سے کیا ہے کہ اس فن لطیف کا موجد بجائے انسان کے دیوتاؤں کو بنا دیا جو تخلیق عالم کے آغاز میں انسانوں کے بڑے دوست تھے۔ اُن سے ملتے جُلتے تھے اور کبھی کبھی اُنھیں اپنی صحبتوں میں شریک کر لیا کرتے تھے۔

ہندو کہتے ہیں کہ موسیقی کے پہلے موجد مہادیو جی تھے جو سب دیوتاؤں سے

بڑے اور پہلے تھے۔ اور مختلف راگنیاں اپنے حالات و جذبات کے مناسب شکل و شمائل اور وضع، لباس مین اُن کی بیبیان بتائی جاتی ہین۔ مصر والے جو قدامت مین سب سے پہلے مشہور ہین۔ ان کا عقیدہ تھا کہ موسیقی اور آلات موسیقی یعنی مختلف باجون کو اُن کے اعلیٰ ترین دیوتاؤن۔ اُسارس۔ آئی سس۔ اور دس اور ہرمس نے ایجاد کیا۔ یونانیون کا خیال تھا کہ اُنکے اعلیٰ درجے کے دیوتا زیوس کی نو بیٹیان جو "میوزس" کہلاتی تھین وہی تمام علوم و فنون کی بانی تھین اور اُنھیں سے موسیقی کا فن ایجاد ہوا۔ اُن نو میوزس (دیویون) کے نام یہ ہیں (۱) کالیوپیہ۔ مثنویون اور افسانہ خوانی کی شاعری کی بانیہ (۲) کلیو۔ تاریخ کی موجدہ (۳) اِراتو۔ عاشقانہ شاعری کی بانیہ (۴) یوتیر پہ۔ نغمہ خوانی کی شاعری کی بانیہ (۵) ملپومنہ۔ مرثیہ خوانی اور جذبات غم کو اُبھارنے والی شاعری کی بانیہ۔ (۶) پولی ہم نیا۔ نغمہ خوانی اور فصاحت و بلاغت کی دیوی۔ (۷) ترپسی شورہ۔ ناچنے کی موجدہ (۸) تھالیہ۔ جذبات مسرت کو اُبھارنے والی شاعری کی بانیہ (۹) اُرانیہ۔ علم ہیأت کی موجدہ۔ اسی قسم کے خیالات فن موسیقی کی ایجاد کے متعلق چینیون، فارسیون۔ اور بابل والون میں بھی ہونگے لیکن افسوس کہ ہم اُن سے ناواقف ہین۔ مشرق کے متاخر محققون نے موسیقی کی ایجاد اور اُس کی وجہ تسمیہ کے بارے مین عجب عجب خیال آفرینیاں کی ہین مگر اب وہ زمانہ نہین۔ ہاکہ چڑیون مین نغمہ سنجی کا قدرتی جوہر دیکھکے موسیقار نام ایک طائر ڈھونڈھ کے نکالا جائے۔ موسیقی کے ایجاد کی کلغی اُسکے سر مین لگائی جائے۔ اور اُسی کی نسبت سے موسیقی کا نام موسیقی بتایا جائے۔ موسیقی کے نام کی اصلیت یہ ہے کہ یہ فن علوم کی یونانی دیویوں میوز کی جانب منسوب ہے اور میوز کا تلفظ یونانی زبان مین یقیناً "موس" تھا۔ عربی و فارسی مین اور ہماری زبان مین جس طرح نسبت کے لیے آخر مین یاے معروف لگائی جاتی ہے اسی طرح لاطینی اور یونانی مین "ق" لگایا جاتا تھا۔ اسی قاعدے کے موافق وہ موسیقی کو "موسیق" (انگریزی مین میوزک) کہتے تھے۔ عربون کی یہ غلطی تھی کہ اس کا خیال نہ کیا کہ موسیق مین خود ہی حرف نسبت موجود ہے اور اُسپر اپنے یونان کی یاے نسبت

"بھی اضافہ کر دی - اور اس فن کا نام ساری مشرقی دنیا میں بجائے "موسی" کے "موسیقی" ہو گیا -

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کو کن کن قوموں نے کہاں تک ترقی دی - اور کس قوم کی موسیقی کس پایہ پر تھی - معلوم ہوتا ہے کہ قدمائے یونان میں موسیقی کا مفہوم بمقابل آج کل کے زیادہ وسیع تھا - اُن لوگوں میں گانا - ناچنا اور بجانا ہی نہیں بلکہ شاعری بھی اُس میں شامل تھی - اصل یہ ہے کہ اُنکے خیال میں جتنے فنون "میوزس" دیویوں کی تعلیم سے حاصل ہوئے تھے سب اُن کی موسیقی میں شامل تھے -

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے موسیقی کو اہل مصر نے ترقی دی - اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنکی موسیقی اعلیٰ درجۂ ترقی کو پہونچ گئی تھی - مگر اس عام تحقیق کے خلاف یونانی مورخ ڈیوڈورس سقولوس یقینی طور پر بیان کرتا ہے کہ مصر میں قدیم الایام میں موسیقی کی تعلیم و تعلم اور اُس سے حظ اُٹھانے کی ممانعت تھی - اس لیے کہ اُسکے شوق میں مبتلا ہوکے آدمی عیش پرست ہو جاتے ہیں - اور جہاں انسان کو اس کا شوق ہوا بالکل گیا گذرا ہو جاتا ہے - مگر افلاطون اور ہرودوطوس (جو یونانیوں ہی کا نہیں ساری دنیا کا سب سے پہلا مورخ ہے) دونوں نے مصر کا سفر کیا تھا اور دونوں یقین دلاتے ہیں کہ بخلاف ممانعت اور روک کے مصر میں علم موسیقی کو ہر طرح سے ترقی تھی - سلطنت اُسے روز افزوں ترقی دے رہی تھی - ورنو عمروں کو کمسنی ہی میں اس کی تعلیم دی جاتی تھی - خود ڈیوڈورس جو مصر میں اس کے ممنوع ہونے کا راوی ہے دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ "موسیقی اور اسکے تمام سازوں کے موجد مصر کے دیوتا تھے" - اور یہ امر پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ اہل مصر کے پاس ایسے باجے اور آلات طرب موجود تھے جن سے ہر قسم کے جذبات میں تحریک پیدا کرنے والے مختلف نغمے ادا ہوتے تھے -

اہل بابل و نینوا میں بھی موسیقی کا بڑا رواج تھا - ان کے وقت کی بنی ہوئی تصویریں بتا رہی ہیں کہ بادشاہوں کے ساتھ ساتھ اور فتحیاب فوجوں کے آگے آگے چنگ و رباب بجانے والے مغنی چلا کرتے تھے - یہ بھی ثابت ہے کہ اُن کے

وہاں موسیقی عبادت میں داخل تھی۔ اور بڑے بڑے مندروں اور بتخانوں میں رباب نشاط اور مغنیوں کی چوکیاں مقرر تھیں جن کے نغمے پر اکثر پجاریوں کو حال آیا کرتا۔ مگر چونکہ انکے پاس سوا پتھروں اور قصر و ایوان کی دیواروں پر کندہ کر دینے کے اور کوئی ذریعہ اپنے علوم و فنون کو بعد والوں کے لیے محفوظ کر دینے کا نہ تھا اس لیے اُن کے جملہ علوم کی طرح اُن کی موسیقی بھی اُنھیں کے ساتھ مٹ گئی۔ اگر یونانیوں کی طرح پپائرس وغیرہ کی قسم کا سامان تصنیف و تدوین اہل بابل و نینوا کے پاس بھی موجود ہوتا تو آج ہم اُن کے علوم سے اس قدر ناواقف نہ ہوتے۔ اور بخوبی معلوم ہوتا کہ انکی موسیقی کے کیا اصول تھے اور کیسی تھی۔

بنی اسرائیل کو بھی موسیقی کا کم شوق نہ تھا۔ توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے آلات طرب خصوصاً چنگ و ارغنون کا موجد جوبل تھا جو حضرت آدمؑ کی نسل میں ساتویں پشت پر تھا۔ اُسکے ارغنون سے مراد غالباً وہ پرانے زمانے کا ساز ہے جس میں کئی بانسریاں ایک میں جوڑ دی جاتی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ موسیقی کی ایجاد جوبل سے پہلے ہی ہو چکی ہوگی۔ اور اگر پہلے نہ بھی ہوئی ہو تو اُس کے زمانے میں تو شک ہی نہیں کہ یہ فن موجود تھا جس کی تائید و تقویت کے لیے آلات طرب ایجاد کیے گئے۔ مگر بنی اسرائیل کی موسیقی کے اصلی عروج کا زمانہ حضرت داؤدؑ کا زمانہ ہے جنکے مزامیر مشہور ہیں۔ قدیم مورخ اسیبوس کا بیان ہے کہ حضرت داؤد جہاں جاتے اپنا چنگ ضرور ساتھ لیجاتے۔ اُنھوں نے مذہبی رسوم و عبادات کے لیے اہل موسیقی کی چوکیاں اور باجوں کے بینڈ مقرر کیے تھے۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ عبادت کرتے وقت وہ خود خدائے واحد ذوالجلال کے سامنے گاتے بجاتے اور ناچتے تھے۔ جبکہ آلات طرب سے کام لینے والوں کا طائفہ چنگ و رباب۔ طنبورہ۔ جھانجھ۔ قرنا اور نرسیاں بجاتا تھا۔ اور وہ اپنی مناجات کے نغمے کی صدا بلند کرتے۔ ان چیزوں کو اُنکے بعد حضرت سلیمانؑ نے اور زیادہ ترقی دی جبکہ مسجد الٰہی اور حرم ربانی میں بہت سے گانے بجانے والے مقرر تھے۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کی موسیقی کے شباب کا تھا۔ مگر اسیری بابل نے جو ۶۳ سال تک قائم رہی یہود کی موسیقی اور اُنکے آلات طرب دونوں کو خاک میں

ملا دیا۔ اس لمبی قید سے چھوٹنے کے بعد وہ پنپنے نہیں پائے تھے کہ ارض یہودا کا وہ پُر فتن زمانہ شروع ہو گیا جبکہ اُن پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے اور مصریون فارسیون اور رومیون سب نے یکے بعد دیگرے اُنھین مغلوب و مقہور کیا۔ اور کبھی اتنی مہلت نہ دی کہ اطمینان سے بیٹھ کے اپنے قدیم موسیقی کو تازہ اور پرانے آلات طرب کو پھر زندہ کرتے۔ ان تباہیون نے موسیقی کو اُن مین سے فنا کر دیا۔ اور اب اُنکے عبادات اور رسوم مذہبی کو گانے بجانے اور آلات طرب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ساری دنیا کے معابد یہود سے موسیقی کا فن قطعاً علٰحدہ ہو گیا۔ اور جرمن کے یہود کا مدتون سے یہ عقیدہ ہے کہ مسیحا کے ظہور سے پہلے گانا بجانا اور خوشیان منانا غیر مناسب اور حرام ہے۔

مگر افسوس اہل مغرب نے ہندوستان کی موسیقی کی طرف کبھی توجہ نہین کی حالانکہ سب سے قدیم اور سب سے زیادہ مکمل اسی سرزمین کی موسیقی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اُس کی طرف ہم اُس وقت توجہ کرین گے جب مسلمانون کی موسیقی کا تذکرہ آئے گا۔

یونانیون مین بہت سی دیگر اقوام عالم کی بہ نسبت موسیقی کی زیادہ قدر و منزلت تھی۔ لیکن اس تاریخی بیان کے سوا اگر ہم اس بات کو معلوم کرنا چاہین کہ اُن کی موسیقی کیا تھی اور کیسی تھی تو کچھ بھی پتہ نہین چل سکتا۔ ہر قوم کی موسیقی اُن گیتون کے ذریعے سے جن مین اچھی اور دلکش دُھنین بندھ جاتی ہین بعد والی نسلون مین منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور اُنھین کو سُن کے بعد والون کو اپنے متقدمین کی موسیقی کی نوعیت کسی نہ کسی حد تک ضرور معلوم ہو جایا کرتی ہے۔ بخلاف اسکے یونانیون کی موجودہ نسلون مین اپنے بزرگان سلف کی نہ زبان ہی باقی رہی اور نہ اُن کا نغمہ ہی باقی رہ گیا۔ پُرانے یونانیون کی موسیقی کا جو کچھ حصہ مل سکتا ہے وہ اُنکی چند منتشر تحریرین ہین جو کسی کی سمجھ مین نہین آ سکتین۔

دنیا مین جس وقت خط ایجاد کیا گیا تو اسکی پوری کوشش کی گئی کہ انسان کی آوازین مخارج کے لحاظ سے مختلف حروف مین قلمبند کر لی جائین تاکہ جو لفظ جتنے مخارج کی آوازون سے مرکب ہے اپنے ہی حرفون کے ذریعہ سے تحریر مین

لا یا جائے۔ لیکن اس کی کبھی کوشش نہین کی گئی کہ آواز اپنی ترقی و تنزل۔ اپنے زیر وبم۔ اور مینڈون اور زمزمون کے لحاظ سے تحریری نشانات مین دکھائی جائے یہ ایسی کمی تھی جس کے باعث کوئی قوم اپنے موسیقی کو چاہے وہ کیسے ہی کمال کے درجے کو پہونچی ہوئی ہو دوسرون کے ذہن نشین کرنے کے لیے قلمبند نہ کر سکی۔

یونان کے اکثر قدیم فلسفیون خصوصاً فیثا غورس۔ افلاطون۔ اور ارسطو کے شاگردون نے موسیقی پر لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنون یونان مین موسیقی کا سکھانا اعلیٰ طبقے کے رئیس زادون کی تعلیم کا جزو لازمی تھا۔ اور نیز یہ کہ دلچسپی اور صحبتون مین لطف ہی پیدا کرنے کے لیے نہین بلکہ مذہبی رسوم اور عبادات مین بھی موسیقی سے کام لیا جاتا تھا۔ وہ لوگ چونکہ ایشیاے کوچک سے جا جا کے بسے تھے اور وہین کے علاقون کے نام کی نوآبادیان یونان مین قائم ہوگئی تھین لہذا اکثر اُن نوآبادیون یا اُنکے اصلی ایشیائی علاقون کی جانب اُنکی دُھنین اور اُنکے نغمے منسوب تھے۔ چنانچہ اپنے بعض نغمون کو لیڈیا سے ماخوذ بتاتے تھے جہان پُرانا مُغنی امفی اون اِس فن کی تعلیم دیتا تھا۔ بعض نغمون کو ارکاڈیا سے حاصل کیا تھا جہان چرواہے بانسلی وغیرہ مین نہایت ہی دلکش تانین لگایا کرتے تھے۔ اُن کے گانے کے ٹھاٹھ مقامات فریجیا۔ ڈوریا۔ ایولیا۔ اور ایونیا کی جانب منسوب تھے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یونانیون کی موسیقی صرف سُرون تک محدود تھی۔ اور اُن کو [illegible] کہنے لگے اُن کے نزدیک وزن کا تعلق صرف نظم سے تھا۔ مگر غالباً یہ قیاس ویسا ہی ہو جیسے ہندوستان کے موسیقی دان اکثر اعتراض کیا کرتے ہین کہ انگریزی موسیقی مین لَے نہین ہے۔ یونانیون نے اپنے علمی مذاق سے اس بات کی بھی کوشش کی تھی کہ موسیقی کی دُھنون کو تحریر مین لے آئین۔ مگر اس کوشش مین کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ جو اُن کے گلے سے نہ سُن چکا ہو وہ اُس تحریر کے ذریعے سے ہرگز نہین سمجھ سکتا کہ وہ نغمہ سُرون کی کس مناسب ترتیب سے اور کس دُھن مین ادا ہوتا ہے۔ اُنھون نے موسیقی کی تحریر کی بنیاد حروف تہجی پر رکھی تھی۔ سُرون کے لحاظ سے اُن حرفون کی صورتین بدلی اور

اور بگاڑی گئی تھین جس کی بدولت ان کی بہت سی مختلف صورتین ہو گئین - اور پھر اُن پر زیر و بم اور زمزمہ وغیرہ کے علامات اضافہ کیے گئے - نتیجہ یہ ہوا کہ بڑھتے بڑھتے سولہ سو سے زیادہ تحریری نشانات ہو گئے - اور موسیقی کی حیثیت سے اُن کی الف بے چینیون کی الف بے بن گئی - جس مین ہزارون حروف ہین - اور آخر اُن علامتون اور بگڑے اور بدلے حرفون کی وجہ سے وہ اس قدر پیچیدہ ہو گئی کہ کسی طرح سمجھ مین نہین آ سکتی - مگر اس بات کا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھون نے موسیقی مین کس قدر زیادہ ترقی کر لی ہو گی - متاخرین مین یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ "آیا یونانیون کو متتالف لغمون یعنی مرکب دُھنون کا علم تھا یا نہین؟" اور بڑے ردو قدح کے بعد جو فیصلہ ہوا یہ تھا کہ "نہین - اُنھین ایسی دُھنون کا علم نہ تھا"

یونانیون مین عرب کے بازار عکاظ کی طرح مختلف شہرون مین میلے ہوتے تھے جن مین ہر قسم کے کرتب اور ہر فن کے کمالات دکھائے جاتے - اُنھین میلون مین یونانی شعرا اپنی نظمون کو ہمارے مولانا شبلی کی طرح موسیقی کی مناسب دُھنون مین گا گا کے سنایا کرتے - نیمین اور ارتھمین گیمون (میلون) مین موسیقی اور شاعری کے لیے انعام مقرر تھے - اور پتھیا کے گیم (میلے) مین جو بہت آخر آخر زمانے مین ہوا کرتا تھا صرف باجون اور آلات طرب پر کمال دکھانے والون کو انعام دیا جاتا - یونانیون مین جتنی عزت موسیقی کے پروفیسرون کی تھی اور کسی فن کے پروفیسرون کی نہ تھی - اور انھین بڑی بھاری تنخواہین ملا کرتی تھین -

اہل یونان نے جس طرح موسیقی کو مصر والون سے لیا تھا اسی طرح رومیون نے یونانیون سے لیا - روم کی قوم ایک خالص سپہ گر اور جنگجو قوم تھی - اور ایسے فنون لطیفہ کی طرف فوجی مذاق والون کو زیادہ توجہ نہین ہو سکتی - مگر پھر بھی وہ فن موسیقی کی نہایت قدر کرتے تھے اور موسیقی دانون کی اُن مین بڑی عزت کی جاتی تھی - اپنے ابتدائی عروج کے زمانے مین اس فن کو اُنھون نے بہت ہی کم ترقی دی - بلکہ سچ یہ ہے کہ مطلق توجہ نہین کی - یہان تک کہ نیرو قیصر کا زمانہ آیا

اور اُس نے باوجودیکہ ظالم تھا موسیقی کو اعلیٰ درجۂ ترقی وعظمت تک پہونچا دیا۔ اُس نے خود اس فن لطیف کو حاصل کیا۔ اور اپنا زیادہ وقت ٹورپوپس کی شاگردی مین صرف کردیا جو اُس عہد کا سب سے زیادہ نامور مغنی تھا اور چنگ نواز تھا۔ اور چونکہ اس فن کی جانب سلطنت کی توجہ مائل ہوگئی تھی لہذا نیرو کے بعد اس کے جانشینون سے بھی جہان تک بنا موسیقی۔ فوجی کرتبون۔ اور ڈراما کو معتدبہ ترقی دی۔ یہان تک کہ رومیون کے تنزل کے ساتھ اُنکی موسیقی بھی مٹ گئی۔ جس کے بعد مدتون اور صدیون بعد موجودہ اہل اطالیہ نے اپنی پُرانی موسیقی کو پھر زندہ کیا۔

رومیون کے معاصر آیران کے ساسانی تھے۔ اگر غور سے دیکھیے تو اُن کی قدیم الایام کی سطوت وجبروت ساری دنیا سے جس قدر بڑھی ہوئی تھی اور جس انتہائی کمال کو اُنکی عیش پرستی پہونچی ہوئی تھی وہی درجہ اُنکی موسیقی کو بھی حاصل تھا۔ اُن مین قدیم الایام سے بڑے بڑے مغنی اور سرود وچنگ نواز ہوتے چلے آئے تھے مگر آخر مین باربد اور نکیسا نے جو خسرو پرویز کے دربار کے مغنی کہے جاتے ہین اس فن کو ایسے کمال تک پہونچا دیا کہ اپنے نغمون سے ساحری کا کام لینے۔ مگر افسوس اُنکی تاریخ کی طرح اُنکی موسیقی کا بھی نام ہی نام دنیا مین باقی رہ گیا۔ اُن کی عظمت وسطوت کی تاریخ تو دیگر معاصر اقوام کے ذریعہ سے تھوڑی بہت مل بھی گئی مگر اُنکی موسیقی کا ذوق کسی غیر کو کیا ہوسکتا تھا جو وہ ہمین اُسکی خوبیون سے آگاہ کرتا۔

اب عربون نے رومیون اور ساسانیون دونون کا دفتر اُلٹ کے شام وعراق مین ایک نئی اسلامی معاشرت قائم کی۔ قرون اولیٰ مین مسلمانون نے خداپرستی اور عبادت کے جوش وذوق مین موسیقی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا خصوصاً اس لیے کہ موسیقی بُت پرستون کی عبادات مین داخل تھی۔ اور بنی اسرائیل کا خداپرست گروہ اس فن سے قطعاً متنفر تھا۔ اگرچہ حضرت سرور کائنات صلعم نے عورتون اور لڑکیون کو بارہا گاتے بجاتے دیکھا اونہیں روکا تھا۔ حبشیون کا رقص دیکھا اونہین منع فرمایا تھا۔ فن تجوید وقرأت کی تحصیل کو موجب ثواب آخرت

بنایا جو کہ دراصل موسیقی ہی کا ایک روح افزا شعبہ تھا۔ جس سے کافی طور پہ پتہ چل سکتا ہے کہ موسیقی کا وہی حصہ ممنوع ہے جو رسوم بُت پرستی یا جذباتِ شہوت پرستی سے تعلق رکھتا ہو۔ مگر اسلام مین سوا ظاہریہ فرقہ اہل حدیث کے اکثر علمانے موسیقی کو ناجائز ہی قرار دیا۔ مگر صحابہ اور تابعین ہی کے زمانے مین ہم اتنے اتنے بڑے اور اس پائے کے لوگون کو گانا سنتے دیکھتے ہین کہ ہمین تحریم موسیقی کے عام فتوے پر تعجب آتا ہے۔ اس شرعی روک پر بھی مسلمانون مین فن موسیقی کو فطرتی طور پر ترقی حاصل ہونے لگی۔ جس کی وجہ غالبًا یہ ہوئی کہ صرف اُمراو ملوک ہی نہین سلف کے مسلمان اتقیا و زہاد بھی دینی خلوص اور بے نفسی کے جذبات کے ساتھ ذوق و شوق سے گانا سننے لگے۔ سب سے پہلے ابومسجح نے جسکو ہم دلگداز ہی کے صفحون پر بتا چکے ہین۔ فارس و روم کے دور دراز شہرون کی خاک چھان کے دنیا کے مُسلّم باکمالون سے فن موسیقی کو سیکھا اور اسکے بعد عربی مین مناسب اور مقبول عام دُھنین قائم کین۔ ابومسجح کے بعد عربون مین بڑے بڑے نامور مغنّی پیدا ہونا شروع ہوے جن کے مفصل حالات کتب تاریخ مین موجود ہین۔ خصوصًا مامون کے زمانے مین اُسکے دربار کے مغنّی اسحٰق موصلی اور مامون کی بہن عُلیّہ نے موسیقی کے ایسے ایسے کمالات دکھائے کہ عربون کے نزدیک ساری دنیا مین اُن سے بڑے مغنّی موجود نہ تھے۔ اغانی کی ضخیم کتاب جو بیس اکیس جلدون مین ختم ہوئی ہے صرف "مائۃ اصوات المختارۃ" یعنی دولتِ عباسیہ کے عہد کی سو مقبول عام دھنون کے بیان مین ہے۔

مسلمانون کے اعلیٰ کمال موسیقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انکا سب سے بڑا فلسفی اور حکیم ابونصر فارابی جو حکماے اسلام مین معلم ثانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جسکی نسبت سب کو اتفاق تھا کہ ارسطو کے بعد اُسکے پایے کا کوئی حکیم دنیا مین پیدا نہین ہوا۔ اور جسکے تصانیف نے ابن سینا کو حکیم بنا دیا تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے آغاز مین موسیقی کا سب سے بڑا باکمال پروفیسر تھا۔ موسیقی کا مشہور باجہ "قانون" اسی کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ وہ بخلاف دیگر علما و فضلا کے تُرکی سپاہیون کی وضع مین رہا کرتا تھا۔ اور صورت دیکھ کے لوگ سمجھتے کہ کوئی معمولی درجے کا فوجی تُرک ہے

جب شہر دمشق مین پہونچا تو اُسی سادی سپاہیانہ وضع میں فرمانروا ے شام سیف الدولہ بن حمدان کے دربار مین گیا۔ جہان بڑے بڑے مشہور روزگار علما جمع تھے۔ اس مہذب مجمع مین ابونصر کو خاموش کھڑے دیکھ کے سیف الدولہ نے کہا "بیٹھ جاو" ابونصر نے پوچھا "اپنے رتبے کے مناسب مقام پر بیٹھون یا آپ کے دربار کی مناسبت سے؟" سیف الدولہ نے کہا "اپنے رتبے کے مناسب مقام پر" یہ سنتے ہی ابونصر اہل دربار کی تمام صفون کو قطع کرتا ہوا خود سیف الدولہ کی مسند پر پہونچا اور اس پھیل کے بیٹھ گیا کہ خود سیف الدولہ بھی مسند سے باہر نکل گیا۔ یہ دیکھ کے سیف الدولہ والا ہی نہایت برہم ہوا اور اپنے مسلح غلامون کی طرف دیکھ کے ایک خاص زبان مین جسکو سوا اُسکے غلامون کے دربار کا کوئی اور شخص نہ سمجھتا تھا کہا "اس شخص نے سخت بے ادبی کی ہے۔ مین اس سے چند سوالات کرتا ہون اگر جواب نہ دے سکے تو بے مجھ سے پوچھے اسکے ٹکڑے اُڑا دینا۔" غلام تو خاموش ہو رہے مگر ابونصر نے اُسی زبان مین جواب دیا "یا امیر صبر کیجیے ہر امر کا انکشاف انجام مین ہوا کرتا ہے۔" سیف الدولہ نے گھبرا کے پوچھا "تم اس زبان کو جانتے ہو؟" جواب ملا "جی ہان جانتا ہون۔ اور اسی زبان پر موقوف نہین مین ستر زبانون مین بخوبی گفتگو کر سکتا ہون۔" یہ کہہ کے ابونصر نے علما سے گفتگو شروع کی اور جو فن مین شہرت رکھتا تھا اُسی فن مین بحث کر کے اُسے خاموش کر دیا۔ اور تھوڑی ہی دیر مین ظاہر ہو گیا کہ سارے علماے دربار مین سے کوئی بھی کسی فن مین اُس کی ہمسری کا دعوے نہ کر سکتا تھا۔ تمام حاضرین اور خود سیف الدولہ کی یہ حالت تھی کہ عش عش کر رہے تھے اور حیران و مبہوت تھے۔ نوبت یہان تک پہونچی کہ علماے حاضرین نے دربار شاہی کو مدرسہ بنا دیا اور جو الفاظ ابونصر کی زبان سے سنتے اُسے قلمبند کرنے لگے۔ یہ رنگ دیکھ کے سیف الدولہ نے دربار کے برخاست ہونے کا حکم دے کے علما کو رخصت کر دیا اور ابونصر کو ساتھ لے کے دربار خاص مین چلا گیا اور پوچھا "کچھ نوش فرمائیے گا؟" ابونصر نے کہا "نہین"۔ پوچھا "کچھ پیجیے گا؟" کہا "نہین"۔ پوچھا "اچھا، گانا سنیے گا؟" ابونصر نے کہا "ضرور! اس کا تو مجھے خاص شوق ہے!" فوراً ارباب نشاط حاضر ہوے۔ اُس زمانے کی مشہور و مقبول عام گانے والیان سامنے کھڑی ہو کے مجرا کرنے لگین اور آلات طرب کے

سے جتنے اعلیٰ درجے کے ماہر شہر مین موجود تھے اپنے اپنے ساز لے کے کھڑے ہوے اور بجانے لگے - مگر ابونصر کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک کے گانے بجانے مین عیب نکالتے - اور ایسی سخت نکتہ چینیان کین کہ اُنکے رعب سے گانے بجانے والون کو اپنا فن بھول گیا - اور سیف الدولہ نے تعجب سے کہا "کیا جناب اس فن کو بھی جانتے ہین؟" جواب دیا "جی ہان جانتا ہون" - اب سب لوگ مصر ہوے کہ کچھ سنائیے" ابونصر نے کہا "بہتر" یہ کہکے ایک تھیلی مین سے جو ساتھ تھی لکڑی کے چند ٹکڑے نکالے - اُنھین ایک خاص ترتیب و ترکیب سے جوڑ کے بنایا - اُن پر تار کھینچے اور اُنھین بجا بجا کے ایک ایسی دھن مین گانا شروع کیا کہ جو سنتا اُسے ہنسی آنے لگتی نتیجہ یہ ہوا کہ دم بھر مین تمام حاضرین مارے ہنسی کے لوٹنے لگے - پھر اُنھون نے اُسی ساز کو کھول کے نئی ترکیب سے جوڑا - اور ایک سُر ملا کے جو گانا بجانا شروع کیا تو تمام حاضرین زار و قطار رو رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ در و دیوار پر رقت طاری ہے - اسکے بعد اُنھون نے اُس ساز کو پھر کھول ڈالا اور تیسری ترکیب سے جوڑ کے بجانا شروع کیا تو تمام سامعین پر غنودگی طاری ہوئی - چند منٹ نہین گذرے تھے کہ سب لوگ حتیٰ کہ خود سیف الدولہ اور پہرے والے تک غافل سو رہے تھے - ان سب کو غافل دیکھ کے ابونصر نے اپنا ساز کھول کے تھیلی مین رکھا چپکے سے اُٹھ کے چلے گئے اور سب لوگ سوتے کے سوتے رہ گئے - ان باتون کا یہ اثر تھا کہ علامہ ابونصر فارابی مرتے دم تک سیف الدولہ کے دربار مین رہے - اور سیف الدولہ ہی نے اُنکے جنازے کی نماز پڑھائی - حکیم ابن سینا بھی اس فن کا اتنا بڑا باکمال تھا کہ شہنائی اُسی کی ایجاد ہے -

عربون نے بھی یونانیون کی طرح اس بات کی کوشش کی کہ فن موسیقی کو تحریر مین لائین - سُرون اور گلے کے دیگر خصائص نغمہ کے اظہار کے لیے کسی خاص خط کے ایجاد کی طرف تو اُن کا خیال نہین گیا مگر سُرون کو سرود کے تارون اور اُنکے ساتھ انگلیون کے تعلقات کا لحاظ رکھ کے اُنھون نے اپنے تصانیف مین دھنون کو اس طرح بتانا چاہا کہ مثلاً "ثقیلُ اولُ بالسبابۃ فی مجرے البنصر"

ثقیل ہے اور اول۔ بیچ کی انگلی سے مگر چھنگلیا کے برابر والی انگلی کی چال مین) اسی طرح کی بیسیون اصطلاحین ہین جن کو ہم اور ہمارے زمانے کے لوگ مطلقاً نہین سمجھ سکتے۔ حالانکہ عربی کی جو ہزارہا دھُنین ان اصطلاحون مین بتائی گئی ہین اُن سے کتابین بھری پڑی ہین۔ افسوس اُن سے ہمارے موجودہ موسیقی دان فائدہ نہین اُٹھا سکتے۔ خلافت عباسیہ کے ساتھ ہی عربون کی موسیقی بھی مٹ گئی۔ کیونکہ جس طرح مسلمانون نے اپنے قرون اولیٰ کے تمام فنون کو آخر تک محفوظ رکھا تھا اپنی پرانی موسیقی کو وہ نہ بچا سکے۔ جو تھوڑی بدنصیبی کی بات نہین ہے۔

اصل یہ ہے کہ موسیقی خالص عملی فن ہے۔ اور اس کا تعلق بہت کچھ ہر قوم کے زبان۔ لہجے۔ اور اُسکے مخارج و اصوات سے اور اس سے بھی زیادہ اُس قوم کے گلے کے خصائص اور اُنکے مذاق و عادات کے ساتھ ہوتا ہے۔ زبان۔ لب و لہجہ۔ مخارج اور ذوق و عادت کے چھوٹنے کے ساتھ ہی موسیقی بھی چھوٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان عرب سے نکلنے کے بعد جہان گئے اپنے مذہب اور اپنے تمام علوم و فنون کو تو ساتھ لیتے گئے مگر موسیقی کو نہ لے جا سکے۔ ایران مین پہونچ کے جب وہ فارسی بولنے لگے تو اُن کی موسیقی بھی وہی ہوگئی جو ایران مین فارسی بولنے والون مین مروج تھی۔ اور جب ہندوستان مین آکے ہندی بنے تو عربی موسیقی بالکل خواب و خیال ہوگئی اور ہندوون کی موسیقی اُن کی موسیقی بن گئی۔

شاعری کا فن بھی اسی قسم کا ہے۔ مگر چونکہ اُسکا بہت کچھ حصہ خیالات و تشبیہات سے وابستہ ہے۔ اسلیے مسلمان جہان گئے اپنی شاعری کو ساتھ لیتے گئے۔ مسلمانون کے زمانے کی فارسی شاعری دراصل عربی شاعری ہی کا ایک نمونہ ہے جس مین باستثناے چند جملہ تشبیہات و استعارات عربی سے ماخوذ ہین۔ اور یہی حال ہماری اُردو شاعری کا ہے جو آج تک زیادہ تر عربی شاعری ہی کا ایک ضمیمہ ہے۔ مگر عربی موسیقی نہ ایران آسکی اور نہ ہندوستان مین پہونچ سکی۔ اگر موسیقی کے لیے کوئی ایسا خط ایجاد ہو جاتا جس مین آوازین مخارج کے لحاظ سے نہین بلکہ اپنے مختلف سُرون اور گھٹنے بڑھنے کے

اعتبار سے نقوش ہیں اور اکی جانشین اور تانون۔ میڈون اور گٹکری وغیرہ گلے کے مخصوص حرکات کی بنا پر علامات تحریری قائم کر دیے جاتے تو شاید عربی موسیقی ایسی تحریر میں آجاتی تو آج تک بتا سکتی کہ اُنکے موسیقی کے کیا اصول تھے اور وہ کس وضع کی تھی۔

ہندوستان میں مسلمان عربی و ایرانی موسیقی کو بھول گئے اور انھیں اپنے پُرانے نغموں کے عوض سنسکرت کا ایک ایسا مکمل فن موسیقی مل گیا جو باعتبار اپنے قدیم اصول اور اپنی وسعت کے ساری دنیا کی موسیقی سے بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ موسیقی جو ہندوؤں کی صحبت ہائے عیش اور اُنکی عبادتوں کی جان تھی چند ہی روز میں راجاؤں کی سبھاؤں سے مسلمان بادشاہوں کے دربار میں، اور ہندوؤں کے مندروں سے مسلمان صوفیوں کی محفل حال و قال میں ہو نکلی۔ اور آخر دولت مغلیہ کے عروج کے زمانے میں خود مسلمانوں میں ہندی موسیقی کے ایسے ایسے باکمال پیدا ہو گئے کہ اُنکے سامنے ہندو گویوں کی شہرت مٹ گئی اور جنکے گانے کے کمالات آج قومی روایتوں میں کرامات و معجزات کی شان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج کی موسیقی کا فن زیادہ مسلمانوں ہی میں ہے اور بڑے بڑے مشہور گوّیے سب مسلمان ہیں۔ ہندی موسیقی کی تفصیل بتانے کے لیے اسوقت ہمارے پاس کافی گنجایش نہیں ہے جس کسی کو شوق ہو فارسی کی کتاب "اصول النغمات الآصفیہ" اور راجہ نواب علی خان صاحب کی کتاب "معارف النغمات" کا مطالعہ کرے۔

رومیوں کے بعد یورپ کی موسیقی مدتوں تک نہایت ہی ابتر حالت میں رہی عیسائیوں نے چونکہ بت پرستوں کی تمام باتوں کو اختیار کر لیا تھا اس لیے موسیقی کو بھی روم کے پُرانے بتخانوں کی طرح اپنے معبدوں اور گرجوں میں مروّج کر دیا۔ مگر اُنکی ابتدائی زمانے کی موسیقی ہمارے ڈھالیوں کے راگ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ ۳۸۶ء میں شہر ملان کے اُسقف سینٹ امبروس نے یہ دیکھ کے کہ گرجوں کی موسیقی بالکل بے اصول اور پراگندہ ہے اصلاح کی طرف توجہ کی اور وہ خاص دُھن ایجاد کی جو "امبروسین چانٹ" (نغمۂ امبروس) کے نام سے مشہور ہے۔

پوپ گرگیوری کے مرنے کے بعد جو سنہ ۶۰۴ء کا واقعہ ہے اس بات کی کوشش شروع ہوئی کہ موسیقی کی دُھنوں کو کس طریقے سے قلمبند کیا جائے۔ مگر اِس زمانے میں جو خط موسیقی ایجاد کیا گیا اُس کا لکھنا چاہے آسان ہو مگر گانے وقت اُس کا لحاظ رکھنا اور اُس پر عمل کرنا بہت ہی دشوار تھا۔ اسلیے کہ ہمارے یہاں جس طرح بعض لوگوں نے سُروں کے ناموں کے پہلے حرف یا ٹکڑے لکھ دیے ہیں وہاں بھی لکھ دیے جاتے تھے۔ مثلاً سرگم کی جگہ س یا سُر۔ رکھب کی جگہ ر یا رکھ۔ گندھار کی جگہ گ یا گن۔ یہ تحریر کسی حد تک دُھنوں کو محفوظ ضرور کر سکتی تھی مگر گانے والے گاتے وقت اُن سے مطلق فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے۔ اور آواز کے دیگر خصائص تو مطلقاً نہیں معلوم ہو سکتے تھے۔

دسویں صدی کے آخر میں اس تحریر کو من جمیع الوجوہ ناقص دیکھ کے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ اس میں سُروں کے شمار کے لحاظ سے سات متوازی خطوط قائم کیے جاتے۔ نغمہ کا خط اُن میں لہراتا ہوا چلتا اور گلا جس سُر پر پہونچتا اُسی سُر کی لکیر پر پہونچا دیا جاتا۔ اور اسکے ساتھ گلے کے دیگر خصائص و حرکات نقطوں اور خطوں کے اشارے سے بتا دیے جاتے۔ اس خط نے موسیقی کی تحریر بہت آسان کر دی۔ لیکن سنہ ۱۰۲۲ء میں جب پوپ بنی ڈکٹ ہشتم کا زمانہ تھا اس خط موسیقی میں اور بہت سی ترقیاں اور اصلاحیں ہوئی ہوئیں۔ چنانچہ اسی زمانے میں پادریوں کے بنی ڈکٹن گروہ کے ایک راہب نے جو علاقہ ٹسکانی کے ایک گمنام گانوں آرزو میں پیدا ہوا تھا اور گوئی ڈو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ساتوں خطوط متوازی کا شمار سات سے گھٹا کے چار ہی کر دیا۔ اسلیے کہ چار خطوط اور اُنکے درمیان کی تین خلاؤں مل کے سات مقامات قائم ہو سکتے تھے۔ اس میں چونکہ خطوط کی درمیانی خلا سے بھی کام لیا گیا تھا اس لیے نقطوں اور آڑے خطوں کے علامات و نشانات اُن خطوں کے درمیان میں بھی قائم کر دیے جاتے۔ یہی تحریر موسیقی آج تک یورپ میں مروج ہے۔ اور وہاں کے تمام موسیقی کالجوں میں اسی خط موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اگرچہ اس اعتراض کا جواب نہیں کہ سنسکرت کی قدیم مکمل و باضابطہ موسیقی سے غافل رہ کے یورپ

والوں نے اپنے آپ کو ایک بڑے علمی ذخیرے سے محروم و بے بہرہ کر رکھا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یورپ میں فی الحال ہر حیثیت سے موسیقی کو بڑی ترقی ہو رہی ہے۔ اور گلے بازی اور آلات طرب دونوں چیزوں میں وہ ممالکِ ارض سے بڑھتے جاتے ہیں۔

ہمارے یہاں بھی اب موسیقی جاہل مغنیوں سے نکل کے پڑھے لکھے اور شائستہ لوگوں میں آنے لگی ہے۔ بعض علمانے اسکے جواز کے فتوے دیے ہیں۔ اور ہندوؤں نے بھی اپنے قدیم موسیقی کو نئے سرے سے سنبھالنا اور اُس میں از سر نو جان ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ دیکھ کر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موسیقی کے تحریر میں لانے کی اس وقت تک مطلقاً کوشش نہیں کی گئی۔ جبکہ اُردو کا نیا "شارٹ ہینڈ" خط بھی ایجاد ہو گیا تو تعلیم یافتہ شائقین موسیقی کی کوشش و توجہ سے کسی مکمل خطِ موسیقی کا ایجاد ہونا ہماری موسیقی کی ترقی کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے احباب اس کمی کو جلد پورا کریں گے۔

ہندوؤں کے علوم (نومبر ۱۹۱۳ء)

دُنیا اپنی نادانی سے چاہے قدر نہ کرے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہندو مذہب اور اُسکے ساتھ ہندوؤں کی قوم موجودہ دنیا کے آغوش میں ایک نامعلوم قدامت کی قابل قدر امانتیں ہیں۔ اور سلف کے جو ایام قدامت کے دُھندلکے میں آگئے اُنکے نہایت بیش بہا تبرکات ہندوؤں کی پُرانی زبان سنسکرت اور اُنکے ہمیشہ زندہ رہنے والے علوم ہیں۔ زمانہ ہر چیز کو مٹاتا رہتا ہے۔ کسی میں چاہے کیسی ہی ابدی زندگی کی صلاحیت ہو زمانہ اُس پر آہستہ آہستہ مرورِ ایام کی خاک ڈالتا ہی جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مدت دراز کے بعد وہی خاک اُسکی قبر بن جاتی ہے۔ اور وہ بے مرے زندہ دفن ہو جاتا ہے۔ زمانے کے ان زندہ مدفونوں میں مصری۔ بابلی۔ اسرائیلی۔ یونانی اور رومی ہیں جو ایسے علوم و فنون اور ایسی تاریخی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں کہ قدامت کی خاک میں دب جانے

کے بعد بھی یہ خاک سے پکار پکار کے اپنا نام بتاتے اور اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ مگر ہندوستان کی پرانی آریہ قوم نے باوجودیکہ سب سے قدیم ہے زمانے کی اُس خاک کو ہمیشہ جھٹک جھٹک کے ہٹا دیا۔ اور اُس پر مرور ایام کا زور نہ چلنا تھا نہ چلا۔ اور زمانہ اوروں کی طرح اُس کے زندہ دفن کرنے میں کسی طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ ہندو قوم نے زندگی کی مزاحمتوں پر ہمیشہ فتح پائی۔ جو جو دشواریاں پیش آئیں سب کو خاک کی طرح جھاڑ کے الگ پھینک دیا۔ اور حضرت مسیح سے ہزارہا سال پیشتر کے اُن پسماندگانِ سلف کو آج بیسویں صدی میں ہم دیکھتے ہیں کہ معجزنما زندگی ابدی کا جامہ پہنے ہوئے اپنے پرانے علوم کو خود ہی دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آغاز ہستی کے دنگل کے پہلوانوں میں سے آج کون باقی ہے؟ بابل والے۔ اسیریا والے۔ مصر والے۔ ایران والے۔ یونان والے۔ اور اُن کے زلہ خوار اہل روم سب مٹ گئے۔ نہ اُن کا مذہب باقی ہے نہ اُن کی معاشرت باقی ہے۔ صرف اُن کے چند علوم ہیں جو غیروں کے ہاتھ کا کھلونا ہیں۔ مگر ہندو آب حیات کے سرشار ہیں۔ ابدی ڈھائی چھونے کے شائق ہندو آج پامردی کے ساتھ خود ہی کھڑے ہوئے اپنے مذہب۔ اپنی معاشرت۔ اپنے کارناموں اور اپنی تاریخ کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اور اگر کوئی غیر اُن کے علوم کے سمجھنے میں ذرا بھی غلطی کرتا ہے تو فوراً جھڑک کے ٹوک دیتے ہیں۔ اور اپنی تاریخ و قسمت کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑتے۔

ہندوؤں کا نایاب علمی ذخیرہ کیا بلحاظ اُن کی مذہبی روایتوں کے اور کیا بلحاظ اُن کے رسم خط کے نہایت ہی قدیم ہے۔ اور جس قدر قدیم ہے اُسی قدر نادر۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ اُن کے علموں کا ایک مختصر گوشوارہ اپنے احباب کے سامنے پیش کر دیں۔ اُن کے پرانے تصانیف قریب قریب سب نظم میں ہیں جو امر کہ اُن کی قدامت کا زبردست ثبوت ہے۔ ظاہر میں لوگ سمجھتے ہیں کہ نثر نظم پر مقدم ہے۔ لیکن علمی دنیا میں یہ صحیح نہیں۔ گفتگو میں بیشک نثر کو تقدم ہے۔ مگر جذبات دلی کے ظاہر کرتے وقت انسان میں ایک ایسی متانت اور غیر معمولی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ چاہتا ہے انھیں کسی غیر معمولی وضع و عنوان سے ظاہر کرے۔ اسی

شوق نے انسان کو اُس کے بچپن ہی مین نظم کی طرف متوجہ کر دیا - جذبات و خیالات شاعرانہ کو نثر میں ادا کرنا شاعری کے بہت دنون بعد شروع ہوا - لہذا ہندوؤن مین اُن کے تمام علوم کا نظم مین ادا کیا جانا ہی اُنکی قدامت کا ثبوت ہے -

ہندوؤن کے قریب قریب تمام علوم کو مذہب نے اپنے آغوش مین لے لیا ہے یا اپنا لباس پہنا کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے - اُن کے علوم مین سب سے مقدم چارون وید ہین جو انسان مین مذہبی روح پھونکنے کے مکمل ذرائع ہین - اُن میں دعاؤن اور مناجاتون کے ذریعہ سے فلسفۂ دین اور خداشناسی کی بہت اعلی تعلیم دی گئی ہے وہ چارون وید حسب ذیل ہین (اول) رگ وید - (دوسرا) یجر وید - (تیسرا) سام وید (چوتھا) اتھروید - ان چارون ویدون کے ماتحت چار اُپ وید ہین - اور جن کے نام یہ ہین (پہلا) ایش (دوسرا) دھنش (تیسرا) گندھرب (چوتھا) ارتھ - ان چارون اُپ ویدون کے بعد اُپ انگ ہین -

چار اُپ وید جن کا ذکر آچکا ہندو مذہب میں دوسرے درجے کی مقدس و محترم کتابین ہین جن مین جراحی - طب - موسیقی - رقاصی - سپہگری - معماری اور دیگر فنون علمی کا بیان ہے - اور اُن کے دیکھنے سے انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ اُس قدیم زمانے ہی مین ہندوون نے امور معاشرت اور ضروریات زندگی کے متعلقہ فنون مین کس قدر ترقی کر لی تھی -

چھ اُپ انگ ان فنون کے بیان مین ہین جو خاص ویدون کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہین - یون کہنا چاہیے کہ ویدون کے سیکھنے اور برتنے کے آلات ہین - ان مین فن تجوید ہے جس کے ذریعہ سے ویدون کی قرأت و تلاوت کے قاعدے معلوم ہوتے ہین اُن مین الفاظ کے ادا کرنے کے لہجے - آوازون کے مخارج اور دیگر خصوصیات صوتی مذکور ہین جن کا ویدون کے پڑھنے کے وقت لحاظ رکھنا ضروری و لازمی ہے اسی سلسلہ مین نحو و صرف کا فن - آوازون کی ترتیب اور اُن کے باہمی تناسب کے قاعدے اور علوم نجوم و ہیئت بھی بصراحت بتائے گئے ہین -

ان تمام علمون اور فنون کی نسبت ہندوون کا اعتقاد ہے کہ خداوند جل علا نے اُنھین الہام کے ذریعہ سے نیک نفس و پاک باطن برہمنون کے دلون

مین اخفا کر دیا تاکہ اُن کی مدد سے دنیا وید کی ربانی تعلیمون سے فائدہ نہ اُٹھا سکتی۔

اُپ انگ کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وید انگون کے بعد اور اُن سے کم درجے کے ہین۔ لیکن اگر غور سے دیکھو تو وہ بہت ہی عظیم الشان اور اعلیٰ درجے کے علوم عقلی و روحانی پر حاوی ہین۔ اُن مین منطق ہے۔ اور الٰہیات ہین۔ یعنی وہ مسائل و رموز علم الٰہی جو ویدون کی تصریحات کی تشریح کے لیے بعد والون کے ذریعہ سے معلوم ہوے۔ احکام شریعت کا شمار بھی انھین مین ہے۔ اور اسی سلسلہ مین دیوتاؤن اور پرانے رشیون اور منیون کی کہانیان اور داستانین بھی ہین۔ ان سب ضروری کتابون کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہے اور یہی کتابین پران کہلاتی ہین جن کے ماننے سے آریہ سماج والے انکار کرتے ہین۔ لیکن چاہے اُن پر بھروسہ نہ کیا جائے مگر یہ غیر ممکن ہے کہ اُن سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ اس لیے کہ یہ تمام علوم ویدون کے حرم مین داخل ہونے کی کنجیان ہین۔ جن کو چھوڑ دیا جائے تو نہ ویدون کے مضامین سے صحیح استدلال کیا جاسکے گا اور نہ اُنکے سمجھنے پر پورا وثوق ہوسکے گا۔

مذکورہ علمی کتابون کے علاوہ ہندوون کے قدیم علمی خزانے کا زیور دو نہایت ہی معتم بالشان منظوم کتابین ہین جو مقدس روایات مین شامل کر دی گئی ہین۔ یہ دونون رامائن اور مہابھارت ہین۔ رامائن مین اجودھیا کے چندربنسی خاندان راجہ رام چندر جی کے حالات و واقعات عجیب موثر و معجز نما شاعری مین بیان کیے گئے ہین جو نہایت دلچسپ و نتیجہ خیز ہین۔ اور تاریخی قصے کے عنوان سے دینی و روحانی برکتین ظاہر کرتے ہین۔ رام چندر جی بشن جی کے ساتوین اوتار مانے جاتے ہین۔ اور اُنکی زندگی اعلیٰ ترین کمالات انسانی کا نمونہ ہے۔ مہابھارت مین وہ عظیم الشان لڑائی مذکور ہے جو ہستناپور کے تخت کے لیے پانڈو اپنے بنی اعمام کورون سے لڑے تھے۔ اور جس کی نسبت ہندوون کا عقیدہ ہے کہ دنیا مین کبھی اس سے بڑی کوئی لڑائی نہین ہوئی تھی۔ ان کتابون کے مقابلے مین یونان کے پہلے شاعر ہومر کی مثنویان ایلیڈ اور اوڈسے پیش کی جاتی ہین۔ مگر کیا بلحاظ وسعت بیان اور کیا باعتبار شاعرانہ خوبیون کے یونان کی اُن دونون پرانی منظوم کتابون

کو ہندوستان کی رامائن و مہابھارت سے کوئی نسبت نہین - مہابھارت اٹھارہ کتابون یا بابون پر منقسم ہے اور اُس مین ایک لاکھ سے زیادہ بند ہین -

اب ہندوون کی اُن چند کتابون کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے جو اُن کے مذکورہ قدیم لٹریچر سے ملحق اور اُنکے ضمیمے ہین - اول مگدھ بُدھ (یعنی حسُن علم) مصنفہٗ گوسوامی جی - یہ اصل مین سنسکرت کی بہترین گرامر ہے - جس مین قواعد صرف و نحو نہایت صفائی و توضیح سے بتلائے گئے ہین - فن لغت مین سنسکرت کی اٹھارہ کتابین مشہور ہین - مگر اُن سب سے بہتر اور مکمل "امرسنگھ" ہے -

سنسکرت کی نظمون سے عجب قسم کا سوز و گداز اور نہایت ہی شیرینی ظاہر ہوتی ہے جس کا آغاز اُن کے قدیم تر شاعر والمیکی جی سے ہوا ہے - انھون نے اپنی مشہور کتاب رامائن کے علاوہ ایک اور پُر درد واقعہ منظوم کیا ہے - وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک نوجوان اپنی تازہ آفرین معشوقہ کے ساتھ گھر بار سے دُور ایک پُر فضا دشت مین سب سے الگ تھلگ رہتا تھا - جو مار ڈالا گیا - اور اُس کی معشوقہ اُس جنگل مین اپنے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جانے والے عاشق کی لاش پر روتی پیٹتی اور آہ و زاری کرتی ہے - ظاہر ہے کہ والمیکی کے متبرک قلم نے جسے مبدأ فیاض سے الہامی مدد ملتی تھی اس حسرتناک داستان مین کیسا سوز و گداز اور کیسا دل کو تڑپا دینے والا اثر پیدا کر دیا ہوگا -

ڈراما کی ایجاد اگرچہ بہت پہلے ہو چکی تھی مگر کالی داس کی شہرت نے پُرانے سنسکرت ڈراما کو تقریباً فنا کر دیا - یورپ والے اب جو اسکے کمالات سے واقف ہوے ہین اسے مشرق کا شیکسپیر کہتے ہین - اس کا بہترین ڈراما "شکنتلا" ہے جس کا ترجمہ انگریزی مین سر ولیم جونس نے اور جرمنی زبان مین فارسٹر ہرڈر اور دیگر سنسکرت دان مصنفین جرمنی نے کیا ہے - ہرڈر کو یہ ڈراما اس قدر پسند آیا کہ کہتا ہے "اس عظیم الشان ڈراما کا ہر سین ایک چمن ہے - جس کی ہر ہر کیاری مین سے دلچسپ واقعات فطرتی طور پر خوبصورت پودھون کی طرح اُگ آتے ہین - اور اس مین کثرت سے وہ پُر اثر اور نازک خیالات ملتے ہین جن کا یونانی ڈراما مین کہین پتہ نہین - اسی کالی داس کی ایک اور نظم "میگھ دوت" ہے -

دلکنس نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا ہے اور مشرق کے شاعرانہ کمالات پر شعرائے مغرب کو حیران کر دیا ہے۔

ہندو لٹریچر کی قدر یورپ خصوصاً جرمنی مین روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ مگر ہندو لوگ محض اس غرور مین کہ یہ علوم اُن کے اور اُنکے گھر کے ہین اُس قدر توجہ نہین کرتے جیسی کہ ہونی چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہندؤن کو سنسکرت دانی کا شوق ہو چلا ہے۔ اور جا بجا اُس کے مدارس اور کالج قائم ہو رہے ہین۔ خصوصاً بنارس تعلیم سنسکرت کی اعلیٰ یونیورسٹی قرار پا گیا ہے۔ لیکن جب تک سرکاری یونیورسٹیون کا یہی طرز عمل رہے گا اور جب تک یونیورسٹی کی ڈگریان ذریعہ معیشت بنی رہین گی ابنائے وطن مین ہندو ہون یا مسلمان تحصیل علم کا سچا ذوق پیدا ہونا دشوار ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے اور بظاہر صحیح بھی نظر آتا ہے کہ ان یونیورسٹیون اور تعلیم کے موجودہ انتظامات نے ہندستان مین علم کو بڑھا دیا ہے۔ لیکن اگر غور کرو تو علم بڑھا نہین بلکہ گھٹا اور گھٹتا جاتا ہے۔ جو قوم علم کو کاسۂ گدائی بنانا چاہتی ہو اُسے علم ہرگز نہین آ سکتا۔ اگلے زمانے کا ایک متبحر ودانت یا شاستری اسی طرح مسلمانون مین ایک عالم و فاضل آج کل کے سیکڑون سند یافتہ گریجوئیٹون سے اچھا تھا۔ ویسے دو عالم اچھے اور ایسے دو ہزار زبردست علم فروش نہین اچھے۔ کاش ہندو مسلمان اپنی اپنی یونیورسٹیان قائم کرنے کے خبط کے عوض اس بات کی کوشش کرتے کہ سرکاری یونیورسٹیان علم کی سچی اکاڈیمیان بنا دی جائین۔ اور ملازمت و کسب معیشت سے انکو کوئی واسطہ نہ رہے جیسا کہ خود انگلستان مین ہے۔ مگر ابھی ہندوستانیون کو اسکی مصلحت سمجھنے کے قابل ہوش نہین آیا ہے۔ ابھی اس مسئلے کو چھیڑنا انگریزی تعلیم یافتون اور گریجوئیٹون کے حقوق مین دخل دینا ہے۔ وہ زمانہ بعد آئے گا جب ہندوستان کے تمام فرزندون کو معلوم ہوگا کہ اپنے وطن۔ اپنی قوم۔ اپنے علوم۔ اور اپنے قدیم کمالات کے حقوق چند گریجوئیٹون کے حقوق سے مقدم ہین۔

چیچک کا ٹیکہ اور لیڈی ماٹیگو

کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ چیچک کا ٹیکہ جو آج دنیا مین خدا کی ایک بڑی بھاری برکت ہے اور جس کے رواج دینے پر یورپ جسقدر فخر و ناز کرے بجا ہے در اصل ایک مشرقی علاج ہے۔ اور غالباً مسلمانون ہی سے لیا گیا ہے۔

ہم ہندوستان مین دیکھتے ہین کہ کامیابی کے اتنے تجربون کے بعد بھی اب تک یہ حال ہے کہ ٹیکہ لگائے جانے کے خوف سے مائین بچون کو چھپاتی پھرتی ہین۔ پرانے مذاق کے باپ بھائی ننھے بچون کے لیے ٹیکہ لگانے والون سے کشتیان لڑنے یا اُنھین رشوتین دینے کو تیار ہو جاتے ہین۔ بڑے بڑے مہذب لوگون کا یہ حال ہے کہ دفع الوقتی کے لیے جھوٹ فقرے بناتے ہین اور بہت سے ملکی حکیم اور وید بھی باوجود عقل رکھنے کے اپنی طرف سے تصنیف کرکر کے ٹیکے کے رواج دینے پر مختلف اور طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہین۔ اور یہ نہین پسند کرتے کہ اس لاکھون دفعہ کے آزمائے ہوے علاج سے فائدہ اُٹھایا جائے اُن کی اِس نفرت و مخالفت کو دیکھ کے جب ہم اس کا خیال کرتے ہین کہ یہ طریقۂ علاج اُنھین کے یہان سے سیکھا گیا ہے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے۔ اور تعجب آتا آتا ہے کہ اپنی ہی چیز اگر غیرون کے ہاتھ سے ملے تو وہ کس قدر اجنبی اور مہیب بن جاتی ہے؟

ٹیکے کو سب سے پہلے انگلستان کی ایک تعلیم یافتہ شریف زادی اور مہذب و دانا خاتون نے رواج دیا جس کا نام لیڈی ماٹیگو میری وٹلی تھا۔ وہ ۱۱۹ھ محمدی (۱۶۹۰ء) مین انگلستان کے علاقۂ نوٹنگھم شائر مین پیدا ہوئی تھی۔ اعلیٰ درجے کے امیر اور شریف گھرانے کی بیٹی تھی اس لیے اچھی صحبت مین نشو و نما ہوا۔ اُس کا باپ ڈیوک آف کنگسٹن روشن خیال امرائے انگلستان مین تھا جس نے بیٹی کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ اور بیٹی کو بھی علم و فضل کا ایسا شوق تھا کہ لاطینی زبان مین بہت اچھا درخور حاصل کر لیا اور بڑی نمایان ترقی کی۔

اُنیس برس کے سن کو پہونچی تو انگلستان کے ایک نامی گھرانے کے اقبالمند نوجوان اڈورڈ ورٹلی مانٹگو کے ساتھ شادی ہوگئی۔ جو پہلے ارل آف سینڈوچ کا فرزند تھا۔ چند روز مین وہ بڑا اقبال۔ آزاد اور روشن خیال ممبر ثابت ہوا۔ مشہور شاعر اڈیسن سے اُس سے بڑی دوستی تھی۔ اور انگلستان کے اعلیٰ درجے کے مدبران سلطنت مین شمار کیا جاتا تھا۔

۱۱۲۵؁ محمدی (۱۷۱۶؁ع) مین مسٹر مانٹگو قسطنطنیہ کے سفیر مقرر ہوگے دولت عثمانیہ کے دار السلطنت کو روانہ ہوے اور لیڈی میری مانٹگو نے بھی جن کی عمر اب ۲۶ برس کی تھی پیارے شوہر کے ساتھ استنبول کی راہ لی۔ جہان دونون میان بیوی کو دو سال تک رہنا پڑا۔

قسطنطنیہ مین انگلستان کے بہت سے سفیر اس سے پہلے بھی آچکے ہونگے مگر مسٹر مانٹگو نے محض اپنی بیوی کی قابلیت سے جو ناموری و شہرت حاصل کی اس سے پہلے کسی کو نہین نصیب ہوئی تھی۔ لیڈی میری یہان ترکی امرا کے خاندانون سے ملین اُنکے حالات دریافت کیے۔ اور جو کچھ واقعات معلوم ہوتے اُنھیں لکھ لکھ کے لندن مین اپنے دوستون کو بھیجا کرتین۔ یہ خطوط اسقدر دلچسپ تھے کہ لوگون نے شوق اور قدر سے جمع کیے۔ اور ہر طرف لوگون مین اُنکے پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

قیام قسطنطنیہ کے زمانے ہی مین لیڈی میری مانٹگو کو پتہ لگا کہ یہان کے بعض گانوٗن مین چیچک کے روکنے کے لیے بعض مائین اپنے بچون کے ٹیکہ لگایا کرتی ہین۔ اس نئے اور عجیب علاج کو اُنھون نے اُس گانوٗن مین جاکے دریافت کیا۔ جو عورتین اُس کا طریقہ جانتی تھین اُن سے مل کے کیفیت معلوم کی۔ اُن لڑکون کو دیکھا جن کے ٹیکہ لگایا گیا تھا۔ خوب اچھی طرح آزما لینے کے بعد خود اپنے فرزند کے ٹیکہ لگایا۔ اور دیکھا کہ وہ چیچک سے بالکل محفوظ رہا تب اُنھون نے آزمایش کے لیے اور بہت سے لڑکون کے ٹیکہ لگایا۔ اور پھر اُسے عام لوگون مین پھیلانے لگین۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی یورپ مین اُن کی کوشش سے ٹیکے کا رواج ہوگیا۔ اور لوگ اس حکمی علاج کی قدر کرنے لگے۔

سنہ ۱۱۴۷ محمدی (سنہ ۱۷۱۸ء) میں لیڈی میری اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان واپس آئیں اور مقام ٹوئی کنہم میں بود و باش اختیار کی۔ اب یہاں اُن سے انگریزی کے مشہور شاعر پوپ سے بہت راہ و رسم ہو گیا تھا۔ اور گو کہ وہ اپنے دلچسپی کے اوقات پوپ کی صحبت میں بسر کرتی تھیں مگر یہاں بھی اُنھیں شب و روز ٹیکے کے رواج دینے کی فکر رہا کرتی تھی۔

اسکے بعد خدا جانے کیا بات ہوئی کہ پوپ سے بگڑ گئی۔ اور پوپ نے باوجود ایک بلند خیال اور روشن دماغ شاعر ہونے کے جذبے میں آ کے لیڈی میری کی ہجو میں چند شعر کہ ڈالے جن میں اُن کے اخلاق پر حملہ کیا۔ اور چاہا کہ لیڈی میری کی مسلمہ ناموری۔ قابلیت۔ پاکیزگی خیال اور نیک نفسی کی شہرت کو خاک میں ملا دیں۔ مگر چونکہ اخلاقی جرأت نہ تھی اور پوپ کے دل میں خود ہی چور تھا اس لیے اُن اشعار کو گمنام طور پر شایع کیا۔ اگر کسی نے پوچھا بھی کہ یہ آپ کے اشعار ہیں تو انکار کر دیا لیکن ایسی باتیں کہیں چھپائے چھپی ہیں؟ ہر جگہ شہرت ہو گئی کہ یہ شعر اصل میں پوپ صاحب کے ہیں۔ مگر چونکہ یہ اصل و حقیقت میں اس لیے وہ اپنی طرف منسوب کرتے ڈرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے اسکے کہ لیڈی میری کے نام پر کسی قسم کا حرف آئے خود پوپ کو سخت بدنامی نصیب ہوئی۔ عام لوگوں نے اُنکی اس حرکت کو ناپسند کیا اور اُلٹے اُنھیں کو ذلیل و کمینہ سمجھنے لگے۔

اب سنہ ۱۱۶۸ محمدی (سنہ ۱۷۳۹ء) شروع ہوا۔ اور لیڈی میری کا سن ۴۹ سال کا تھا۔ طبیعت ناساز رہنے لگی۔ اور معلوم ہوا کہ انگلستان کی آب و ہوا موافق نہیں ہے۔ تبدیل آب و ہوا کے لیے اٹلی کا سفر کیا۔ وہاں شہر وینس میں جا کے اقامت گزین ہوئیں۔ اور صحت برقرار رکھنے کے لئے اس طرح پاؤں توڑ کے بیٹھیں کہ ۲۲ سال وہیں گذر گئے۔ سنہ ۱۱۶۸ محمدی میں گئی تھیں اور ۱۱۹۰ محمدی (سنہ ۱۷۶۱ء) میں ۷۱ برس کی بوڑھی اور واجب التعظیم خاتون بن کے پھر انگلستان میں آئیں۔ اس لیے کہ اُنکی صاحبزادی لیڈی بیوٹ نے تاکید سے بلا یا تھا۔ مگر عمر پوری ہو چکی تھی۔ تندرستی نے جواب دے دیا۔ اور وطن میں آ کے

شاید پورے ایک برس بھی نہ رہی ہوں گی کہ سنہ ۱۱۹۱ محمدی (سنہ ۱۷۶۲ء) میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور ناموری و نیکوکاری کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوا کے دوسرے عالم باقی میں جا پہونچیں۔

مگر دنیا میں اُن کی دو نہایت ہی قابل قدر یادگاریں ہمیشہ باقی رہیں گی۔ جن میں سے ایک بھی کسی کو حاصل ہو تو اُس کی ناموری و برکت کے زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ ایک تو چیچک کا ٹیکہ جس سے اب ساری دنیا نفع اُٹھا رہی ہے۔ اور ہندوستان ہی نہیں دنیا کے ہر ایک میں شہروں اور گاؤں کے اندر لیڈی میری کی یہ یادگار اپنی برکتوں سے نوع انسانی کو نفع پہونچا رہی ہے۔

اور دوسری یادگار اُن کے وہ خطوط ہیں جو اُنھوں نے قسطنطنیہ سے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ انگلستان کے لوگوں میں اُن کے مطالعہ کا شوق اس قدر بڑھا کہ اُن کی وفات کے دوسرے ہی سال یعنی سنہ ۱۱۹۲ محمدی میں وہ تین جلدوں میں مرتب و مدون ہو کے چھپے اور شائع ہوئے۔ چند روز بعد لوگوں کو کچھ اور خطوط ملے اور چوتھی جلد بھی مرتب ہو کے شائع ہو گئی۔ ان خطوط کی زبان ایسی دلکش اور شیریں تھی کہ بہت ہی پسند کیے گئے خصوصاً اسلیے کہ ترکوں کے قومی خصائص معلوم ہونے کا یورپ میں جس قدر شوق تھا اُسی قدر حالات سے لاعلمی تھی۔ لیڈی میری سے پہلے کسی نے ایسی تفصیل و تحقیق سے آل عثمان کے حالات نہیں بتائے تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ترکوں کے حالات میں جو پہلی کتاب انگلستان میں شایع ہوئی یہی تھی۔

لوگوں نے اس کتاب کے لیے اس کثرت سے شوق کے ہاتھ پھیلائے کہ پہلا ایڈیشن چند ہی روز میں ختم ہو گیا۔ دوبارہ چھپی اور تھوڑے زمانے میں فروخت ہو گئی۔ غرض برابر ایڈیشن پر ایڈیشن شایع ہوتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۲۳۲ محمدی (سنہ ۱۸۰۳ء) میں یعنی لیڈی میری کی وفات کے ۴۱ برس بعد اُن کے صاحبزادے نے از سر نو درست اور مرتب کر کے اُن خطوط کی چاروں جلدوں اور اپنی ماں کی دیگر قابل قدر تصانیف کا ایک نیا اعلیٰ درجے کا ایڈیشن شایع کیا۔

لیڈی میری کے صاحبزادے ایڈورڈ ورٹلی مانٹیگو کی نسبت کہتے ہیں کہ دماغ بگڑا ہوا تھا۔ امارت اور گھر کی فارغ البالی پسند نہ تھی۔ جب دل میں آتی گھر سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور کسی ایسے کام کو اختیار کر لیتے جو اُن کی حالت و حیثیت سے بہت ہی گرا ہوا ہوتا۔ دوسرا کمال اُن میں یہ تھا کہ سچ سے نفرت تھی۔ غلط اور بے بنیاد واقعات کو اس طرح شوکتِ الفاظ سے بیان کرتے اور ایسے لقلقے باندھ دیتے کہ سننے والے کو سچ کا یقین آ جاتا۔ اس میں اس قدر ملکہ بڑھا ہوا تھا کہ فی البدیہہ قصے پر قصے دل سے بنا کے بیان کرتے چلے جاتے اور کیا مجال کہ سلسلہ ٹوٹ جائے۔ مگر بھاگنا قیامت تھا۔

پہلی بار بھاگے تو گھر والوں کو ملنے سے یاس ہو گئی۔ چند روز بعد پتہ لگا کہ آپ ایک چمنی سوئیپ کے نوکر ہیں۔ انگلستان کے ہر مکان بلکہ ہر کمرے میں آتش خانہ بنا ہوتا ہے۔ اُس میں سے دھواں نکلنے کے لیے جو نل دیوار کے اندر ہی اندر اوپر تک چلا جاتا ہے اُسے چمنی کہتے ہیں۔ اس چمنی میں دو چار مہینے میں اتنا کاجل جمع ہو جاتا ہے کہ نہ نکالا جائے تو راستہ بند ہو جائے۔ اس لیے وہاں بہت سے لوگ چمنی سوئیپر یعنی چمنیوں میں سے کاجل جھاڑنے کا کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے کپڑوں میں چونکہ ہمیشہ کاجل بھرا رہتا ہے اس لیے حد سے زیادہ میلے کچیلے رہتے ہیں۔ اور انگلستان میں جو شخص جتنا زیادہ میلا ہو اُسی قدر زیادہ ذلیل و حقیر تصور کیا جاتا ہے۔ غرض چمنی سوئیپروں سے زیادہ ذلیل اُس سرزمین میں کوئی نہیں ہوتا۔ مگر آپ کو جوشِ خاکساری میں یہی پیشہ سب سے زیادہ پسند آیا۔

لوگوں کو معلوم ہوا تو سمجھا بجھا کے گھر میں لے آئے۔ لیکن چند روز بعد پھر رو چکر ہو گئے۔ ابکی خبر لگی کہ ایک مچھلی والے کے شاگرد ہیں۔ اور اُس کے ساتھ کشتی میں بیٹھے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ لوگ گھبرا کے پھر لائے۔ مگر تھوڑے زمانہ کے بعد پھر چمپت ہو گئے۔ ابکی شاید ان کے مطبوعہ خطوط کا اثر تھا کہ قسطنطنیہ میں آ کے ترکوں کی طرح رہنے لگے۔ اُنھیں کی وضع اختیار کر لی۔ اُنھیں کے سے کپڑے علانیہ پہننا شروع کیے۔ اُنھیں کی سی ٹوپی اور بھاری دستار سر پر تھی۔ اور چونکہ آنکی

پوری پوری معاشرت اختیار کر لی تھی اس لیے ہمیں امید ہے کہ تثلیث سے توبہ کر کے مسلمان بھی ہو گئے ہوں گے۔ لہذا ہم اُن کے حق میں دعاے مغفرت کر کے سلسلہ بیان کو ختم کرتے ہیں۔

عربی رسمِ خط

۶ نومبر ۱۹۱۴ء کے ہمدرد میں بیت المقدس سے خواجہ کمال الدین صاحب کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں جناب موصوف خط نسخ کی تاریخ کے متعلق مسلمانوں کی تحقیق معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس مسئلے پر کسی حد تک غور کیا ہے اور جا بجا کچھ لکھا بھی ہے۔ اگرچہ اس وقت میرے پاس کافی کتبخانہ نہیں موجود ہے۔ تاہم جس نتیجے کو میں پہونچا ہوں اُسے بکمال ادب خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیے دیتا ہوں۔

ہمارے پیغمبر علیہ السلام ہی اُمّی نہ تھے بلکہ ساری قوم عرب اُمّی تھی جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے "بَعَثَ فِی الاُمِّیّٖنَ رَسُولاً"۔ قدیم الایام میں ارض یمن میں ایک خط مروج تھا جو جدا جدا حرفوں میں لکھا جاتا۔ اور سواے اُمرا و شرفاے قوم کے کسی عامی کو نہ بتایا جاتا۔ اس علمی بخل کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب نیرِ اسلام چمکا ہے اُس خط کا جاننے والا دنیا میں کوئی نہ تھا۔

ولادت سرورِ کائنات علیہ السلام کے قریب ہی ابو سفیان کے والد حرب بن اُمیہ ارض حیرہ سے ایک خط سیکھ آئے اور دو چار دوستوں اور عزیزوں کو بھی سکھا دیا۔ خود حرب کا بیان تھا کہ میں نے اس خط کو حیرہ کے ایک شخص اسلم بن سدرہ سے سیکھا۔ اور وہ علاقۂ انبار کے ایک شخص مرامر بن مرہ کا شاگرد تھا اور چونکہ مرامر کا کوئی اُستاد نہیں معلوم تھا اس لیے قریش میں خیال پھیل گیا کہ اس خط کا پہلا موجد مرامر ہے۔ اور ارض انبار اُس کا مولد ہے (ملاحظہ ہو ابن خلکان۔ حالات علی بن ہلال المعروف بہ ابن بواب کاتب)

غرض یہی عربی کی پہلی تحریر اور ہمارے موجودہ خط نسخ کا نقش اولین ہے۔ اسی میں قرآن مجید لکھا گیا۔ اسی میں آن حضرت صلعم کے خطوط و معاہدات لکھے گئے

اور اسی مین صحابہ مراسلت کرتے تھے مگر اپنی ابتدائی حالت مین یہ خط اس قدر ناقص تھا کہ جس قدر رواج پاتا تھا اُسی قدر زیادہ اُس مین اصلاحون اور ترمیمون کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی تھی - اور یقیناً بہت سی اصلاحین ہوئی ہونگی جن کی ہمین خبر نہین ہے -

اس عہد کے نمونے ہمارے ہاتھ مین بہت ہی کم ہین جن سے کچھ اندازہ کیا جائے - آنحضرت نے جو خطوط لکھوا کے بھیجے تھے اُن مین سے دو خط اہل یورپ نے خدا جانے کیونکر اور کہان سے برآمد کرکے پیش کیے ہین اور دعوٰے کیا جاتا ہے کہ وہ اصلی خط ہین - ان دونون کے فوٹو ہین نے دیکھے ہین ایک مسیلمۂ کذاب کے نام ہے ۱۸۹۶ء مین لندن کے پکچر میگزین نام ایک رسالہ مین چھپا تھا - مین نے اُس کا ورق نکال کے اُس کی پلیٹ بنوالی ہے جو میرے پاس احتیاط سے رکھی ہے گو ابھی تک چھپوانے کی نوبت نہین آئی - دوسرا خط فرمان رواے مصر مقوقس کے نام ہے جس کا فوٹو ہیروز آف دی نیشن سیریز کی کتاب "محمدؐ" مصنفۂ ڈی - اس - مارگو لیوتھ مین مصر کے رسالہ الہلال سے لے کے درج کیا گیا ہے -

ان دونون خطون کی تحریر ایک ہی زمانے - ایک ہی وضع - اور ایک ہی شان کی ہے - اور دونون کے نیچے آپ کی مُہر ہے - خطوط کی عبارت کے الفاظ بھی وہی ہین جو احادیث مین صحیح روایات سے مروی ہین - بہرحال انکو دیکھ کے یقین ہوتا ہے کہ اصلی تحریرین ہین - اور یہی میرا خیال ہے - چنانچہ مین ان خطون کے فوٹوون کو تمام اگلے تبرکات سے زیادہ واجب التعظیم اور حرز جان بنانے کے قابل خیال کرتا ہون - اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ہم اُن مبارک نامہ ہاے رسالت کا جن پر آپ کی مُہر مبارک ثبت ہے اور اُنکی پیچ کا پتہ لگانے کہ کیونکر محفوظ رہے - کہان سے کہان پہونچے - کس سے کس کو ملے - اور آخر مین کیونکر اہل یورپ کے ہاتھ آئے ؟

ان خطوط کے بعد کی تحریر کا نمونہ حضرت عثمان ذی النورینؓ کے عہد کے قرآن پاک ہو سکتے ہین - جن کا کوئی نسخہ اسوقت تک کسی ہندوستانی مسلمان کی نظر سے

نہین گذرا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن مین کا ایک قرآن قسطنطنیہ مین موجود ہے۔ اگر خواجہ صاحب کسی تدبیر سے اُس کی زیارت سے شرفیاب ہو کے اُسکے کسی صفحے کا فوٹو حاصل کرین اور اُسے شایع کردین تو مسلمانون پر بڑا احسان کرین۔

مذکورہ بالا دونون خطوط رسالت کی تحریر کی شان یہ ہے کہ نہ نقطے ہین نہ اعراب ہین نہ علامات اوقاف ہین۔ الف سیدھی لکیر نہین بلکہ نیچے کا سرا پیچھے مڑا ہوا ہے جس سے اُسکی قطع "ا" کی سی ہے۔ عظیم کا لفظ یون لکھا ہے "عطىم" القبط کی صورت یہ ہے "العىط"۔ سلام کی وضع تحریر یہ ہے "سلم" الہدی کی صورت یہ ہے "الهد"۔ من کی صورت "مں" اور بعضاً بعضاً کو "ٮعصا ٮعصا" معلوم ہوتا ہے کہ نصب کے ساتھ تنوین مین ایک الف جو موجودہ رسم خط مین بڑھا دیا جاتا ہے یہ اُسی زمانے کا ہے۔ اشہدوا کی صورت "اسهدوا" ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جمع کے آخر کا الف بھی اُسی زمانے کا ہے۔ اس کی پابندی نہین ہے کہ لفظ سطر ہی مین ختم ہو جائے۔ "ورسولہ" مین سے "ور" ایک سطر کے آخر مین ہے اور "سولہ" دوسری سطر کے شروع مین۔ "تولوا" مین سے "ت" ایک سطر مین ہے اور "ولوا" دوسری سطر مین۔ "مسلمون" مین سے "مس" ایک سطر کے آخر مین ہے اور "لمون" دوسری سطر کے شروع مین۔

خلفاے راشدین کے عہد مین اس خط مین کسی نمایان تغیر کا پتہ نہین چلتا۔ سب سے پہلے اس تحریر کے نقصان پر ابو الاسود دوئلی کی نظر پڑی جن کا حال مین نے مئی اور جون سنہ ۱۹۱۳ء کے دلگداز مین لکھا ہے۔ انھین نے رسم خط کی اصلاح کی اور انھین نے ابتدائی قواعد نحو عرب کو بھی مدون کیا۔

زیاد نے حکومت بصرہ کے زمانے مین اُن سے خواہش کی تھی کہ قرآن کے رسم خط کی اصلاح کیجیے مگر انھون نے غالباً قرآن کے متعلق سنت قدیم مین دخل دینا بدعت خیال کر کے انکار کر دیا۔ لیکن ایک دن ایک قاری کو قرآن کو إِنَّ اللّٰهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ مین رَسُولُهُ کو رَسُولِهِ پڑھتے سُن کے ایسے گھبرائے کہ زیاد کے پاس دوڑے گئے۔ اور کہا "اب مین آپکا

کی خواہش پوری کرنے کو موجود ہوں " پھر اُس سے ایک کاتب لیا - اور اُسے پاس بٹھا کے ہدایت کی کہ میں قرآن کو لکھواتا ہوں - جس حرف کے ادا کرنے میں میں اپنا منہ کھول دیا کروں اُس کے اوپر تم ایک نقطہ لگا دیا کرو - جس حرف کو میں منہ کو گول کر کے ادا کیا کروں تم اُس کے آگے ایک نقطہ لگا دیا کرو - جس حرف کے ادا کرنے میں آواز کا رخ نیچے کی طرف ہو تم اُسکے نیچے نقطہ دیا کرو - غرض قرآن میں پہلے پہل یہ اعراب لگائے گئے - جن کی صورت ابتدائی ایجاد میں بجائے ترچھی لکیروں کے نقطوں کی سی تھی - اور پیش بجائے حرف کے اوپر کے سامنے لگایا جاتا تھا - آج کل جو نقطے ب ت ث اور ث میں یا ج - ح - خ کا امتیاز پیدا کرتے ہیں اُن کا اُسوقت تک مطلقاً پتہ نہ تھا - اور نہ شاید اُن کی ضرورت محسوس ہوتی تھی -

ابو الاسود دوئلی نے سنہ ۶۹ھ میں انتقال کیا - اُسکے بعد کہتے ہیں کہ میمون بن اقرن نے پھر عنبسہ بن معدان فہری نے پھر عبداللہ بن ابی اسحٰق حضرمی نے - پھر ابو عمرو بن علاء المتوفی سنہ ۱۵۴ھ نے اس خط میں اور اصلاحیں کیں - مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا اصلاحیں تھیں - یہاں تک کہ خلیل بن احمد ازدی المتوفی سنہ ۱۷۰ھ اور علی بن حمزہ کسائی المتوفی سنہ ۱۸۳ھ کا زمانہ آیا جبکہ کوفے اور بصرے میں نحو و صرف اور علم زبان کا شباب تھا - کہتے ہیں کہ خلیل نے ترقی خط کی طرف بہت توجہ کی اور اس درجے کو پہونچا دیا کہ کسائی نے جو مامون رشید کا اُستاد اور علمی ترقیوں کا سچا شایق تھا خط عربی میں ایک نئی شان پیدا کی جسکو اہل کوفہ نے بے انتہا پسند کیا - اور وہی خط خط کوفی کے نام سے مشہور ہوا (ملاحظہ ہوں کتاب الفہرس ابن الندیم - ابن خلکان حالات ابن مقلہ کاتب - و ابن البواب کاتب - اور آغانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۶ حالات ابو الاسود دوئلی) اس کو میں نہ مانوں گا کہ کسائی نے یک بیک پرانے خط کو بدل کے خط کوفی کر دیا - دراصل مسلسل تغیروں اور ترمیموں نے رفتہ رفتہ خود ہی اس خط کی یہ صورت بنا دی تھی - کسائی نے قواعد نقاشی و خوشنویسی کو کام میں لا کے قوم کی تحریر کی ایک خاص شان پیدا کر دی - جسے لوگوں نے عموماً پسند کیا اور اُسی

انہی کی پیروی کرنے لگے۔

تاہم اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خط کوفی کی ایجاد ۱۸۲ھ کے قریب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے جو خط مروج تھا کوفی نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک کوفے کو کوئی علمی حیثیت ہی نہیں حاصل ہوئی تھی۔ حضرت علیؓ نے کوفے کی سکونت اختیار کی۔ اور اسی وجہ سے اکثر عوام میں مشہور ہے کہ حضرت علیؓ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن خط کوفی میں تھے۔ مگر انھیں اس کی خبر نہیں کہ اُن دنوں کوفہ تو بیشک تھا اور کوفہ میں حضرت علیؓ بھی تھے۔ مگر خط کوفی نہ تھا جس کا کاتب حضرت علیؓ کو فرض کر لیا گیا ہے۔ خط کوفی کا دَور دوسری صدی ہجری کے آخر سے شروع ہوا ہے۔ جبکہ ہارون رشید کا زمانہ تھا۔

مامون کے زمانے کی ایک فردِ حساب کا فوٹو میں نے مدت ہوئی مولانا شبلی کے پاس دیکھا تھا۔ جس کی اصل یورپ کے کسی کتب خانے میں موجود ہے۔ گو اس وقت پوری تفصیل سے اُسکے حرفوں کی شکلیں یاد نہیں ہیں۔ مگر اجمالی نظر ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نہایت ہی پختہ اور پاکیزہ خط ہے۔ اور خط کوفی کی گھسیٹ ہے۔

اب مجھے یہ بتانا ہے کہ خط کوفی میں اور پُرانے خطوں میں کیا فرق تھا۔ میں نے خط کوفی کا کوئی مکمل قرآن نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ہیروز آف دی نیشن سیریز کی کتاب "محمدؐ" مصنفہ ڈی۔ ایس۔ مارگولیوتھ میں خط کوفی کے ایک قرآن کے ایک صفحے کا فوٹو موجود ہے۔ اصل نسخہ بوڈلین لائبریری کا ہے اور معلوم نہیں کہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں الف کی قطع "ا" د کی قطع "ڪ" ن کی قطع "ل" ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خط خوبصورت اور زیادہ واضح و روشن ہو گیا ہے مگر اُسی پُرانے خط سے ملتا ہوا ہے۔ صرف پختگی اور ایک مصورانہ مناسبت و ہم وضعی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ اس کوفی خط کے قرآن میں اعراب کا کہیں پتہ نہیں۔ نہ نقطے ہی ہیں اور نہ ترچھی لکیریں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابوالاسود کی ایجاد کا عام طور پر رواج نہیں ہوا تھا خاص ہی خاص نسخہ ہائے قرآن میں اُن کے رسم خط کی پابندی کی جاتی ہوگی مگر عام کاتب

اُن کا لحاظ نہ کرتے تھے۔

اس خط کوفی میں سب سے بڑی مفید ترقی یہ ہوئی ہے کہ موجودہ نقطوں کی بنا پڑ گئی۔ جن سے اُن تمام مختلف الصوت حرفوں میں امتیاز کر لیا جا سکتا ہے جو ہمشکل ہیں۔ مگر خط کوفی کے نقطے ہمارے موجودہ خط نسخ کے نقطے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی جگہ نیچے اوپر باریک ترچھی لکیریں زیر زبر کی سی اختیار کی گئی ہیں۔ مثلاً یا ایھا المزمل قم اللیل کو "یاٖیھا ما لموَمل قمٖ ا للیل" کی وضع میں لکھا ہے۔ اس سے بیشک یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب ب ت ث اور اسی طرح کے دیگر حروف میں امتیاز کی ضرورت محسوس ہوئی تو بجائے نقطوں کے ترچھی باریک لکیریں اختیار کی گئیں۔ اور نقطوں سے جو ابوالاسود نے ابتداءً اعراب و حرکات بنانے کا کام لیا تھا وہ خاص خاص قرآنوں میں تھے۔ عام تحریروں اور کتابوں میں انکی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔

اب اس وقت سے کچھ کم ڈیڑھ سو برس تک خط کوفی کا زمانہ رہا۔ مگر زمانہ جو جو گذرتا جاتا تھا اس خط میں بھی کچھ نہ کچھ تغیر اور ردوبدل کرتا جاتا تھا۔ خط کوفی جیسا کہ ہمیں نظر آتا ہے زود نویسی کے لیے موزون نہ تھا۔ چنانچہ ۲۷۲ھ میں زمانے نے ابوعلی محمد بن علی بن حسین کاتب کو جو "ابن مقلہ" کے لقب سے مشہور ہے پیدا کیا۔ یہ بہت بڑا شخص تھا۔ اور اگرچہ اس کی زندگی اسقدر پُر آشوب تھی کہ ترقی کی تو خلافت بغداد کا وزیر اعظم بن گیا۔ اور اقبال نے ساتھ چھوڑا تو ہاتھ کاٹا گیا۔ زبان کاٹی گئی۔ قید ہوا۔ اور خدا جانے کیسی کیسی مصیبتیں جھیل کے ۳۲۸ھ میں چھپن برس کی عمر میں قید خانے ہی کے اندر مرا۔ لیکن نا قدردان دشمن اُس کی جان لے سکتے تھے اُس کے کمالات کا مٹانا غیر ممکن تھا۔

دیگر کمالات کے علاوہ ابن مقلہ خوشنویسی اور خط نسخ کی اصلاح میں بھی کمال رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے مروجہ خط کوفی کو تقویم پارینہ کر کے موجودہ خط نسخ ایجاد کیا۔ (ملاحظہ ہو ابن خلکان حالات ابن مقلہ کاتب) اس نئے خط میں اعراب و حرکات کے اظہار کے واسطے ابوالاسود دوئلی کے نقطوں کو موقوف کر کے زیر۔ زبر کے لیے حرف کے اوپر اور نیچے ترچھی لکیریں اور پیش۔ جزم۔ تشدید

دو زبر اور دو زیر کی موجودہ شکلین اختیار کی گئین۔ تشدید۔ حرفون کے باہمی امتیاز کے لیے خط کوفی کی باریک ترچھی لکیرون کو چھوڑ کے نقطے قائم کیے گئے۔ اور تمام حرفون کی صورتون مین مقبول عام خوشنمائی، سادگی اور آسانی پیدا ہو گئی۔ خلاصہ یہ کہ ہمارا موجودہ خط نسخ ابن مقلہ کا ایجاد ہے۔ ابن مقلہ کے اس خط کی یہ شان اس قدر پسندیدہ ثابت ہوئی کہ ساری کتابت اسی مین ہونے لگی۔ اور بیچارہ خط کوفی ایسا مٹا کہ آج اُس کا لکھنا درکنار دنیاے اسلام مین اُس کا کوئی پڑھنے والا بھی نہین ہے۔

ابن مقلہ کے کچھ کم ایک صدی بعد ابن بوّاب کاتب پیدا ہوا جس نے اپنی مشہور عام خوشنویسی سے خط نسخ کو انتہاے کمال کے درجے کو پہونچا دیا۔ ابن بوّاب کا نام ابو الحسن علی بن ہلال تھا۔ مگر چونکہ ایک دربان کا بیٹا تھا اس لیے "ابن البوّاب" کے لقب سے مشہور رہا۔ علامہ خلکان اُس کی نسبت لکھتے ہین "اگلون پچھلون مین سے کوئی شخص اُس کے مثل کتابت نہین کر سکا۔ خط کوفی سے بدل کے موجودہ خط کو ایجاد تو ابو علی بن مقلہ نے کیا تھا لیکن ابن بوّاب نے اس کی شان کتابت شایستہ، مہذب اور خوشنما بنا دی۔ اور تمام لوگون کو اتفاق ہے کہ اس بارۂ خاص مین وہ منفرد اور بے نظیر تھا۔" ابن بواب نے سنہ ۴۱۳ھ یا سنہ ۴۲۳ھ مین انتقال کیا۔ اور خط نسخ مین ایسی شان پیدا کر کے چھوڑ گیا جس کی لوگ آج تک پیروی کر رہے ہین۔

اس مسئلے پر اس قدر تحقیق کرنے کے بعد اب مین خواجہ صاحب کے سوالات کا جواب دیتا ہون۔

(۱) ۸ نومبر کے زمیندار مین ایک واقف کار صاحب نے بتا دیا ہے کہ مولوی خدا بخش خان کے کتب خانۂ بانکی پور مین حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھ کے لکھے ہوے قرآن مجید موجود ہین۔ مجھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہان حضرت عثمان کے ہاتھ کا تو کوئی قرآن نہین ہے ہان حضرت علی کے ہاتھ کے چند پارے بتائے جاتے ہین۔ مگر جب تک کوئی خط عرب کی تاریخ جاننے والا اُن پر تنقیدی نظر ڈال کے نہ بتائے اعتبار نہین کیا جا سکتا۔ تاہم اس عہد کا

کوئی قرآن مل جائے تو ہم کو اس مسئلہ میں صحیح نتیجے تک پہونچنے میں بہت کامیابی ہو سکتی ہے۔

(۲) آپ کی تحقیق کے اس حصے سے مجھے اتفاق نہیں کہ سیدنا عثمان رضؓ کا مصحف خط کوفی میں تھا۔ اس لیے کہ خط کوفی اُس زمانے کے تقریباً ڈیڑھ صدی بعد ایجاد ہوا ہے۔ لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اُس میں حرکات و سکنات نہ تھے۔

(۳) اس دفعہ کے مضمون (الف) کے متعلق عرض ہے کہ خط نسخ کی تاریخ میں نے اوپر تفصیل سے بتا دی ہے جس سے تمام استفسارات کا جواب مل سکتا ہے۔ مگر اتنا اور عرض کرنا ہے کہ میں نے کبھی کوئی قرآن خط نسخ اور خط کوفی میں ملا جُلا نہیں دیکھا۔ لیکن ابن مقلہ کے ظہور سے چند روز پیشتر جو قرآن لکھے گئے ہونگے وہ یقیناً ایسے ہی خط میں ہوں گے جن کی شان خط کوفی اور موجودہ نسخ سے ملی جُلی ہوگی۔

ضمن (ب) کے متعلق عرض ہے کہ نقطوں کا آغاز خط کوفی میں یا اُس سے سامنے تر پچھے خطوط کی وضع میں ہوا جو خطوط ابن مقلہ کے زمانے میں نقطے پر بھی تھے۔ نون سے پیشتر بادی النظر میں حروف منقوط و غیر منقوط یا ایک بت علیش کا ناچ اُسکے والے حرفوں میں مابہ الامتیاز کوئی علامت نہ تھی ے ظاہر ہوتا ہے۔ یہودیوں اسکا کی مناسبت سے اُن کا امتیاز کیا جاتا تھا۔ ارض جلیل کے یہودی بادشاہ ہیرودیس نے امتیاز بغیر کسی علامت کے کر لیا کہ آخاندان کی ایک حسین لڑکی ناچی۔ ناچ کے سے پہلے کے پُرانے خط میں نہ بنایا۔ اور جب اُس نے بے اختیار ہو کے کہا "مانگ" اوپر بیان کر آیا ہوں نیچے سنگدل حسینہ نے بجائے زر و جواہر یا کسی اور چیز کے "ق" اور "ب" کی "دینے والے یوحنا کا سر مانگا۔ اور لے کے دم لیا۔

ضمن (ج) نے بھی قدیم الایام میں ناچنے کو ایک ایسا فن قرار دیا جس کے وسکنات کا استعمال جذبات میں قوت آ جائے۔ ہومر شاعر کے بیان سے معلوم وسکنات کے لیے امن اور تکلف کی صحبتوں میں ناچ ہوا کرتا تھا۔ اور ارسطاطالیس کے اظہار کے لیے امر میں شامل کر دیا ہے۔ یونان میں اہل اتھنیہ کے مقابل اسپارٹا کی تھی۔ جو باعتبار مزاج اور دنیوی عیش و طرب سے متنفر تھی۔ گ۔۔۔ اہل

نقطون سے اور حرکات کے سمجھنے کے لیے ترچھے خطون وغیرہ سے کام لینے کا آغاز ابن مقلہ کے زمانے سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر مین خیال کرتا ہون کہ اس سے پیشتر ہی کاتبون کا رجحان اس ترمیم و تہذیب کی طرف ہونے لگا ہوگا۔ ابن مقلہ نے اُسے اختیار کرکے اس قدر رواج دیدیا کہ سب نے یہی طرز تحریر اختیار کرلیا۔

ضمن (د) بے شک قدیم کتابت مین "ذلک" اور "جنت" کے ایسے ایسے لفظون مین الف نہین لکھا جاتا تھا۔ اور نہ اُس کے امتیاز کے لیے کوئی علامت تھی۔ مذ[illegible]رہ صحف رسالت مین الفاظ "رحمان" اور "یا اہل" بغیر الف کے صرف کھڑے زیر سے یعنی "رحمٰن" اور "یا ھل" کی صورت مین لکھے گئے ہین اُن دونون "حرث" اور "حارث" کے نامون مین امتیاز دشوار تھا۔ اس لیے کہ دونون نام "حرث" کی صورت مین لکھے جاتے تھے۔ اب بھی اکثر حارث کا لفظ "حرث" لکھا جاتا ہے۔

اسی طرح دیگر سوالات کا جواب بھی اس مضمون کے ابتدائی مباحث سے [illegible] لیا جا سکتا ہے۔

رقص

انسان کے اُن فطری جذبات مین سے ہے
ایجاد ہوگئے۔ ناچ کی نسبت نہ کسی کو
۔ اور نہ اُس کے ابتدائی ظہور کے
باوجود اس کے انکار نہین
سے شایستہ اور وحشی سے
۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ
ناع و حرکات کو الفاظ
انی حرکات کو زیادہ دخل
در رکھا گیا ہے۔
ب نے ایک دلکش نے

پیدا کی تو رقص نے اُس میں اور لطف پیدا کر دیا۔ اور اسی کی مناسبت سے رقص نے پہلے پہل ایک با قاعدہ فن کی حیثیت حاصل کر لی۔

تاریخ عالم میں سب سے پُرانی تاریخ بنی اسرائیل کی ہے۔ اور انھیں کے معاصر بلکہ اُن سے بھی ترقی میں سبقت رکھنے والے مصری اور بابلی ہیں۔ ان تینوں پُرانی متمدن قوموں میں ناچنا عبادات میں داخل تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ رقص کو عبادت سے خاص علاقہ ہے۔ عبادت کرتے وقت انسان اپنے معبود کے سامنے یا تو ایسے حرکات کرتا ہے جو اظہار عبودیت کے ہیں۔ یا صرف چہرے ہی کو اظہارِ خشوع و خضوع کے لیے ملتجیانہ اور عاجزانہ بناتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں اصولاً رقص میں داخل ہیں۔

اہل بابل اور قبطی دونوں عبادت میں ناچتے تھے۔ بنی اسرائیل کی عبادت میں ناچنے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ توراۃ میں ہے "اُنھیں اُس (خدا) کے نام کی حمد کرنے اور ناچنے دو"۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "داؤد علیہ السلام خدا کے سامنے ناچے"۔ اسی طرح قدیم الایام ہی میں محفل عیش و طرب کا ناچنا بھی تینوں مذکورہ قدیم قوموں میں موجود تھا۔ اسیریا و مصر کی صحبت عیش کا ناچ اُنکے منہدم محلوں کے در و دیوار کے نقش و نگار سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہود میں اسکا ثبوت اس قصے سے بخوبی مل سکتا ہے کہ ارض جلیل کے یہودی بادشاہ ہیرودونطی پاس کے سامنے ہیرودیا نام اُسکے خاندان کی ایک حسین لڑکی ناچی۔ ناچ کے اُسے رجھایا اور اپنا فریفتہ بنایا۔ اور جب اُس نے بے اختیار ہو کے کہا "مانگ کیا مانگتی ہے؟" تو اُس سنگدل حسینہ نے بجائے زر و جواہر یا کسی اور چیز کے حضرت عیسیٰؑ کو بپتسما دینے والے یوحنا کا سر مانگا۔ اور لے کے دم لیا۔

یونانیوں نے بھی قدیم الایام میں ناچنے کو ایک ایسا فن قرار دیا جس کے ذریعے سے اظہار جذبات میں قوت آ جائے۔ ہومر شاعر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریبوں اور تکلف کی صحبتوں میں ناچ ہوا کرتا تھا۔ اور ارسطاطالیس نے رقص کو فن شعر میں شامل کر دیا ہے۔ یونان میں اہل اثینیہ کے مقابل اسپارٹا والے زیادہ خشک مزاج اور دنیوی عیش و طرب سے متنفر تھے۔ مگر ...

فن کو اس قدر ضروری خیال کرتے تھے کہ اپنے بچوں کو پانچ ہی برس کی عمر سے رقص کی تعلیم پر مجبور کرد یا کرتے تھے۔ لوگ ان بچوں کو دیکھنے نکلتے۔ اور وہ بھجنیں گا گا کے ناچتے۔ اہل اسپارٹا میں "فریک رقص" کے نام سے ایک فوجی ناچ مروج تھا۔ اُن کے نوجوان اُس رقص میں کمال دکھاتے اور معلوم ہوتا کہ قواعد کے طریقے سے ایک فرضی جنگ ہو رہی ہے۔

قدما میں تین طرح کے ناچ تھے۔ اول فوجی ناچ جس میں سپہگری کی مشق کرنا اور اپنے آپ کو ایک اعلیٰ درجہ کا بہادر سپاہی بنانا مقصود ہوتا۔ اور نیز یہ غرض ہوتی کہ جسم خوب تیار ہو سڈول اور پھرتیلا ہو جائے اور اس میں طاقت آئے یہ ناچ دراصل ایک قسم کی ورزش تھی۔ دوسرا معاشرتی ناچ۔ یہ محض دلچسپی اور تفریح کے لیے اور قومی تقریبوں میں دلبستگی پیدا کرنے کے لیے ہوتا۔ تیسرا ایک اور ناچ ان دونوں کے بین بین ہوتا تھا جو گناہ کا کفارہ ادا کرنے اور چڑھاوا چڑھانے کے وقت عبادت کی حیثیت سے عمل میں آتا۔

قدیم مسیحیوں کے رقص کا اگرچہ انجیل میں کہیں تذکرہ نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اپنے مذہبی مجمعوں میں وہ لوگ بھی ناچا کرتے تھے۔ اسلام سے پیشتر جاہلیت عرب میں بھی ناچ قبائل عرب میں موجود تھا۔ خصوصاً مشرکین عرب اپنے بتوں کے سامنے ناچا کو دا کرتے تھے۔ اسلام نے بت پرستی کے ساتھ بت پرستوں کے طریقۂ عبادت کو بھی مٹا دیا۔ اگرچہ رقص کی حرمت و ممانعت کے بارے میں کوئی نص قطعی نہیں موجود ہے۔ مگر اسلامی تہذیب نے موسیقی کے ساتھ اُسے بھی ترک کرا دیا۔ تاہم جس طرح نیک نفسی و پاکبازی کا گانا عورتوں میں باقی تھا جیسا کہ متعدد احادیث سے ظاہر ہوتا ہے اُسی طرح وہ ناچنا بھی ترک نہیں ہوا تھا جس میں شرک کا شائبہ نہ تھا۔ چنانچہ حبشیوں کا رقص حضرت سرورِ کائنات علیہ السلام نے خود بھی دیکھا اور اپنی محبوبہ جناب عائشہ صدیقہؓ کو بھی دکھایا۔ ایک قسم کا فوجی ناچ عربوں میں آج تک موجود ہے۔ جب حملے کے لیے وہ اپنا غول باندھ کے چلتے ہیں تو گاتے بجاتے ناچتے کودتے اور خوش فعلیاں کرتے ہیں۔

لیکن اسلامی تہذیب کا تمام ممالک مشرقی پر یہ اثر پڑا کہ رقص و سرود کے فنون علی العموم ممنوع و مکروہ اور غیر مشروع سمجھے جانے لگے۔ اور جو لوگ اِن فنون مین ترقی کرتے ہین چاہے کیسے ہی اعلیٰ کمال کا درجہ حاصل کر لین سوسائٹی مین اچھی نظر سے نہین دیکھے جاتے۔ اور ذلیل اور ادنیٰ طبقے کے لوگون مین شمار کیے جاتے ہین۔

مصر مین ناچنے گانے والون کا ایک خاص گروہ موجود ہے جن کی عورتین حسین و پری جمال ہونے کے ساتھ نہایت بیباکی سے سڑکون پر ناچتی پھرتی ہین۔ اور اپنی نسل کو برمکی خاندانِ وزارت کی طرف منسوب کرتی ہین۔ دیگر مشرقی ممالک اسلام مین نوعمر لڑکے ناچ کی تعلیم پاتے ہین۔ اور انھین کے متناسب و موزون حرکات سے نوجوانون کی صحبتون مین گرمجوشی پیدا ہوتی ہے۔

مگر ہندوستان مین قدیم الایام ہی مین موسیقی کا فن نہایت ہی کمال کے درجے کو پہونچ کے مدوّن و باقاعدہ بن گیا تھا۔ ہندوؤن مین ناچنا داخل عبادت ہے۔ جس طرح فی الحال جنوبی ہند کے مندرون کے متعلق بکثرت ایسی عورتین ہوتی ہین جو دیوتا کی مورت کے سامنے روز بلاناغہ جا کے ناچتی ہین اسی طرح کی عورتین ہزار بارہ سو برس پیشتر شمالی ہند کے بڑے بڑے مندرون مین بھی ہوا کرتی تھین۔ قدیم سیاحان عرب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان کے سب سے بڑے مشہور و ممتاز مندر مین ہزارہا عورتین تھین جنھون نے اکثر عربون کو بھی اپنا اسیر گیسو بنا لیا تھا۔ یہ عورتین مُرلیان کہلاتی ہین۔ اپنی زندگی دیوتاؤن کی نذر کر دیتی ہین۔ رقص و سرود اُن کا کام ہوتا ہے اور زناکاری کے ذریعے سے اپنا پیٹ پالتی ہین۔

اس عام رجحان نے ہندوستان مین موسیقی کو غیر معمولی ترقی دلائی۔ اور اُس کے متعلق کئی فن پیدا ہو گئے۔ پہلے تو یہ کہ موسیقی مین جس طرح مختلف آوازون یعنی سُرون کے نشیب و فراز موزون ترتیب سے مرتب کیے جاتے ہین اسی طرح ناچ مین جسمانی حرکات متناسب ترتیب سے مرتب کر کے دلکش و نظر فریب بنائے جاتے ہین۔ اس فن نے موسیقی کے قدم بقدم ترقی کی۔

اور جس طرح موسیقی مین بہت سے ترانے اور دُھنین قائم ہو گئی ہین ویسے ہی رقص مین حرکات جسمانی کی بہت سی گتین بن گئی ہین - اس مین جسم کا سُبک اور پُھر تیلا بنانا - پانؤن مین گھونگھرو باندھکے یہ قدرت پیدا کرنا کہ جب چاہین وہ بجین اور جب چاہین نہ بجین - اور بجنے کی صورت مین جے گھونگھرو چاہین بجائین - اس فن کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ بعض باکمال ناچنے والے تلوار کی باڑھ پر ناچتے ہین اور تلوے مین چرکا نہین لگتا -

دوسرا فن بتانا ہے - وہ یہ کہ گانے مین جو الفاظ زبان سے نکلتے جائین اپنی صورت سے اُن کی تصویر کھینچ کے دکھاتے جائین - اس فن مین بعض باکمال ناچنے والون کو اس حد تک کمال حاصل ہوتا ہے کہ ایک ایک مصرع کو سیکڑون طریقون سے بتاتے ہین - اور چونکہ محفل مین بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہین جو باریک تشبیہون اور نازک خیال آرائیون کو نہین سمجھ سکتے اسلیے ضرورت ہوتی ہے کہ ایک شارح پاس کھڑا ہوکے اُن باتون کی تشریح کرتا جائے -

بہر نقدیر ہندوستان مین رقص کا فن بہت اعلیٰ درجۂ کمال کو پہونچا ہوا ہے اور اس قابل ہے کہ بجائے بے پروائی کرنے کے اس کی قدر کی جائے اور جہان تک ممکن ہو اُسے ترقی دلائی جائے -

رَحِمَ اللہُ مَنْ ہَدَانِی اِلیٰ عُیُوبِی

عرب کی ایک مثل ہے جس کا مطلب یہ کہ "جو میرے عیب بتائے خدا اُسپر رحمت کرے" یہی مثل ہمارے قدیم کرم فرما مولانا مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علیگڈھ پر صادق آتی ہے - ہم نے مضمون "ہندوستان مین مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" مین غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر فرمانروایان اودھ کے حالات مین ہاتھیون اور درندون کی لڑائی کا تذکرہ کرتے وقت یہ دعوی کیا تھا کہ "قدیم ہندوستان کی تاریخ مین درندون کے لڑانے کا ذکر کہین اور کبھی نہین سُنا گیا تھا" - مولانا شروانی نے ہمارے اس دعوے

کی تغلیط فرمائی ہے - اور ایک کارڈ کے ذریعہ سے ہمین مطلع فرماتے ہین "تاریخ سے ثابت ہے کہ مغلیہ سلطنت مین ہاتھی قلعہ کے میدان مین لڑائے جاتے تھے- برنی ار نے اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے - عالمگیر کا اُس ہاتھی سے مقابلہ کرنا جو اپنے حریف ہاتھی سے لڑکر بھاگا تھا مشہور ہے"

بے شک یہ ہماری کمی نظر تھی - اور برنی ار کے سفرنامے کو ہم نے نہین پڑھا تھا - اور اب اس کے تسلیم کرلینے مین ہمین کوئی عذر نہین ہو سکتا کہ دہلی مین ہاتھی لڑائے جاتے تھے - اور یہ مذاق لکھنؤ مین وہین سے آیا ہوگا - لیکن شاید درندون کا باہم لڑانا اور ہاتھی کا شیر-تیندوے - اور گینڈے سے مقابلہ کرانا لکھنؤ ہی مین ثابت ہو سکے گا - ممکن ہے کہ یہ شوق ہندوستان کے کسی اور بادشاہ کو بھی ہوا ہو - مگر ہمین اُس کی اطلاع نہین ہے -

بہرحال ہم مولانا کے نہایت ہی شکرگذار ہین اور اُمید رکھتے ہین کہ وہ ہمیشہ یونہین ہماری غلطیون سے آگاہ کرتے رہین گے - مولانا ہی پر موقوف نہین، ہندوستان مین یہ مذاق پیدا ہونا چاہیے کہ محقق و صاحب علم حضرات تحقیق و تدقیق مسائل خصوصًا تاریخی تفتیش مین قلم اُٹھانے والون کے مدد معاون رہا کرین - ہم قدیم زبانی روایات یا بعض تحریری سندون سے فائدہ اُٹھاکے جو کچھ لکھتے ہین یقینی نہین ہو سکتا - اور ممکن ہے بہت سے حضرات کے علم مین ایسی باتین ہون جو ہماری جستجو اور ہمارے قیاسی فیصلون کے خلاف ہون - ایسے حضرات اگر بے توجہی کو چھوڑ کر ہمین متنبہ کرتے رہین تو ہمین اپنی تحریرون پر زیادہ بھروسا ہو جائے -

سچّا عاشق کون ہے؟ مرد یا عورت؟

شاعری کا اصلی تعلق انسان کے دلی جوش و جذبات سے ہے - اور جذباتِ انسانی مین سب سے زیادہ اہم عشق ہے - اگرچہ یہ کشش حیوانات اور دیگر اصناف مخلوقات مین بھی نمایان طور پر پائی جاتی ہے - مگر ہماری شاعری کو اُسی عشق سے بحث ہے جو انسان مین ہو - اسی وجہ سے شاعر عشق کا بندہ ہوتا ہے

اور دعویٰ کرتا ہے کہ ع عشق انسان کے آب و گل میں ہے"۔ مگر انسان کی دو قسمیں ہیں۔ مرد اور عورت۔ اور کشش عشق کا پہلا مصدر انھیں دونوں گروہوں کے دل ہیں۔ جن کی باہمی کشش اور محبت نے دنیا میں نیرنگیاں دکھائی ہیں اور شعرا کو خیال آرائی کا موقع دیا ہے۔

لیکن شاعر اُس عشق کو چاہتا ہے جو تمام جذبات پر غالب آجائے۔ اور عشق کے سوا دنیا و مافیہا سے علاقہ نہ باقی رہے۔ لہذا غور طلب یہ امر ہے کہ انسان کے دونوں طبقوں مرد اور عورت میں سے کس میں عشق زیادہ ہے؟ اور کس کا عشق زیادہ مستقل اور سچا ہوتا ہے؟ جذباتِ عشق کے اعتبار سے نوعِ انسان کے ان دونوں حصوں کو باہم ضرب دیا جائے تو چار شکلیں پیدا ہوتی ہیں (۱) مرد کا عشق مرد کے ساتھ۔ (۲) مرد کا عشق عورت کے ساتھ۔ (۳) عورت کا عشق مرد کے ساتھ (۴) عورت کا عشق عورت کے ساتھ۔ ان چار شکلوں کے سوا کوئی پانچویں شکل نہیں ہو سکتی۔

اب غور طلب یہ امر ہے کہ اِن چاروں شکلوں میں سے کون سی شکل شاعری کے لیے زیادہ موزوں ہے؟ کس میں کشش اور بیقراری بڑھی ہوئی ہے؟ اور کس میں زیادہ سچائی اور استقلال ہے؟ اِس سوال کا اگر ہم کافی اور اطمینان بخش جواب دے سکیں تو مختلف زبانوں کے شعرا کا ایک بہت بڑا جھگڑا چکا دیں گے اور فیصلہ کر دیں گے کہ کس زبان کے شاعروں کا مذاق اچھا اور سچا ہے۔

ان چار شکلوں میں سے دو فطری ہیں اور دو غیر فطری جنھیں قانون مرد کی زبان میں "خلاف وضع فطری" کہا جائے تو زیبا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرد کا عشق عورت کے ساتھ یا عورت کا عشق مرد کے ساتھ فطری ہے۔ اور اسی وجہ سے جن زبانوں کے شعرا نے ان دو شکلوں کو اختیار کیا ہے اُن کے مذاق میں فطرت اور نیچرل مذاق کی زیادہ جھلک بھی ہے۔ اور جن شاعروں نے غیر فطری عشق کی صورت اختیار کی ہے اُن کا مذاق شاعری فطرت صحیحہ سے کوسوں دور ہو کے صرف خیال آرائی۔ لفاظی اور مبالغوں میں پھنس کے رہ گیا ہے

اب ہم یہ بتاتے ہین کہ کن زبانون کے شاعرون نے کن شکلون کو اختیار کیا ہے - عربی - یونانی - رومی - انگریزی - فرانسیسی اور دیگر مغربی زبانون کے شعرا کے مذاق نے مذکورۂ بالا شکلون مین سے دوسری فطری شکل اختیار کی ہے - یعنی مرد کا عشق عورت کے ساتھ - آخر عہد کے مولدین عہ عرب، ترکی، فارسی اور اُردو کے شعرا نے پہلی غیر فطری شکل اختیار کی ہے یعنی مرد کا عشق مرد کے ساتھ - ہندوستان کی بھاشا اور غالباً سنسکرت نے تیسری فطری شکل اختیار کی ہے - یعنی عورت کا عشق مرد کے ساتھ - چوتھی غیر فطری شکل یعنی عورت کا عشق عورت کے ساتھ - یہ مذاق ہمین ابھی تک کسی زبان کے شعرا مین نہین نظر آیا - بد اخلاقی نے بعض اشخاص مین چاہے یہ مذاق بھی پیدا کر دیا ہو مگر کسی قوم اور کسی زبان کے شعرا کا یہ مذاق نہین سنا گیا - پہلے مورخ یونان ہیرو ڈوٹوس نے دامن کوہ قاف کے ملک گرجستان مین جب امیزونز (جنگجو عورتون) کا دور دورہ بتایا ہے اُن دنون ممکن ہے کہ وہان یہ مذاق ہو - اس لیے کہ کہتے ہین وہ سورما عورتین مردون سے متنفر تھین - اُنکو اپنی قلمرو مین رہنے نہ دیتی تھین - ضرورت کے لیے اپنے علاقے کے باہر جا کے دوسری سرزمین کے مردون سے مل کے حاملہ ہو آتین مگر اس کی روادار نہ تھین کہ کوئی مرد اُن مین رہے - وہان اُن دنون چونکہ عورتین ہی عورتین تھین - اور مردون سے دشمنی رکھتی تھین اس لیے قرین قیاس ہے کہ باہم عشق و محبت کے روابط رکھتی ہون - اُن کا قومی مذاق یہی ہو کہ عورت پر فریفتہ ہون - اور اُن کی شاعری اسی رنگ مین ڈوبی ہوئی ہو - لیکن دنیا مین اور کہین یہ مذاق نہین سنا گیا -

الغرض موجودہ شعرائے ارض کے مذاق کا عشق تین ہی طرح کا ہے - (۱) یا مرد مرد پر عاشق ہو (۲) یا مرد عورت پر عاشق ہو (۳) یا عورت مرد پر عاشق ہو - لیکن سوال یہ ہے کہ ان تینون صورتون مین کون سی صورت بہتر ہے؟

عہ مولد اُن عربون کو کہتے ہین جن مین عجمی خون مل گیا ہو - یعنی مولد انگریزون کے یوریشین ہین - مولد شعرائے عرب وہ ہین جن کا مذاق شاعری بیرونی اثر سے مغشوش ہو گیا تھا -

اور شاعری کے لیے زیادہ موزون ہے ؟

پہلی صورت چونکہ ہماری اور ہماری ہم مذہب دوسری زبانون کا شعار بنی ہوئی ہے۔ اس لیئے مروت سے چاہے ہم اُس پر نکتہ چینی نہ کرین مگر اس حقیقت کو نہین مٹا سکتے کہ وہ مذہباً شرعاً اور عرفاً بداخلاقی و معصیت قانوناً و تمدناً جرم۔ اور فلسفیانہ طور پر خلاف فطرت ہے۔ لہذا شعرا کے لیے اُس سے زیادہ لغو۔ بیہودہ۔ بے حقیقت۔ بدمزہ۔ اور بیحیائی و بے غیرتی پیدا کرنے والا کوئی مذاق عشق نہین ہو سکتا۔ اُس عشق مین چونکہ فطرت کی سچی کشش نہ تھی اُس کا مذاق حقیقت سے دور اور واقعیت سے جدا تھا۔ اِس لیے اس عشق کے مبتلاؤن کی شاعری کو سچائی اور نیچرل دلکشی سے کوئی علاقہ نہین رہا۔ وہ دل سے عاشق نہین بلکہ صرف بنے ہوے فرضی عاشق ہین۔ اُن کا معشوق ایک خیالی پیکر ہے جس پر دراصل نہ وہ خود عاشق ہین اور نہ کوئی اور عاشق ہو سکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اُن مین سچے جذبات پیدا ہی نہین ہو سکتے۔ اُن کے استعارے۔ اُن کی تشبیہین۔ اُن کی خیال آرائیان۔ اُن کی نازک خیالیان صرف فرضی ہوتی ہین۔ اپنے عشق مین اصلیت و واقعیت نہ ہونے کو وہ خود محسوس کرتے ہین۔ اور فطری کششون سے اپنی شاعری کو مطلقاً محروم دیکھ کے کبھی لفاظی اختیار کر کے فضول گوئی کے مرتکب ہوتے ہین۔ کبھی رعایت کے پیچھے پڑ کے ضلع جُگت بولنے لگتے ہین۔ کبھی مبالغے کو اپنا شعار بنا کے جھوٹ کے پُل باندھتے ہین۔ کبھی صنعتون اور بوقلمونیون کی بھول بھلیان بنا کے کھڑی کرتے ہین اور کبھی دور از کار اوہام اور بناوٹی پیچیدہ خیالون کو جنگل کی وحشی چڑیون کی طرح زبردستی پکڑ پکڑ کے الفاظ کے پنجرون مین بند کرتے ہین۔ جو کبھی تو اُڑ بھاگتی ہین اور کبھی اُسی مین پھڑک پھڑک کے دم دیتی ہین۔ غرض سب کچھ کرتے ہین اور زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہین مگر ایسی ایک بات بھی مشکل سے کہہ سکتے ہین جو دل کو لگے۔ اور سامعین کو بیتاب کر دے۔ اس لئے کہ جھوٹے کی زبان مین اثر نہین ہوتا۔ اُن کا مذاق جھوٹا ہے ان کی شاعری بے حقیقت ہے۔ اُن کا خیال مجرمانہ ہے۔ جس کی بنا پر وہ مذہباً

گنہگار۔ اخلاقاً سوسائٹی کو گندہ اور ناپاک کرنے والے۔ اور قانوناً جیل میں بھیجے جانے کے قابل ہیں۔

اس بدمذاقی اور جھوٹے عشق نے سچے اثر کی برکتوں اور سادی موثر کششوں کی برکت سے محروم کرکے انھیں مجبور کر دیا ہے کہ اپنی شاعری کی عمارت کو صرف خیال کے مال مسالے سے تعمیر کرکے رعایت لفظی اور طرح طرح کی آورد کی صنعتوں سے آراستہ کر دیں۔ اس لیے کہ اگر اُن کے اشعار پر کسی دل سے "آہ!" نکلنے کی اُمید نہیں تو شوکتِ الفاظ دیکھ کے "واہ" ہی نکل جائے۔

اس صورت کے بیہودہ و بے اصل ثابت ہو جانے کے بعد دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں (۱) مرد کا عشق عورت پر اور (۲) عورت کا عشق مرد پر۔ پہلی صورت کو جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں قدیم شعرائے عرب اور یورپ کی اکثر اگلی پچھلی زبانوں کے شعرا نے اختیار کیا۔ اور دوسری صورت کو ہندی شاعری نے۔ یہ دونوں صورتیں فطرت کے موافق ہیں۔ ایک مرد جب اپنی محبوبہ کے فراق میں فریاد کرتا ہے۔ اور ایک باوفا عورت جب اپنے شوہر اور مرد معشوق کی یاد میں بیتاب و بیقرار ہو کے روتی ہے۔ دونوں کی زبان میں بلا کا اثر ہوتا ہے اور چونکہ ان جذبات عشق میں سچائی مضمر ہوتی ہے اس لیے اُن کی زبان کا ہر ہر لفظ تیر و نشتر کا کام دیتا ہے۔ اور جس کے کان تک پہونچتا ہے بیتاب کر دیتا ہے۔

لیکن اِن دونوں میں امتیاز دکھا کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا آسان نہیں ہے۔ مگر ہم فیصلہ ضرور کریں گے۔ اور سچا فیصلہ کریں گے۔ دنیا میں اکثر فیصلہ کثرتِ رائے اور ووٹوں کی زیادتی پر ہوا کرتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرد عاشق کے طرفدار بہت ہیں۔ ساری دُنیا اُسی کی سی کہہ رہی ہے۔ اور مغرب کے اگلے پچھلے سب زور و شور سے اُس کی تائید کر رہے ہیں۔ اور اُس کے مقابل دکھیاری عورت عاشقۂ بیکس ہے اُس کی دردبھری آواز گھر سے باہر نہ نکل سکی اور اِس لیئے اُس کے اثر کا اندازہ بھی دنیا میں

بہت ہی کم لوگوں کو ہوا ہے۔ لیکن اگر سنو گے تو جو درد۔ جو سوز و گداز۔ اور جو اثر اُس کے لہجے اُس کی آواز۔ اور اُس کے بیان میں پاؤ گے کہیں نہ نظر آئیگا۔ مگر اس بحث کو ہم اس وقت اُٹھائے رکھتے ہیں۔ اور کسی آیندہ موقع پر بتائینگے کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے اور کیوں اچھا ہے۔

زبانِ اُردو کی شامت

چند سال ہوئے ایک دن صبح کو ہم نے اپنے شہر کے قابل اور بیدار مغز میونسپل کمشنر پنڈت اقبال نرائن مسلہ دان بیرسٹرایٹ لا کو اپنے مکان کی طرف سے گذرتے دیکھا۔ اور صاحب سلامت کے بعد تعجب سے پوچھا "آج اِدھر کہاں بھول پڑے؟" فرمایا "آپ کے پڑوس والے میونسپل اسکول کے معائنہ کو آیا تھا۔" پوچھا "تو کیسا پایا؟" اُنھوں نے جواب میں فرمایا کہ "یہ دیہاتی مدرس تو بجائے اُردو کی تعلیم دینے کے لڑکوں کی زبان خراب کرتے ہیں۔" میں نے کہا "آپ کے سررشتۂ تعلیم نے انتخاب مدرسین کا جو طریقہ رکھا ہے اُس سے اہل زبان درکنار کسی زبان دان مدرس کے ملنے کی بھی اُمید نہیں ہو سکتی۔"

خیر وہ گفتگو انھیں دو باتوں میں ختم ہو گئی۔ مگر مجھے خیال رہا کہ شاید پنڈت صاحب موصوف کی توجہ کوئی مفید نتیجہ پیدا کرے۔ اس کے بعد جب یہ سُنا کہ پنڈت مہاراج نرائن صاحب حکیبت تمام میونسپل سکولوں کے انسپکٹر مقرر ہوئے ہیں تو اُمید اور قوی ہو گئی۔ اور دل کو یقین ہو گیا کہ ان دونوں بزرگوں کی کوشش کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ ضرور ظاہر کرے گی۔

لیکن اپنی چھوٹی لڑکی کو پڑھانے کی ضرورت سے اتفاقاً ہم نے اپنے ملک کے مروّجہ اُردو نصاب تعلیم کو دیکھا تو حواس جاتے رہے اور اصلاح کی جو کچھ اُمیدیں دل میں پیدا ہوئی تھیں سب خاک میں مل گئیں۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب جس کا نام "اُردو کی پہلی ریڈر" ہے اس کے مصنف منشی برج باسی لال صاحب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس قسمت بنارس" ہیں۔ جن کو یا شاید سررشتۂ تعلیم کو دعویٰ ہے کہ اس کتاب کو اُنھوں نے جدید طرز تعلیم کے مطابق

"تصنیف" نہین کیا بلکہ "بنایا ہے"۔

مین نہ یہ جانتا ہون کہ گریجویٹ کتاب بنانے والے صاحب کس خطّے کے رہنے والے ہین اور نہ اس سے آگاہ ہون کہ اُنھون نے اُردو کی تعلیم کہان پائی ہے لیکن یہ ضرور کہون گا کہ جو گریجوئیٹانہ لٹریچر اُنھون نے اپنی اس بنائی ہوئی کتاب مین درج فرمایا ہے اُس سے سررشتۂ تعلیم کی اُردو شاید کسی کو آجائے مگر جس زبان اُردو کو ہم لوگ بولتے جانتے اور پڑھتے لکھتے ہین وہ اگر کسی بچّے کو آتی بھی ہوگی تو اُس کے چوپٹ کر دینے کے لیے یہ نصاب بہت اچھی طرح کافی ہے۔

گر ہمین مکتب ست و این مُلّا
کار طفلان تمام خواہد شد

ایک سرسری نظر مین اس کتاب کے جو زبان اُردو کی مرمت کرنے والے خاص خاص محاورات نظر آئے حسب ذیل عرض کیے جاتے ہین۔

پہلے صفحے کا پہلا جملہ ہے "باباجی کے ہاتھ مین مالا ہے" اور اُس کے بعد دوسرا فقرہ ہے "وہ گیت گایا کرتا ہے"۔ ہماری اُردو مین جس کے نام کے ساتھ "جی" یا اس قسم کا اور کوئی تعظیمی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اُسکے لیے تعظیماً فعل جمع لایا جاتا ہے۔ یعنی اس جملے کو یون بولین گے کہ "وہ گیت گایا کرتے ہین"۔ مگر شاید یہ انگریزی اُردو ہو جس مین تعظیم کے لیے جمع کا فعل لانا صاحب بہادرون کے محاورے کے بالکل خلاف ہے۔

تیسرے صفحے کی پہلی اور دوسری سطر مین ہے "پہلا جلد جلد قدم اُٹھاتا ہو اور دوسرا دھیرے دھیرے"۔ آخری لفظ ہندی گیتون مین البتہ سنے گئے مگر اُردو مین آج تک نہین سنے تھے۔ دھیرے در اصل اُردو زبان کا لفظ ہی نہین ہے۔

پانچوین صفحے کی پانچوین اور چھٹی سطر مین ہے "پیسے بھُنا لاؤ"۔ ہمارے یہان روپیہ بھُنایا جاتا ہے۔ اور روپیہ اُس وقت بھُنایا جاتا ہے جب اُس کی کوڑیان منگوانا ہون۔ لیکن ایسی صورت مین فقط ایک پیسہ بھُنایا جاتا ہے "پیسے بھُنانے" کا اتفاق نہین ہوتا۔

دسوین صفحے پر ہندوستانی معاشرت کی ایک تصویر ہے جس مین حکیم صاحب ایک اسٹول پر بیٹھے مریض کی نبض دیکھ رہے ہین۔ مریض نے بجائے جھکنے کے ایک گھٹنا زمین پر ٹیک دیا ہے اور دوسرا پاؤن آگے بڑھا کے اُس پر ہاتھ رکھ لیا ہے ۔ اس شائستگی سے نبض دکھانے والے آج تک یہان کسی حکیم کے مطب مین نہین دیکھے گئے تھے ۔ بڑی عنایت ہوتی اگر ہمارے گریجویٹ مصنف بچون کو فقط اپنی زبان سکھانے اپنی تہذیب وشائستگی کے بھی سکھلا دینے کا ارادہ نہ فرماتے ۔

بارہوین صفحے کی چوتھی اور پانچوین سطر مین ہے "اس لحاف کی سنجاف اچھی ہے"۔ "سنجاف" گوٹ کی ایک خاص وضع کا نام ہے۔ کوئی مستقل چیز نہین ہم لوگ لحاف کی گوٹ کہین گے ۔ لحاف کی سنجاف نہین کہہ سکتے۔ مگر مصنف صاحب کی زبان کون پکڑ سکتا ہے ؟ جو چاہین فرمائین ۔

پندرہوین صفحے کی پہلی سطر مین ہے "مجھے تیرنا نہین آتا" یہ محاورہ اگرچہ بعض عوام بول جاتے ہین مگر زبان دان بخوبی جانتے ہین کہ اُردو مین کسی ہلکی بے جان چیز کے آپ ہی آپ پانی کے اوپر قائم رہنے کو تیرنا کہتے ہین اور جو ذی روح ہاتھ پاؤن کی کوشش سے اپنے آپ کو پانی کے اوپر قائم کرے اُس کے اس فعل کو تیرنا نہین "پیرنا" کہتے ہین ۔

اُنیسوین صفحے مین چھٹی سطر پر ہے "اُنچاس مین سے بائیس گھٹاؤ" اہلِ زبان اُنچاس کہتے ہین ۔ لیکن ہمارے معلم زبان مصنف صاحب کی زبان اُنچاس ہے۔ مگر کاش یہ زبان اُن کے گھر ہی مین رہتی ۔

بائیسوین صفحے کی چوتھی سطر مین ہے "جو اُستاد پڑھاوین اُس پر دھیان دو"۔ ہماری اُردو مین اس موقع پر کہین گے "اُس مین دھیان لگاؤ"۔ مگر افسوس کہ مصنف صاحب کی زبان مین "اُس پر دھیان دو" کہتے ہین ۔ اور ہمارے بچّے مجبور ہین کہ اُن کی یہ بولی سیکھیں بھی ۔

تیئسوین صفحے مین ایک لڑکا اپنے باغ مین گیا ہے جس کی نسبت (سطر سات و آٹھ مین ہے) "وہان اُس کا دادا زمین کھود کر آم کے چھوٹے چھوٹے پودے

لگا رہا تھا" یہ کسی مالی کا لڑکا ہو تو اور بات ہے۔ لیکن کسی شریف لڑکے کا ذکر ہوتا ہے تو اُس کے دادا کی اس طرح توہین نہین کرتے بلکہ کہتے ہین کہ اُسکے دادا ایسا کام کر رہے تھے۔

چوبیسوین صفحہ کی پانچوین اور چھٹی سطر مین ہے" لوگ اپنے بزرگون کے نام مرنے کے پیچھے عزت سے یاد کرتے ہین"۔ اس مین اول تو "مرنے کے پیچھے" کی جگہ "مرنے کے بعد" کہنا چاہیے۔ مرنے کے پیچھے صحیح اُردو نہین۔ دوسرے یہ نہین پتہ چلتا کہ اُن کے مرنے کے بعد یا اپنے مرنے کے بعد۔ بہرحال اُردو مین اس جملے کو یون ہونا چاہیے کہ "اُن کے مرنے کے بعد عزت سے یاد کرتے ہین"۔

پچیسوین صفحہ کی چوتھی سطر مین ہے" جب اُس کی (چنے کی) پتیان بہت نرم رہتی ہین تو لوگ نوچ نوچ کے کھاتے ہین"۔ اہل زبان اُردو اس مقام پر "نرم رہتی" ہرگز نہ کہین گے بلکہ "نرم ہوتی" کہین گے۔

انھین چند محاورات پر موقوف نہین اس کتاب کو اول سے آخر تک غور سے پڑھا جائے تو ہر صفحے پر ایسی ہی فاش غلطیان ملین گی۔ پڑھانے والے یا تو دیہاتی مدرس ہین یا بہت ہی معمولی استعداد کے اُردو دان جو سمجھ جاتے ہین کہ یہی فصیح و صحیح زبان ہے۔

کیا یہ عبرت کی بات نہین کہ لکھنؤ کے مدرسون مین یہ اُردو پڑھائی جاتی ہے جہان زبان اُردو نے نشو و نما پایا ہے۔ جہان کے شرفا و فصحا کی زبان سند اور معیار فصاحت مانی جاتی ہے۔ جہان ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی تحقیق و تنقید مین خدا جانے کیسی کیسی بحثین پیش آتی رہتی ہین۔ اور جہان کی خاک مین میر۔ سودا۔ انشا۔ مصحفی۔ جرأت۔ ناسخ۔ آتش۔ انیس۔ دبیر اور اسی طرح کے صدہا اساتذہ سخن آرام کر رہے ہین۔ لکھنؤ کے پاس اب زبان اُردو کے سوا کچھ نہین رہ گیا ہے۔ وضع قطع۔ صحبت و معاشرت سب چیزین تو چھن گئین۔ لے دے کے ایک زبان رہ گئی ہے اور افسوس کہ اب وہ بھی سررشتۂ تعلیم کے خنجر جہالت سے ذبح ہو رہی ہے۔

ہمین اُن بزرگون کے معزز نامون کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے جنھون نے

اس کورس کو پسند اور منظور فرمایا ہے - یہ کام بورڈ کے سپرد ہے - اور بورڈ مین جو بزرگوار ممبر منتخب ہوا کرتے ہین اُن مین ہماری بدقسمتی سے سارے کمالات جمع ہوتے ہین ایک وہ سعری ہوتے ہین تو زبان دانی سے - اُن کے لیے گریجویٹ ہونا شرط ہے - انگریزی دانی لازمی ہے - اور ادر بھی خدا جانے کن کن صفات کا موجود ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے - مگر اس کو کوئی نہین پوچھتا کہ وہ اُردو بھی جانتے ہین یا نہین -

سب سے زیادہ خرابی یہ ہے کہ سررشتۂ تعلیم کے عہدہ دارون نے مدارس کو اپنی تجارت کی منڈی بنا لیا ہے - وہ لوگ ادھر اُدھر سے جوڑ توڑ کے چند عبارتین جمع کرتے اور ایک کتاب بناتے ہین - اور منظور کرنے والے عہدہ دارون پر اثر ڈال کے اور سفارشین پہونچا کے منظور کرا لیتے ہین - آج تک کبھی اسکی کوشش نہین کی گئی کہ اُردو کا نصاب بنانے مین دہلی و لکھنؤ کے اُن لوگون سے بھی کچھ مدد لی جائے جو اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہین -

سُنا جاتا ہے کہ اب یونیورسٹی آپ اپنا کورس تیار کرائے گی - اور کسی کو اُس سے تاجرانہ نفع اُٹھانے کا موقع نہ دیا جائے گا - مگر اس سے یہ اُمید رکھنا فضول ہے کہ اساتذۂ زبان سے کوئی مدد لی جائے گی - اس لیے کہ یونیورسٹی کی دُنیا کے لال بجھکڑ وہی بزرگوار ہین جو سررشتۂ تعلیم مین بلحاظ عہدہ کوئی اثر و اقتدار رکھتے ہین - کورس بنانے کو جب کہا جائے گا اُنھین سے کہا جائیگا - اور یہ پہلے تو منفعت کے شوق مین تھوڑی بہت کوشش بھی کرتے اور ادھر اُدھر سے پوچھ کے کچھ کر بھی لیتے تھے اب بے پروائی کے باعث پہلے سے بھی بدتر نصاب مرتب کرین گے - اور اُردو کی اور مٹی خراب ہو گی -

بہر حال سررشتۂ تعلیم کے نصاب مین اصلاح کی کوئی اُمید نہین - اور اس کا سوا اس کے کوئی علاج نہین نظر آتا کہ ہم اور تمام وہ لوگ جو اپنے بچون کی زبان بگڑنے کو نہ برداشت کر سکتے ہون اُنھین مدارس سرکاری سے اُٹھا لین - اور اُن کی تعلیم کا کوئی اور انتظام کرین -

کیا واقعی انسان سب سے افضل ہے؟

گو اپنے منہ میاں مٹھو بننا اچھا نہین معلوم ہوتا۔ مگر انسان کو اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا دعوٰی ہے۔ اور اپنے اس دعوے کی سچائی کا اُسے اس قدر یقین ہے کہ اس مین شک و شبہ کی ذرا بھی گنجایش نہین۔ یہان تک کہ اُسکے خلاف کوئی بحث چھیڑی جائے تو اُس کے سننے کی بھی وہ تاب نہین لا سکتا۔ اس دعوے کی اصلی محرک تو انسان کی خودپرستی ہے جو اُس کی سرشت مین داخل ہے۔ اور وہ رہ رہ کے اُس کی زبان سے کہلا دیا کرتی ہے کہ "ہمچو من دیگرے نیست" مگر اُسے زیادہ قوت اس سے ل گئی کہ وہ تمام مذاہب جن سے اُمم عالم کے تمدن بنے ہین اُن سب نے بھی انسان کے اس دعوے کی تصدیق و تائید کر دی۔ چنانچہ اب یہ یقین ہمارے عقائد مین داخل ہو گیا ہے کہ "ہم اشرف المخلوقات ہین"۔

ہمارے راویان کہن کہتے ہین کہ اگلے دنون یہ مسئلہ اور دعوٰی ایک باضابطہ مقدمے کی شان سے بعض قدیم مستند دربارون مین پیش ہو کے طے ہو چکا ہے۔ چنانچہ پارسیون کے صحف آسمانی مین جو دساتیر کے مجموعے مین مرتب و مدون ہین بتایا گیا ہے کہ مجوس کے آدم "گل شاہ" کے دربار مین جانورون نے آکے شکایت کی کہ انسان اپنے آپ کو ہم سب سے افضل و اعلیٰ بتاتا۔ پھر اُسکی بنیاد پر ہماری آزادی مین فرق ڈالتا۔ اور حکومت کے بہانے ہم پر طرح طرح کے ظلم و جور کرتا ہے۔ اُن کی بحث سُنی گئی۔ انسان کو جواب دہی کرنا پڑی۔ اور گو کہ عدالت کے تیورون سے جنبہ داری کا شائبہ نہ تھا مگر انسان ہی کے حق مین فیصلہ ہوا۔ اور اُسے اُن بے اعتدالیون کی اور جرأت دلائی گئی۔

اس کے بعد رسائل اخوان الصفا مین سے ایک رسالہ غالباً پارسیون ہی کے مذکورۂ بالا خیال سے لے کے زیادہ لطف و صناحت کے ساتھ اسی دعوے کی تائید مین لکھا گیا۔ اُس مین یہ طے شدہ مقدمہ پھر نمبر پر لیا گیا ہے۔ اور حاکم انسان نہین ایک تاجدار جن ہے۔ اس رسالے مین یہ قضیہ جنون کے ایک

محترم دربار میں پیش ہوا ہے۔ تمام جانوروں نے باری باری آکے اپنے کمالات اور ہنر بیان کیے۔ انسان کو نہایت بے اعتدالی کا الزام دیا اور اُس کے جور وستم سے پناہ مانگی۔ انسان نے اپنے فضائل و محامد بیان کیے۔ اور زور دے کے ثابت کیا کہ ہم سب سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ اور خدا نے ہمیں ایسی قوت عطا کی ہے کہ سارے حیوانات پر تصرف کرتے اور جس سے جو کام چاہتے ہیں لیتے ہیں۔ آخر اُس جنّی دربار نے بھی انسان ہی کی طرفداری کی۔ اور جانوروں کا دعویٰ خارج کرکے انسان کو حق دیدیا کہ بے زبان جانوروں کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔

لیکن اصل یہ ہے کہ یہ دونوں فیصلے خود انسان نے اپنے مقاصد و اغراض کے مطابق بنا لیے ہیں۔ اور اگر کوئی غیر جانبدار عدالت موجود ہوتی تو اِس جعل بنانے پر انسان کو بڑی بھاری سنگین سزا ملتی۔ دراصل انسان نے اپنی کامیابی کے زعم اور غلبے کے نشہ میں جہاں جانوروں پر ظلم و جور کیے وہاں اپنی تائید میں یہ مقدمے اور فیصلے بھی بنا لیے۔ اُسے اپنی چالاکی اور قوت تدبر پر گھمنڈ اور ناز ہے۔ اور اُنھیں چیزوں کو مصداق "مائٹ از رائٹ" (قوت ہی استحقاق ہے) اپنی عظمت کی دلیل تصور کر لیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہمارا جانوروں پر غالب آجانا اور اُن میں ہر قسم کا تصرف کر سکنا ہی ہماری فضیلت و فوقیت کی دلیل ہے۔

جن لوگوں نے مسئلۂ تخلیق عالم پر غور کیا ہے اب اُن کی یہ رائے قرار پائی ہے کہ انسان کی تخلیق سے پہلے کرۂ ارض جنگلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اُس میں ایسے ایسے عجیب و غریب حیوانات۔ اور مہیب الخلقت و عظیم الجثہ جانور بھرے ہوئے تھے کہ اُن کے سامنے انسان ضعیف البنیان کی کچھ ہستی نہ تھی۔ اُنھیں وحشی موذیوں اور خونخوار دشمنوں کے آغوش میں انسان پیدا ہوا۔ جس نے آفرینش کے ساتھ ہی اپنی نوعی حفاظت کا سامان شروع کیا۔ انسان کی صورت دیکھتے ہی وہ سب اُس کی ہلاکت کے درپے ہو گئے۔ پہلے تو انسان نے الگ کے پہاڑوں کی کھوہوں۔ درختوں کے جھنڈوں۔ اور تنگ و تاریک غاروں میں پناہ لی۔ پھر اپنی چالاکی و مکاری سے اُن موذیوں کو زیر کرنے لگا۔ اسکے بعد

اُس نے جنگل کاٹ کے میدان نکالے - اپنے رہنے اور وحشی درندون سے بچنے کے لیے مکان بنائے - آپس مین اتفاق کیا - اور آخر مین شہر اور گانوٗن آباد ہونے لگے ترقی کے اس درجے تک پہونچتے پہونچتے اُس نے بہت سے بڑے بڑے وحشت ناک جانورون کی نسلین فنا کر دین - بہتون کو اپنا مطیع بنا لیا - جن مین سے بعض کو کھاتا بعض پر سواری لیتا - بعض کو تفنن طبع کے لیے پالتا ہے - اور جو قابو مین نہین آتے اُن کا شکار کرتا ہے -

وحشی جانورون کو حریف پر غالب آنے اور اپنے بچانے کے لیے خدا نے طرح طرح کے خوفناک اسلحہ دیے تھے - اُن کے مقابل مین انسان نے اپنی طباعی سے ایسے ایسے مصنوعی اسلحہ ایجاد کر لیے جنھون نے حیوانات کے قدرتی اسلحہ کو بیکار کر دیا - اور ان آلات اور حربون سے اُس نے جانورون کو فنا کرنا شروع کر دیا - نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی نسل روز بروز بڑھنے لگی - اور ان قوی ہیکل و وحشی جانورون کی مقدار یوماً فیوماً گھٹتی گئی - اُن کی بہت سی نسلین کلیتہً فنا ہو گئین - جو رہ گئین اُنھون نے انسان کے شر سے بچنے کے لیے اُن کی بستیون کو چھوڑ چھوڑ کے کوہ و صحرا اور دشت و بیابان کی راہ لی - اور انسان کو اپنی عام فتح کے زعم باطل اور اپنے غلبے کے نشے مین یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ ہم ہی سب سے افضل و اعلیٰ ہین "

آخر اسی غلبے اور حکومت کو اُس نے اپنی فوقیت و افضلیت کی دلیل قرار دیدیا - جس طرح کہ انسانون کی کامیاب و حکمران قومین حکمرانی اور اپنے غلبے کو دوسری قومون کے مقابلے مین اپنے اشرف و اعلیٰ ہونے کی دلیل خیال کیا کرتی ہین - چنانچہ اسی دلیل کے گھمنڈ پر انھون نے اپنے خیالی مقدمے بنائے - اپنے خیال سے اُن مقدمون کی روداد ین قلمبند کین اور اس حجت پر اس قدر ناز تھا کہ جعلی فیصلے شایع کر کے خود ہی ڈگری لے لی -

مگر اب دنیا کا تمدن بہت آگے بڑھ آیا ہے - تحقیق و تنقید نے انسان کے اگلے تمام دعوے توڑ دیے ہین - اور واقعات کی صورت ہی اور سے اور ہو گئی ہے - گاؤزوریون اور جسمانی قوت سے حکومت کا حق مل جانا اگلے دنون ایک

قطعی فیصلہ تھا - مگر اب انسان کو ایسے مصنوعی آلات و اسلحہ ہاتھ آ گئے ہیں کہ تنومندی اور قوت کی کچھ اصل و حقیقت ہی نہین رہی۔

علاوہ بریں اب یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ غلبے اور حکومت کو فضیلت و شرافت سے بہت ہی کم تعلق ہے - بلکہ لڑائی اور جسمانی زور آزمائی انسان کے ادنیٰ ترین فضائل مین شمار کی جاتی ہین - ممکن ہے کہ انصاف پسندی - دیانتداری - صفائی اور اسی طرح کے اور بہت سے صفات جانورون مین زیادہ ہون - اور اس مین کوئی شک نہین کہ یہ صفات جنگجوئی سے زیادہ افضل ہین -

دنیا کے وہ لوگ جو تمام مذہبون مین واجب التعظیم اور اشرف و افضل سمجھے جاتے ہین - اُن کے نزدیک نیکی اور خوبی یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ فضیلت و شرافت صرف اس مین ہے کہ انسان دنیاوی جھگڑون سے الگ رہے - دولتمندی کی ہوسون سے بھاگے - خدا نے جو کچھ دیا ہے اُس پر قناعت کرے - اپنی نسل کی بقا کا انتظام رکھے - اور شب و روز خدا کو یاد کرے - ہمین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جانورون مین یہ صفات بہ نسبت انسان کے زیادہ اکمل و اعلےٰ درجے تک پائے جاتے ہین - وہ قانع ہین - بے ضرورت بھیک نہیں مانگتے - اپنے فرائض سے غافل نہین ہوتے - دوسرون کے معاملات مین دخل نہین دیتے - اور جہان تک بنتا ہے بے آزار زندگی بسر کرتے ہین - کیا ان صفات کا لحاظ کیجیے تو یہ جانور جن کو ہم نے حد سے زیادہ ستا رکھا ہے ہم سے زیادہ شریف و افضل نہین معلوم ہوتے ؟

اس کو بھی چھوڑیے - جانورون کی اس قطعی دلیل فضیلت کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ تمام صفات حسنہ اور کُل خوبیون کا ایک ذات مین جمع ہو جانا اور کُل بُرائیون - خرابیون اور ذلیل حرکتون سے اُس کا مصئون و معصوم ہونا محال ہے - اس لیے کہ مستجمع جمیع کمالات ہونا صرف اُس رب العزت کے ساتھ مخصوص ہے جو ہم سب کا خالق بے ہمتا ہے - ایسی حالت مین جانورون نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کسی ایک صفت کو اپنے ساتھ مخصوص کر لیا ہے -

بخلاف اس کے انسان کی یہ حالت ہے کہ طلب الکل فوت الکل - وہ چاہتا ہے

کہ ساری خوبیاں اُس مین جمع ہو جائین۔ مگر اصل مین دیکھیے تو سب ناقص درجے تک ہین۔ اور اس قدر ناتمام اور غیر مکمل ہین کہ اُن خوبیون کا ہونا بجائے کوئی خوبی ہونے کے عیب ہو گیا ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ ان تمام ناقص صفات پر انسان کو تو یہ غرّہ ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کا دعوٰی کر رہا ہے۔ اور جانورون کی یہ حالت ہے کہ اپنی اپنی صفتون مین اس درجہ کمال رکھنے پر بھی اس طرح خاموش ہین کہ گویا کچھ جانتے ہی نہین۔

انسان کو سب سے بڑا دعوٰی اپنے ہُنرون اور اپنی صنعتون پر ہے۔ وُسکی یہی ترقی ایسی نمایان ہے جس نے دنیا مین اس قدر ترمیم کر دی۔ اول تو اسی مین شک ہے کہ اسے ترقی کہنا چاہیے یا ہوس پرستیون کا کرشمہ۔ لیکن اگر بالفرض یہ ترقی بھی ہے تو اگر غور کیجیے تو انسان نے تمام صفتین جانورون ہی سے سیکھی ہین۔ وہ موجد بنتا ہے۔ مگر انصاف سے پتہ لگائیے تو اُس مین سوا دوسرون کی نقل کرنے کے ایجاد کا مطلق مادہ نہین ہے۔ انسانی ہُنرمندیون کے جتنے مبادی ہین سب دوسرون سے سیکھے اور چُرائے ہوے ہین۔ اُس نے جانورون کے اُون اور پَر دیکھ کے اپنے جسم کے لیے کپڑے بنائے۔ جانورون کی غذا اُن سے منتخب کرکے اور اُن کو باہم ترتیب دے کے اپنے لیے قسم قسم کی غذائین منتخب کین۔ مختلف جانورون کے مسکن اور آشیانے دیکھ کے اپنے رہنے کو گھر بنائے۔ بنّے کے جھوجھ مین جگنو چمکتے دیکھ کر اپنے مکان مین چراغ روشن کیا۔ شہد کی مکھیون کا نظام دیکھ کے اپنا نظام تمدنی قائم کیا۔ اسی طرح جتنی چیزون کو خیال کیجیے کوئی خاص انسان کی ایجادکی ہوئی نہ ملے گی۔

اس مین شک نہین کہ انسان کو ایک بیقرار و غیر قانع طبیعت ملی ہے۔ جو اُسے کسی حال پر قرار نہین لینے دیتی۔ اور اُس کی ہوس کسی طرح پوری ہونے کو نہین آتی۔ جس کے نتیجے مین اُس نے کیّا دی۔ مکاری۔ اور خونخواری و ضرر رسانی مین سب سے زیادہ ترقی کر لی ہے۔ جبکہ ساری مخلوق کا یہ طریقہ ہے کہ بے وجہ دوسرون کی آزادی معاشرت مین کوئی فرق نہین ڈالتا۔ انسان بجائے اس کے کہ اپنی حالت درست کرے خواہ مخواہ اورون کے معاملات مین دخل دیتا

اُن کو ستاتا - اُن کی زندگی تلخ کرتا - اور اپنے ذلیل نفع کے لیے اُن کی جان لیتا ہے -
اگرچہ ساری مخلوق میں خدا نے یہ شان پیدا کر دی ہے کہ ایک ایک کو کھائے جاتا ہے - خلاق عالم نے ہر ایک کو غذا حاصل کرنے پر مجبور کر دیا ہے - اور اسی بہانے خداوند جل وعلا نے ایک مخلوق کو دوسرے کے فنا کرنے کا آلہ بنا دیا ہے - فنا کرنے کا یہ قانون حجر و شجر تک میں جاری ہے - اس میں خدا کی بڑی بھاری مصلحت ہے - کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو قدرت کے اکھاڑے میں جو بازیگر آتے سامنے سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتے - اور دوسروں کے لیے جگہ خالی نہ ہوتی - لہذا پیٹ بھرنے کے لیے اگر انسان بھی قدرت کے اس عام باورچی خانے سے اپنا نسکھی وظیفہ حاصل کر لیتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا - مگر وہ اس حد سے تجاوز کر کے محض شوق و تفنن کے لیے ہر مخلوق کے نوعی عالم میں دخل دیتا اور بے ضرورت مخلوقات پر ظلم کرتا ہے - وہ اپنے پاؤں بیکار کر کے جانوروں سے سواری لیتا ہے - اپنا بدن ڈھانکنے کے لیے جانوروں کا اون کاٹتا - اُن کے پر نوچتا - اور اُن کی کھال کھینچتا ہے -
ان چیزوں کو اگر ترقی کہا جائے تو ترقی میں چاہے اعلیٰ درجے کی نفس پروری ہوتی ہو مگر وہ نہایت ہی شرمناک چیز ہے - خود انسانوں میں جو اعلیٰ درجے کے دخیب الاخترام بزرگ ہیں وہ بھی انسان کی ان حرکتوں اور اُس کی اس دست بُرد کو بُرا سمجھتے ہیں -
اُن کے نزدیک فضیلت و شرافت یہ ہے کہ انسان ایک بے ضرر و بے آزار زندگی بسر کرے - اُس کے ہاتھ سے کسی کو نقصان نہ پہونچے - بجائے دوسروں کے معاملات میں پڑنے کے وہ اپنی فکر رکھے - اپنے اخلاق درست کرے - اور خدا کو نہ بھولے - جب خود انسان کے مدوّنہ علم اخلاق کا یہی اصول باعثِ شرافتِ نفس و فضیلت ہے تو سچ یہ ہے کہ شرافت میں انسان من حیث المجموع سب سے بدتر ہے - اور جانور قطعاً اُس سے زیادہ شریف و افضل ہیں

چلتے پھرتے باغ و مکان ستمبر ۱۹۱۷ء

خدا کی عجیب و غریب قدرت کا ایک یہ بھی نمونہ ہے جو ہمارے لیے حد سے زیادہ حیرت انگیز ہو سکتا ہے کہ دریاؤں اور جھیلوں مین پانی کی سطح پر تیرتے اور چلتے پھرتے قطعات زمین بن جاتے ہین۔ اور وہ اس قابل ہوتے ہین کہ اُن پر باغ لگائے جائین۔ کھیت بوئے جائیں۔ اور شاداب ترکاریان تیار کی جائین۔

ہمارے ہندوستان مین جابجا گنگا مین زمین کے بڑے بڑے تختے سطح آب پر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوے دیکھے جاتے ہین۔ مگر یہ عموماً انسانون کے بنائے ہوے نہین بلکہ خود قدرت الٰہی کی صنعت ہوتے ہین۔ یہ تختے درختوں کی ٹہنیوں۔ لکڑی کے ٹکڑوں۔ اور سِوار وغیرہ کے باہم مل اور جڑ جانے سے بن جاتے ہین۔ اور جب تیار ہو چکتے ہین تو سیلاب مین پانی کا زور اُنھین کنارے سے چھڑا کے بہا لاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دریا کے آغوش مین ایک شاداب اور نزہت بخش مرغزار بہتا چلا جاتا ہے۔ ان مین سے بعض پر اکثر بڑے بڑے پیڑ بھی دیکھے جاتے ہین۔ اور اُن کو چلتے پھرتے دیکھ کے عقل انسانی چکر مین آجاتی ہے۔

انگلستان کی جھیلون مین بھی دو ایک جھیلین ایسی ہین جن کی سطح پر اسی قسم کے تختہ ہاے زمین پانی مین سدابہار باغ لگانے کے لیے پیدا ہو گئے ہین۔ اور اس سے بھی زیادہ لطف و حیرت کی یہ بات ہے کہ وہاں کی جھیل "ڈرونٹ واٹر" مین جو ایسا ہی ایک مصنوعی تختۂ زمین ہے اُس کے آغوش مین ایک اور جھیل پیدا ہو گئی ہے۔

ملک پروشیا (جرمنی) مین ایک "جھیل باغ" ہے۔ اُسکی سطح آب پر بڑے بڑے تیرنے والے اور چلتے پھرتے جزیرے ہین۔ اور ایسی ہی ایک جھیل مین ایسے مضبوط قطعات زمین بن گئے ہین جن پر اچھے اور نفیس جھاؤ کے درخت لگائے جاتے ہین۔ اسپین والون نے جب امریکہ کو فتح کیا ہے تو

میکسیکو کی جھیل میں بھی تیرتے اور چلتے پھرتے باغ دیکھے تھے۔

شمالی و مغربی ہند یعنی کشمیر میں اور تبت و ایران کی سرحد پر لوگ اپنی جھیلوں میں خود ہی ایسے جزیرے اور قطعات زمین بنا لیا کرتے ہیں جن پر وہ باغ لگاتے ہیں۔ اور تربوزوں۔ اور خربزوں۔ کھیروں۔ ککڑیوں اور دیگر بقولات کے جو مرطوب زمین چاہتے ہوں بڑے بڑے کھیت تیار کرتے ہیں۔ جن کی نسبت اختیار رہتا ہے کہ جب تک چاہیں کسی جگہ قائم رکھیں اور جب چاہیں کسی اور مقام پر ہٹا لے جائیں۔ یہاں کوئی کسی سے کہے کہ فلاں شخص کے کھیت کو چور چرا لے گئے تو تم اسے مجنون و فاتر العقل کہو گے۔ مگر وہاں یہی تمہارے خیال کے خلاف فطرت واقعات روز پیش آیا کرتے ہیں۔ اور اکثر کھیتوں کی چوریاں ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی مالک کو غافل پا کے لوگ اس کے کھیت کہیں اور کھینچ لے جاتے ہیں یا اپنے کھیت میں ملا لیتے ہیں۔ کشمیر میں اس قسم کے تختوں پر جہاں باغ ہو گیا ہے اور پھول کھلے ہیں وہاں کی بہار سارے مناظر قدرت کو مات کر دیتی ہے۔

یہ تختہ ہائے زمین بہت پتلے۔ سُبک اور نازک ہوتے ہیں۔ اور اُن کا دَل کہیں شاذ و نادر ہی ایک فٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اصلی چیز جس پر اُن تختوں کی بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ درختوں کی ٹہنیاں۔ لکڑی کے ٹکڑے ہیں جن کو سوار بن کے جوڑ دیتے ہیں۔ پھر اُس پر چٹائیاں بچھا کے تھوڑی تھوڑی مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ اور اُس میں تخم پاشی ہوتی ہے۔

مگر ان سب چیزوں سے زیادہ حیرتناک ملک سیام کے چلتے پھرتے گاؤں ہیں۔ جن کے بنانے میں دار السلطنت سیام بنکوک کے لوگ ساری دنیا سے سبقت لے گئے ہیں۔ وہ لوگ سیلاب سے بچنے اور پانی کے ضرر سے محفوظ رہ کے آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے ایسے مکان بناتے ہیں جو پانی پر تیرتے اور چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ اِن مکانوں کو برابر برابر جما کے اور لنگروں کے ذریعے سے ایک جگہ قائم کر کے وہ بڑی بڑی بستیاں بنا لیتے ہیں جن کے بیچ میں پانی کی کشادہ سڑکیں ہوتی ہیں۔ اور پانی اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اُن آبی سڑکوں میں دو دو

ہمین تین سو ٹن کا بوجھ لیجانے والے جہاز گذرتے رہتے ہین - ان بستیون کی وضع و قطع بدلنے کا اُنھین اختیار رہتا ہے - مکان کا رُخ جدھر چاہین پھیر سکتے ہین اور یہ اُن کے بس کی بات ہے کہ جب چاہین اپنے اس بحری گاؤن کی وضع و صورت بدل دین - اُن کے یہ مکان علی العموم بانس کی کھپاچون - ٹھنیون - اور کھجور کے درختون سے بنتے ہین اور نہایت ہی سُبک اور خوشنما ہوتے ہین - جن مین سامنے کے رُخ پر عموماً ایک برآمدہ ہوتا ہے - جس سے کشتیان اور جہاز آکے لگ جاتے ہین اور اُن کے ذریعہ سے بآسانی ہر حصۂ آبادی اور ہر سڑک کی سیر ہو سکتی ہے - اور وہی ذریعۂ آمد و رفت ہوا کرتے ہین -

اٹلی مین شہر وینس کی بڑی تعریف کی جاتی ہے کہ سمندر کو شہر کے اندر کاٹ لائے ہین - اور پانی کی نہرین سڑکون کا کام دیتی ہین جن مین کشتیون کے ذریعے سے آمدہ رفت ہوتی ہے - مگر جو خوبی سیام کی ان چلتی پھرتی بستیون مین ہے وینس کو بھلا کہان نصیب ہو سکتی ہے ؟ وینس کی جو قطع ہے نہین بدل سکتی - اس لیے کہ پانی کی سڑکون کے کنارے دونون جانب پختہ عمارتین ہین - بخلاف اسکے سیام کی بستیون مین یہ صفت ہے کہ جس گاؤن کو جہان اور جتنی دور چاہین لے جاکے قائم کر دین - اور جب ایک وضع کی آبادی سے دل اُکتائے بدل کے دوسری وضع کر دین - جس کسی کا جب تک جی چاہے ایک جگہ رہے اور جب چاہے مع مکان کے دوسرے محلے اور دوسرے احباب کے جوار مین چلا جائے -

ایشیا - تجھ مین سب طرح کے کمال ہین - سارے مذہب - سارے فنون - اور ساری صنعتین تجھ سے نکلی ہین - مگر یورپ کی زبردستیون نے تیرے سارے کمالات پر خاک ڈال دی - اور اسی ناقدری کا نتیجہ ہوم رول کی تمنا و آرزو ہے -

حمّام کی تاریخ

انگریزی مین حمام کو "باتھ" کہتے ہین جسکے لغوی معنی غسل یا نہانے کے ہین اور اس وجہ سے وہان یہ سمجھا جاتا ہے کہ جسم انسان کے گرد و پیش معمولی اوقات مین جس مقدار مین گرمی یا سردی کا اثر ہو اسکے خلاف کسی جگہ زیادہ درجے کی گرمی یا سردی اسکے جسم پر اثر ڈالنے کیلیے پیدا کیجائے

تو وہ مقام ”حمام“ ہے۔ مگر ہمارے یہان صرف اُسی مقام کو حمام کہنا چاہیے جہان کی فضا معمول سے زیادہ گرم کردی گئی ہو۔ اگرچہ اُسی مکان مین گرمیون کے موسم مین کبھی لوگ ٹھنڈے پانی سے بھی نہا لیا کرتے ہون۔

دراصل حمام اُس عمارت کا نام ہے جس مین پانی کے حوض کے نیچے آگ جلا کے حوض کا پانی خوب گرم کیا جائے۔ پھر اُس پانی سے جو بخارات اُٹھین اُن کو دروازے اور باہر کے منافذ بند کرکے محفوظ کیا جائے۔ اور مکان کی فضا اور ہوا جس درجے تک ضرورت ہو گرم کردی جائے۔ اُس مین ایک ٹھنڈا حوض رکھنا بھی لازمی ہے تاکہ جب پانی بہت زیادہ گرم ہو جائے تو اُس کو جس درجے تک مناسب ہو سمو کے معتدل کردیا جائے۔

اس مین نہانے کے طریقے بھی مختلف ہین۔ کہین لوگ حوض مین اُتر کے غوطہ لگاتے ہین۔ کہین حوض سے لوٹے مین پانی لے کے پنڈے پر ڈالتے ہین۔ اور بعض جگہ چھت پر لگے ہوے فوارون اور ہزارون سے مینھ کی طرح اپنے اوپر پانی برساتے ہین۔

نہانے کا آغاز تو اُسی وقت سے دنیا مین ہوگیا ہوگا جب انسان پیدا ہوا اور اُسے صفائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن مذکورۂ بالا خاص شان کے گرم حمامون کا آغاز غالباً بابل اور مصر مین ہی ہوا ہوگا جہان تمدن انسانی یورپ سے پہلے ترقی کرگیا تھا۔ مگر یورپ مین یونان کے پہلے شاعر ہومر کے زمانے تک گرم حمامون کا پتہ لگتا ہے۔ جو حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ۱۴۷۱ سال پیشتر کا زمانہ تھا۔

اُس کے بعد یونانیون مین ایسے گرم حمام کثرت سے بن گئے جو یا تو معزز اُمرا کے گھرون مین تھے اور خاص اُن اور اُن کے احباب کے غسل کرنے کے لیے مخصوص تھے۔ اور یا عام لوگون کے نہانے کی غرض سے تھے۔ لیکن اس کا پتہ لگانا دشوار ہے کہ یونانیون کے وہ حمام کس وضع قطع کے تھے۔ اُن مین گرمی کس درجے تک بڑھائی جاسکتی تھی اور کیونکر بڑھائی جاتی تھی۔ اور نہانے کے کیا کیا مدارج اور طریقے تھے۔ زیادہ تفتیش سے اُنکے حمامون کے متعلق فقط

اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ اُن کے جو حمام عوام کے لیے تھے وہ علی العموم "جِم نے شیہ" یعنی ورزش خانون اور اکھاڑون سے متعلق ہوا کرتے تھے - اور ورزش کرنے کے بعد فوراً اُن مین جا کے وہ لوگ گرم پانی سے نہایا کرتے تھے

یونانیون کے بعد رومیون کا زمانہ شروع ہوا تو ابتداءً اُنھون نے وہی یونانیون کی وضع کے حمام اپنے وہان بنوائے - پہلے پہل رومیون مین حمامون کو زیادہ اہمیت نہ تھی - یہان تک کہ آگسٹس قیصر کا زمانہ آیا - اور اُس کے شوق نے حمامون کو غیر معمولی اہمیت دے کے اُن مین شاہانہ شوکت و رونق پیدا کر دی - رومی حمامون کو "تھرمہ" کہتے تھے - جس کے معنے گرم غسل خانے کے ہین - اور اُس کا صحیح ترجمہ ہمارا عربی لفظ "حمام" ہے گو کہ رومیون مین ہمارے یہان کی طرح ٹھنڈے حمام بھی تھے -

رومی امرا اور قیصرون کی شوقینی کا آخر یہ انجام ہوا کہ رومۃ الکبریٰ کے تمام محلون مین کثرت سے عالیشان حمام تیار ہو گئے - مختلف مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیلے شہر رومہ مین آٹھ سو سے زیادہ ہی حمام تھے - جن مین زیادہ مشہور و معروف حمام اگرپا - حمام انطونیوس - حمام قراقلا - حمام دیوقلی طین - حمام نیرو - اور حمام طیطوس تھے - دیوقلیطین مین کہتے ہین کہ ۱۸۰۰ آدمیون کے نہانے کے چبوترے تھے - اور اُن کی عظمت و رونق اور آراستگی و زیبایش کے جو افسانے بیان کیے جاتے ہین حیرت انگیز ہین - جن رومی حمامون کے منہدم آثار آج باقی ہین اُن کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ عمارتین جب اپنی اصلی حالت پر قائم ہون گی تو کیسی شاندار ہون گی - اور یقین آ جاتا ہے کہ اُنکی نسبت جو کچھ کہا جاتا ہے بالکل سچ ہے -

رومیون مین حمام کرنے کا وقت علی العموم گرمیون مین دن کو دو بجے اور جاڑون مین تین بجے تھا - اور اُن مین نہانے کا طریقہ یہ تھا کہ حمام مین داخل ہونے کے بعد کپڑے اُتارتے ہی کوئی عام قسم کا گاڑھا اور سستا تیل سارے بدن مین لگا دیا جاتا - اس کے بعد وہ افارسٹوئیم مین داخل ہوتے - افارسٹوئیم ایک بڑے ہال کا نام تھا جس مین ہر طرح کی ورزشون کا سامان موجود رہتا - وہان

وہ خوب ورزش کرتے یہان تک کہ خوب پسینہ آجاتا۔ جو ورزش زیادہ عام تھی یہ تھی کہ بھاری فولادی گولون کو اُٹھایا اور مختلف طریقون سے کھلایا جاتا تھا۔

جی بھر کے ورزش کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے گرم کمرے مین جاتے جو کالڈیریم کہلاتا۔ اور اُس مین خوب تیز گرمی ہوتی۔ یہان پیتل اور دھات کے کھانوون سے خوب رگڑ رگڑ کے بدن دھویا جاتا۔ خوب نہادھو لینے کے بعد یہان اُنکے پنڈے مین ایک لطیف خوشبودار تیل لگایا جاتا۔ جس کے بعد وہ ٹیپی ڈوریم مین داخل ہوتے۔ یہ وہ کمرہ تھا جس مین نہانے کے کمرے کے مقابل خفیف درجے کی گرمی ہوتی۔ تھوڑی دیر وہان توقف کرکے وہ فرجی ڈاریم مین جاتے جو ٹھنڈا کمرہ ہوتا تھا۔ اور اُس ٹھنڈے کمرے مین آنے کی ضرورت یہ ہوتی کہ کالڈیریم کی سخت گرمی کے بعد ایک ٹھنڈے مقام مین ٹھہر کے جسم مین کھلی فضا اور باہر کی ہوا مین آنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

یہ تھا رومی حمام جس کا رومیون کو اس قدر شوق تھا کہ جس سرزمین پر جا کے انھون نے قیام کیا اسی قسم کے پبلک حمام وہان اُنھون نے تعمیر کرلیے۔ گرم چشمون سے فائدہ اُٹھایا اور اُنکے پانی کو حمام مین پہونچایا۔ چنانچہ مغربی انگلستان مین شہر باتھ (حمام) رومیون کے اس مذاق کی یادگار آج تک موجود ہے۔

رومیون کے زوال کے بعد قرون وسطیٰ مین یورپ پر مسیحی مقتداؤن کا اثر تھا اور انھین طہارت اور نہانے اور دھونے سے اس قدر نفرت تھی کہ رومیون کے بنائے ہوے تمام حمام منہدم ہوگئے۔ اور جن لوگون کو اُس پر فخر و ناز ہو کہ ہمارے پنڈے مین عمر بھر پانی نہین لگا اُن کے زمانے مین اگلے حمامون کے باقی رہنے اور کسی نئے حمام کے تعمیر ہونے کی کیا اُمید ہوسکتی تھی؟ چند ہی روز مین اہل لک حمام اور اُس کے لطف کو بھول گئے۔ اور اُسکے ساتھ ہی طہارت و نجاست کا امتیاز بھی اُٹھ گیا۔ اور یورپ کی پبلک مین وہ تمام عیوب پیدا ہوگئے جو صفائی اور طہارت کا خیال نہ ہونے کے لازمی نتائج ہین۔ حتیٰ کہ پیشاب پاخانے کے بعد بھی دھونے کی ضرورت نہ باقی رہی۔ اگرچہ اب بہت سے ہندوستانی بحیثیت رہنے مین یورپ کی تقلید کرنے لگے ہیں مگر وہ ننگ وطن ہین۔ اور اس بحث پر

اُنھیں تو شرم نہیں آتی مگر ہم بجائے خود اُن کے عوض شرما لیا کرتے ہیں۔

رومیوں کے بعد سرزمین عرب سے نیّر اسلام طلوع ہوا۔ اور عرب لوگ توحید کندھے پر رکھ کے افریقہ سے ہوتے ہوئے یورپ پہونچے۔ ان موحدوں کے نزدیک نہانا اور وضو کرنا خدا کی عبادت کے لیے لازمی تھا۔ اسی قدر نہیں جنابت کی حالت میں اُنھیں بغیر نہائے ایک گھڑی بسر کرنا بھی دشوار تھا۔ اُن کو غسل و وضو کرتے اور گھڑی بھر کے لیے بھی نجاست کو نہ برداشت کر سکتے دیکھ کر تعصب نے مسیحیوں کو یقین دلایا کہ نہانا دھونا اور بدن کو پانی میں بھگونا ایمانداری کے خلاف اور کافروں (مسلمانوں) کا کام ہے۔ دیندار مسیحیوں کو ان باتوں سے کیا غرض؟ بہرحال مسیحیوں کو طہارت کرنے اور نجاست دُور کرنے سے روز بروز نفرت و مخالفت ہوتی گئی۔ اور نہانے دھونے کا جو کچھ سامان اگلے رومیوں کا مہیا کیا ہوا باقی تھا سب ان کے ہاتھوں فنا ہو گیا۔ جس کا عجیب نتیجہ آج یہ نظر آرہا ہے کہ اسی سرزمین (یورپ) میں جہاں رومیوں نے گانوں گانوں میں حمام بنوائے تھے آج اگر ایک آدھ حمام عجائبات قدرت کے نمونے کے طور پر بنا بھی لیا گیا ہے تو اپنی چیز نہیں بلکہ "ٹرکش حمام" یعنی ترکوں اور مسلمانوں کی چیز کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کو تمدن و دولت حاصل کرتے ہی اپنی طہارت اور صفائی کی ضرورتوں کے لحاظ سے حمام ایک نعمت غیر مترقبہ نظر آیا۔ اُنھوں نے فوراً اُسے اختیار کر لیا۔ اور جہاں جہاں عرب جا کے آباد ہوئے یا دین اسلام پہونچا ہزاروں حمام تعمیر ہو گئے۔ اسی قدر نہیں اُنھوں نے اپنے حماموں میں رومی حمام سے بھی زیادہ ترقی کی۔ چنانچہ فی الحال دنیا کے تمام باعظمت و شان حمام مسلمانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔

اہل اسلام کے حماموں میں سے وہ ورزش خانہ نکل گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ سپہگری کے فنون اور اسلحۂ جنگ کی ورزشوں کا جداگانہ مستقل انتظام ہو گیا۔ اور یہ چیزیں کبھی کبھی کے لیے نہیں بلکہ روزانہ تعلیم میں داخل ہو گئیں۔ ان اسلامی حماموں میں پہلے انسان ایک کمرے میں داخل ہوتا ہے جس کی گرمی اس قدر معتدل

ہوتی ہے کہ ناگوار نہیں گزرتی - اور کوئی مُضر اثر نہین ڈال سکتی - وہان کپڑے اُتار کے اور ایک مناسب زمانے تک ٹھہر کے انسان ایک اور کمرے مین جاتا ہے جو پہلے کمرے سے زیادہ اور نہانے کے کمرے سے کم گرم ہوتا ہے - یہان بھی تھوڑی دیر ٹھہر کے وہ اُس کمرے مین جاتا ہے جہان نہاتا ہے - یہان تک پہونچتے پہونچتے خوب پسینہ آ جاتا ہے - میل چھوٹنے کے لیے خوب پھول جاتی ہے - اب حمامی ایک چوکی پر بٹھا کے تمام جسم پر تیز گرم پانی ڈال دیتا ہے - پھر کیسے سے خوب مل مل کے میل چھڑاتا ہے اور بدن کو صاف کرتا ہے - بالون کو بیسن یا کھلی یا کسی اور چیز سے مل کے دھوتا ہے - اسکے بعد وہ مختلف پیچون اور طریقون سے ہڈیون کے جوڑون کو چٹخاتا ہے اور ایسی اچھی دلک کرتا ہے کہ نہایت آرام ملتا ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ سارے اعضا نرم پڑ گئے - تھکن اور سُستی دُور ہو گئی اور ہاتھ پاؤن کھل گئے - اس کے بعد جسم پر خوب پانی بہا کے اور بخوبی طہارت کر کے انسان لنگی بدل کے حسب ترتیب اُنھین کمرون سے گذرتا ہے جن مین سے ہو کے گیا تھا - اور آخری کمرے مین دم بھر ٹھہر کے اور کپڑے پہن کے اپنے گھر چلا آتا ہے -

تدریجی کمرون کی وجہ سے انسان آخری کمرے مین اُس درجے تک کی حرارت کو برداشت کر لیتا ہے کہ اگر براہِ راست نہانے کے کمرے مین چلا جائے تو وہان کی حرارت اُس کے لیے اس قدر ناقابل برداشت ہو کہ ضرر پہونچا دے - ترکی حمامون مین پتھرون پر گرم پانی چھڑک چھڑک کے نہانے کی کمرے کی حرارت ۱۴۰ درجے تک پہونچا دی جاتی ہے -

حمام اگرچہ سرد ممالک اور ہمارے یہان بھی جاڑون مین نہایت لطف کی چیز ہے اور اُن سے اطبا نے اپنے فن مین بھی بہت فائدہ اُٹھایا ہے مگر اُسکے ساتھ نہایت ہی خطرناک چیز بھی ہین - اگر حرارت اعتدال سے تجاوز کر جائے تو جان کا خطرہ ہے - چنانچہ اگلی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد بادشاہون اور بہت سے امیرون کی جانین حمامیون سے سازش کر کے حمام ہی کے ذریعے سے لی گئی ہین -

---

رقص موریق

یورپ کا ایک خاص قسم کا ناچ ہے جس مین ناچتے وقت پاؤن مین گھنگرو باندھ لیے جاتے ہین۔ ہندوستان مین ناچ مین علی العموم گھنگرو باندھنے کا رواج ہے۔ یہان ناچ مین گھنگرو باندھنا لازمی ہے۔ مگر انگریز ایسا نہین کرتے۔ بلکہ اُنکے وہان جس ناچ مین گھونگھرو باندھے جاتین وہ ناچ رقص موریق کہلاتا ہے۔ اور اُن کا خیال ہے کہ اسکے موجد خاص عرب ہین جن کی صحبت سے پہلے اسپین والون نے سیکھا۔ اور اُن سے سارے یورپ نے تعلیم پائی۔

اس رقص مین خصوصیت یہ ہے کہ گھونگھرو کی آواز تال سُر کے موافق رہتی ہے اور اُنکے نغمے کی دلکشی اور اُنکے بجنے کی مناسب ترتیب حاضرین محفل کو لطف دیتی ہے۔ اگرچہ ممالک یورپ مین تو اب اس رقص کا رواج بہت کم ہوگیا ہے مگر اسپین مین آج تک باقی ہے اور "فنڈانگو" کہلاتا ہے۔

غور طلب یہ امر ہے کہ محققین یورپ پاؤن مین گھونگھرو باندھ کے ناچنے کو مسلمانون کی ایجاد بتاتے ہین۔ مگر ہمین اس کا رواج ایشیا بلکہ تمام مشرقی ممالک مین اس کثرت سے نظر آتا ہے خصوصاً ہندوستان کے قدیم فن رقص مین اس قدر ضروری مانا جاتا ہے کہ اسکی ایجاد کو عربون سے منسوب کرنا بعید از قیاس معلوم معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کی روایتین بتا رہی ہین کہ رقص خاص دیوتاؤن سے اور دیوتاؤن کی پرستش سے شروع ہوا۔ اور اُس قدیم ترین زمانہ سے آج تک اُسی حال پر چلا آتا ہے۔ جس مین غالباً گھونگھرو باندھ لینا اسی زمانے لازمی ہوگا۔

ہندوستان کی موسیقی کی نسبت بھی پہلے سے ہمارا یہی خیال تھا کہ موجودہ موسیقی وہی ہے جو ہندوون کے قدیم عہد مین موجود تھی۔ مگر بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ ہندی موسیقی خالص ہندو موسیقی نہین ہے بلکہ اُس مین بہت بڑا حصہ عربون کی موسیقی کا مل گیا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ رقص مین بھی گھونگھرو باندھنے کا رواج مسلمانون کے آنے سے پہلے نہ ہو۔ اور اس جزو کو یہان کے

ناچ مین مسلمانون ہی نے اضافہ کیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانون سے ہندوون نے سیکھا ہو۔

دنیا مین ناول نویسی کی ابتدا

ناولون اور ناول نویسی کو فی الحال ہم نے اہل یورپ سے لیا ہے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ہماری قدیم امانت ہے جس کو ہم ان امانت داران مغرب سے واپس لے رہے ہین۔ ناول کا آغاز خیالی اور طبعزاد قصون سے ہے۔ جو ابتداءً محض داستان گوئی کی شان سے قلمبند کر لیے گئے۔ اسکے بعد یہ ترقی ہوئی کہ محض خیال آفرینی چھوڑ کے تاریخی واقعات مین رنگ آمیزی کر کے دلچسپ داستانون کی شان پیدا کی گئی۔ اسکے بعد ناول کی ترقی کا تیسرا درجہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کے واقعات نئے نئے اسلوب سے دکھائے جائین اور اُنکے ذریعے سے معاشرت و اصلاحِ زندگی کا سبق دیا جائے۔

مشرق مین سب سے پہلا متمدن ملک مصر ہے۔ اور مصر والون ہی سے قصہ نویسی کا آغاز بھی ثابت ہوتا ہے۔ فراعنۂ مصر کے قدیم عہد کا لکھا ہوا ایک قصہ جو آج سے کچھ اوپر تین ہزار سال پیشتر لکھا گیا تھا ایک پاپرس (مصریون کا پرانا مکتوبہ نما کاغذ جو ایک درخت کی لکڑی کے ورق اُتار کے بنایا جاتا تھا) پر لکھا ہے لندن کے عجائب خانہ "برٹش میوزیم" مین موجود ہے۔ اسکے مختلف اجزا الگ الگ لیے گئے تھے۔ مگر اُسکا مکمل ترجمہ سب سے پہلے مشہور جرمنی محققِ علومِ مصریہ ڈاکٹر برُوغش نے جرمنی زبان میں کیا۔ جو ۱۸۶۵ء مین شایع ہوا تھا۔ اس قصے کو دربارِ شاہی مصر کے ایک وقائع نگار نے فرعونِ مصر "رامیس ثانی" کے فرزند اور ولیعہد "ستی منی قاتہ" کے تفننِ طبع کے لیے لکھا تھا۔

اس قصے کے رنگِ عبارت اور اُسکے مذاقِ ادبی کی نسبت جرمنی محقق "مسٹر ایما نوئیل دیوش" لکھتے ہین کہ "عبارت سادی اور صاف ہے۔ اور گو کہ شاعرانہ تخیل سے خالی نہین مگر اس پر بھی سادی اور سلجھی ہوئی ہے۔ اس کی عبارت بھی اُسی رنگ کا نمونہ ہے جو قدیم الہامی کتابون خصوصاً توراۃ مین پایا جاتا ہے یعنی

بجد صفائی اور سادگی ہے۔"

اس قدیم مصری قصے کا خاکہ یہ ہے کہ دو بھائی ہیں۔ بڑے بھائی کی جورو چھوٹے کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو پوطیفار (عزیز مصر) کی بیوی زلیخا نے حضرت یوسف کے ساتھ کیا تھا۔ چنانچہ وہ اُسے اپنے شوہر کی نظر میں ملزم و مجرم ثابت کر دیتی ہے۔ آخر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے خوف سے گھر چھوڑ کے بھاگتا اور سورج دیوتا کی مدد سے انسانی پیکر چھوڑ کے ایک عجیب قسم کے نئے پیکر کو اختیار کر لیتا ہے۔ اب اصلی واقعہ بڑے بھائی پر کھلتا ہے۔ اُس کی مکار جورو اپنے کیفر کردار کو پہونچتی ہے۔ جس کے بعد چھوٹا بھائی پھر انسانی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور دونوں بھائی الفت و محبت سے ملتے ہیں۔ بڑا بھائی چھوٹے کی قدر اور چھوٹا بڑے کا احترام کرتا ہے۔ اور انجام یہ ہوا کہ بڑا بھائی ترقی کر کے عزیز مصر ہو گیا۔

اس مصری قصے کے سوا یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ ایران و عرب اور دیگر ممالک مشرق میں بہت قدیم زمانے سے خیالی اور طبعزاد قصوں کا عام رواج چلا آتا تھا۔ اُنھیں سے یونانیوں نے قصہ خوانی و قصہ نویسی سیکھی۔ پھر یونانیوں سے اس مذاق کو اہل روم نے حاصل کیا۔ چنانچہ سب سے پہلے لاطینی میں رومیوں نے یونان کی داستان ہائے "ارسٹائڈیز" کا ترجمہ نہایت اہتمام سے کیا۔ اور یہ ترجمہ اُس عہد میں ہوا جب رومیوں میں عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے لیے باہمی خونریزی ہو رہی تھی۔ اور ماریوس اور سیلا ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ رومیوں نے اس قصے کو بہت پسند کیا۔ اور ان میں بھی افسانہ نویسی و قصہ خوانی کا رواج ترقی کرنے لگا۔

مسلمانوں نے اپنے عہد میں افسانہ نویسی کو کسی اور قوم سے نہیں لیا۔ اس لیے کہ خود انسان میں داستان گوئی کا حد سے زیادہ رواج تھا۔ اور عہد جاہلیت سے اُن میں داستان گوئی کی محفلیں مرتب ہوا کرتی تھیں۔ عرب کے اکثر قصوں کا مجموعہ "الف لیلہ" ہے جو دنیا کے سارے افسانوں سے زیادہ پسندیدہ اور ہر قوم و ملک میں رواج پا چکی ہے۔ الف لیلہ کے اصلی مصنف یا مولف کا

نام کسی کو نہیں معلوم - مگر کہا جاتا ہے کہ فارسی کے قصہ "ہزار افسانہ" سے ماخوذ ہے جو ساسانیون کے عہد میں ایران میں مروج اور اہل عجم کو بہت پسند تھا - لیکن اگر یہ صحیح بھی ہے تو عربون نے اُسے اس خوبی کے ساتھ لیا کہ اُس میں عجمی معاشرت کا نام بھی نہین خالص عربی معاشرت اور خلفاے عباسیہ بغداد کی اعلیٰ ترین معاشرت کا نمونہ ہے - مگر کمال یہ ہے کہ اسکے مختلف قصون میں ایسے ایسے عجیب اور جدید واقعات زندگی دکھائے گئے ہین کہ باوجود عربی معاشرت ہونے کے ہر قوم اور ہر زبان میں جا کے تمام افسانون سے زیادہ دلچسپ ثابت ہو جاتی ہے -

انگریزی ناولون کا آغاز رومیون کے ترجمون سے ہوا - جن سے انگلستان کے بہت سے قدیم ترین اور اعلیٰ ترین مصنفین ڈراما نے اپنی تصانیف کے لیے مختلف قصون کے خاکے لیے ہین - مگر یہ عموماً رومیون کی عام پسند بامذاق اور مضحک کاٹ یون سے ماخوذ تھے -

انھین طبعزاد خیالی قصون سے تاریخی ناولون کا آغاز ہوا - کسی عشق یا جنگ کے واقعہ کو گھٹا بڑھا کے ایسی رنگین عبارت مین لکھا جاتا کہ قصہ سے زیادہ لطف تاریخ مین پیدا ہو جاتا -

ملکہ الزبتھ کے عہد مین اسپین کے ناول ترجمہ ہوے جن کا ماخذ عربی مذاق تھا - ان کا پہلا مترجم "جان للیا" تھا - جس کی عبارت مین کسی قسم کی رنگینی یا عبارت آرائی نہ تھی -

سترہوین صدی کے وسط مین مسز افراہن" نے یہ جدید طریقہ اختیار کیا کہ افسانون مین انسان کی معاشرت اور گھریلو زندگی کے نئے نئے نمونے دکھائے جائین - اور اسی عہد مین "مسز مین لے" نام ایک انگلش خاتون نے اپنے ناولون کے ذریعے سے اُس دور کی مروجہ اور پسندیدہ بدکاریون کے نمونے دکھائے - اور سارے مصنف اُسی رنگ کے پیرو ہو گئے -

دہلی اور لکھنؤ کی اُردو

مدت دراز سے یہ جھگڑا چلا جاتا ہے جو کسی طرح طے نہین ہوتا - اور

وہی پرانے اعتراضات و شکوک ہین جن کا بار بار اعادہ ہوا ہے جو نئے پیدا ہوئے مگر سارے کہتے ہین کہ لکھنؤ والون نے اُردو مین عربی الفاظ اور فارسی کو بے ضرورت انتہا پسندانہ
انضباطی سے بھر دیا۔ رعایت لفظی جگت اور قافیہ پیمائی مین پڑ گئے یا ہم اسکول قائم کہتے ہین کہ دہلی والون کی زبان مین پنجابی مل گئی۔ دہان لے لفظون۔ وہان مین لہجے۔ اور وہان کی ترکیبون مین ناگوار سختی اور کرختگی ہے۔ اور فارسی و ہندی جن کی آمیزش سے زبان اُردو بنی ہے اُن کے امتزاج نے تکمیل کا درجہ حاصل نہین کیا تھا اور خامی باقی تھی کہ دہلی اُجڑ گئی۔

لیکن یہ سب باتین غلط ہین۔ دہلی والون کا اعتراض اگر صحیح بھی ہو تو فارسی و عربی کے الفاظ کا بھرتی ہونا کسی غیر مانوس و ناآشنا زبان سے متاثر ہونا نہ تھا عربی ملی ہوئی فارسی ہی کے آغوش مین اُردو پلی تھی۔ اسی زبان سے سبق لے کے اُس نے اپنی حیثیت کذائی حاصل کی تھی اور اُردو شعراے متقدمین اُسی رجحان و شوق سے فارسی و عربی کے الفاظ کو اختیار کرتے چلے آئے تھے جس طریقے سے کہ لکھنؤ والون نے لیا۔ علیٰ ہذا القیاس رعایت لفظی اور مناسبات صوری و معنوی کا لحاظ بھی شعراے فارس و عرب کو ویسا ہی تھا جیسا کہ لکھنؤ مین سب کو یا بعض لوگون کو ہو گیا

دہلی کی زبان پر پنجابی کا اثر پڑنے کے بھی کوئی معنی نہین۔ اہل لکھنؤ کو دہلی کے جو الفاظ یا بندشین اپنی زبان پر غیر مانوس معلوم ہوتی ہین اُن کی نسبت عموماً کہہ دیا کرتے ہین کہ یہ پنجابی کا اثر ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لہجے اور بعض محاورے پنجاب کی زبان سے ملتے ہون اس لیے کہ پنجاب دہلی سے قریب ہے۔ مگر اُنکی نسبت یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ پنجابی زبان کے اثر سے دہلی میں پیدا ہوے۔ یہ کیون نہ کہا جائے کہ دہلی سے پنجابی مین پیدا ہوے۔ بعینہٖ اسی طرح اہل دہلی کہہ سکتے ہین اور کہتے ہین کہ لکھنؤ کی اُردو پر پوربی بھاشا کا اثر پڑ گیا۔ اُردو وہی پر منحصر نہین دنیا کی جو دو زبانین ایک دوسرے کے قریب بولی جاتی ہون گی اُن کا اثر ایک دوسرے پر ضرور پڑا کرتا ہے۔ مگر یہ کہنا کہ اُس اثر سے زبان بگڑی یا بنی یا ایک غیر موجہ اور فرضی چیز ہے۔ اسی طرح یہ بھی لغو

ہندی کی آمیزش عمدہ اور مکمل مزاج نہین پیدا کرنے پائی
نام کسی کو نہین معلوم - ملی اُردو کا کوئی صحیح معیار نہین قرار دیا جا سکتا -
جو سمانیون کے عہد یہ ہے کہ لکھنؤ اور اہل دہلی کی زبان مین جو اختلاف ہے اُسکو اگر یہ صحیح فارسی الفاظ کے زیادہ داخل ہونے سے ہے نہ پاس پڑوس کی زبانون کا نسے اثر پذیر ہونے سے - بلکہ اصلی اختلاف چند الفاظ کی تذکیر و تانیث - چند محاورون اور دونون مقامات کے لہجے اور طرز ادا مین ہے - یہ چیزین دونو مابہ البحث شہرون کے خصوصیات مین سے ہین - جن کا محاکمہ نہ کسی عقلی اصول یا کسی مسئلہ علم معانی و بیان سے ہو سکتا ہے - اور نہ کسی ادبی استدلال سے -

واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان آگرے اور دہلی میں پیدا ہوئی اور وہین نشو و نما پا کے اُس نے اپنی موجودہ صورت پیدا کر لی - شجاع الدولہ آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے زمانون مین دربار دہلی کی کمزوری و بے استطاعتی اور لکھنؤ کے نوابی دربار کی دولتمندی و قدردانی کی وجہ سے قریب قریب دہلی کے تمام صاحبان کمال عام اس سے کہ کسی فن اور کسی طبقے کے ہون لکھنؤ میں پہنچ آئے - اور جو چند دہلی مین پڑے رہ گئے وہ بھی لکھنؤ کو حسرت کی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے کہ وطن مین محفلہائے شعر و سخن کا چراغ گُل ہو گیا تھا -

یہ جگھٹا لکھنؤ مین جمع ہو گیا تو جب تک وہ صاحبان کمال زندہ رہے جو بذات خود دہلی سے آئے تھے یہ سمجھتے رہے کہ وہی دہلی کی سبھا اودھ مین آکے جم گئی ہے - مگر اُنکے مرنے کے بعد اُنکی اولاد نے دہلی کی غلامی سے آزاد ہونے کا دعوے کیا - اپنے وطنی اساتذہ کی شاگردی پر ناز کرنے لگے - اور چونکہ لکھنؤ کے ادبی و علمی اسکول کا بھی اثر پڑنے لگا - جسکو سب سے زیادہ قوت یون ملی کہ صرف و نحو معانی بیان عربی منطق و فلسفہ اور فقہ و اصول فقہ کی منفرد درس گاہ لکھنؤ تھا - لکھنؤ ہی نہین لکھنؤ کے بہت سے قصبات مثلاً بلگرام - سندیلہ گوپامؤ - امیٹھی - وغیرہ بھی علم و فضل کی مستقل درس گاہین تھے - جہان شائقین علم اقطاع ہند سے کھنچ کے آتے اور برسون رہ کے کمال پیدا کرتے - یہ لوگ عربی علم و فن کے علاوہ اُردو کا ادبی مذاق اور سخندانی کا ذوق بھی اپنے

ساتھ لے جاتے - اور سچ یہ ہے کہ اُردو زبان گو کہ دہلی مین پیدا ہوئی مگر سارے ہندوستان مین اُس کی اشاعت لکھنؤ کے ذریعے سے ہوئی -

لکھنؤ کی اس ادبی خود سری نے ادب اُردو کے دو جداگانہ اسکول قائم کردیے - ایک دہلی کا اور ایک لکھنؤ کا - اور سارا ہندوستان اُردو دانی مین ان دونون اسکولون پر بنٹ گیا - ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہین کہ ان دونون اثرون کی تقسیم بلحاظ جغرافیہ کیا ہے - شمالی ہند مین پنجاب سے لے کے بریلی تک دہلی کا اسکول مرکز زبان مانا جاتا ہے - لہذا اہل لاہور - میرٹھ - علی گڈھ - مرادآباد - بدایون - اٹاوہ - اور بریلی خالص دہلی کی زبان کے پیرو ہیں - شاہجہان پور سے لیکر کلکتہ تک لکھنؤ کی زبان کا اثر مانا جاتا ہے - اور وہان کے شعرا و زباندان لکھنؤ کی زبان کے پیرو ہین - چنانچہ شاہجہانپور - کانپور - جونپور - فیض آباد گورکھپور - بنارس - اعظم گڈھ - غازیپور - پٹنہ - عظیم آباد - مرشدآباد - ڈھاکہ کلکتہ - ان سب مقامات کے لوگ لکھنؤ کی زبان کو دہلی پر ترجیح دیتے ہین -

رہا جنوبی ہندوہان کے لوگون کا کوئی عام مذاق یا رجحان نہین ہے بلکہ جس سوسائٹی مین جس شہر کا اُستاد اپنا سکہ جمالیتا ہے لوگون کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے - حیدرآباد ہیں اگرچہ زبان اُردو براہ راست دہلی سے گئی - بلکہ سچ یہ ہے کہ پہلے اُستادان اُردو دکن ہی مین پیدا ہوے اور زبان اُردو چاہے دہلی سے دکن مین گئی ہو - مگر اُردو شاعری دکن سے دہلی مین آئی لیکن آخر مین شعراے دہلی و لکھنؤ کا ایسا سکہ جما کہ سارے دکن کے شعرا کو اُنکے آگے سر جھکا دینا پڑا - اور ضروری ہوگیا کہ دہلی یا لکھنؤ مین سے کسی ایک شہر کی زبان کو اختیار کرین - رشید الدین خان نے اپنی تاریخ رشید الدین خانی مین زبانِ لکھنؤ کی خوبی کو بڑے زور سے تسلیم کیا ہے - اور چند روز پیشتر وہان کا عام رجحان زبان لکھنؤ کی طرف تھا - داغ مرحوم کے اثر نے بہت سے دلون پر دہلی کا سکہ جما یا - مگر اُنکے زمانے ہی مین امیر مرحوم کا بہت کچھ اثر موجود تھا - جس کو اب حضرت جلیل نے زندہ کردیا - اور فی الحال حیدرآباد کی شاعری کا رجحان جس قدر حضرت جلیل - اختر مینائی - اور مولوی سید علی حیدر صاحب نظم

لکھنؤ ہی کے کلام اور اُنکی زبان کی طرف ہے دہلی کی زبان کی طرف نہین یمین السلطنۃ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بھی جو بجاے خود ایک شاعر شیوا بیان اور ادیب بے ہمتا ہین پنڈت رتن ناتھ سرشار اور دیگر اساتذۂ لکھنؤ کی دوستی کی بدولت لکھنؤ کی زبان کے مربی ہین - اور جہان تک میرا خیال ہے اعلیحضرت محی الملۃ والدین خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے کلام سے اُنکا رجحان بھی لکھنؤ ہی کی طرف پایا جاتا ہے - لیکن وہین ہمارے مکرم دوست مولوی عبدالحق صاحب بی اے اپنی وطنی اثر اور علیگڈھ کی تعلیم کی برکت سے دہلی کے اسکول زبان کے دلدادہ ہین - اس مین کوئی مضائقہ نہین - مگر اُنکے اس رجحان کا اگر یہ نتیجہ ہو کہ انجمن ترقی اُردو کی ہر کتاب کے دیباچے مین لکھنؤ کی اُردو پر حملے کیے جائین تو ضرور افسوس کے قابل ہو گا - اس سے وہ اُردو کو فائدہ نہین بلکہ نقصان پہونچائین گے -

لکھنؤ اور دہلی کی زبانون کا محاکمہ کرنا اُن کا یا میرا یا کسی شخص کا کام نہین ہے - یہ مسئلہ اب اس درجے سے گذر گیا کہ کسی فیصلہ کرنے سے فیصلہ ہو جائے - یا جھگڑا چکے - غذا - خوشبو - نغمہ اور اس قسم کے صدہا ذوق ہین جو "العادۃ کالطبیعۃ الثانیہ" کے اثر سے انسان کے دماغ مین بس جاتے ہین اور پھر اُن سے وہ اس قدر متأثر ہو جاتا ہے کہ کوئی فیصلہ اور کوئی فلسفہ اُنکے اثر پر غالب نہین آ سکتا - ایک غذا یورپ والون کو سب سے زیادہ لذیذ - ایک خوشبو اہل فرنگ کو سب سے بڑھ کے فرحت بخش اور ایک نغمہ اہل مغرب کو لذیذ ترین غذاے روح معلوم ہوتا ہے مگر ہندوستان والون کو وہ تینون نہایت ہی بدمزہ - دماغ سوز اور عذاب جان محسوس ہوتے ہین - کوئی صاحب ہین جو اسکا فیصلہ کر دین یا اس جھگڑے کو مٹا دین ؟

یہی حالت زبان کی ہے - ایک بچہ جس سرزمین مین پیدا ہوتا ، جس آغوش مین پلتا ، جن بچون مین کھیلتا ، جن دوستون سے ملتا جلتا ہے اُنکی زبان اُسکے دل و دماغ مین جم کے بیٹھ جاتی ہے - اور وہی زبان اسکو دنیا کی بہترین زبان نظر آنے لگتی ہے - جس طرح ایک بچہ مسلمان گھر مین پیدا ہو کے

کی اگلی نامور شاہنشاہیون کی یادگار عمارتون پر کندہ ہین - اُسکے حروف علی العموم میخون یا تیر کے پھلون (پیکانون) کی قطع کے ہوتے ہین - اسی وجہ سے حال کی دنیا نے اس خط کا نام "خط پیکانی" رکھ دیا ہے -

اس خط کے اکثر کتبے بڑی بڑی چٹانون اور عہد قدیم کی مورتون پر کھدے ہوے ہین - یا اینٹون اور کھپرون پر چھاپے کے طریقے سے بنا دیے گئے ہین - یہ کتبے دولت عجم کے قدیم دار السلطنت پرسی پولی (اصطخر) کی پرانی یادگارون پر - جا بجا ساسانی سلطنت کے اور بہت سے شہرون مین - بابل اور نینوا کے کھنڈرون مین اور نیز مصر کے بعض آثار منہدمہ مین بھی نظر آتے ہین - بظاہر اسباب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل اس خط پیکانی سے اشوریا اور میڈیا مین کام لیا گیا - بعد ازان یہ تحریر پورے عجم اور دولت فارس کی ساری قلمرو مین پھیل گیا -

اس کے خط کے حروف تین جداگانہ شانون کے برآمد ہوے ہین - اور اکثر مقامات مین اس خط کی تینون شانین ایک ہی جگہ یون دکھا دی گئی ہین کہ تینون وضعون کے حروف تین متوازی کالمون مین برابر برابر منقوش ہین - اور ایک ہی مطلب یا ایک ہی الفاظ تینون خطون مین کندہ کر دیے گئے ہین تا کہ ان مین سے جس کسی کو کوئی پڑھ سکتا ہو پڑھ کے دوسرون کا بھی طلب سمجھ جائے - ان تین شانون مین سب سے قدیم اشوریا والون کے خط پیکانی کی شان ہے - اس مین تقریباً ۴۰۰ متمائز اور جداگانہ حروف ہین - دوسری شان میڈیا والون کی ہے جو در اصل پہلے ہی خط کی اصلاح و تہذیب ہے - اور اُس مین گھٹا کر ۱۰۰ حروف رکھ لیے گئے ہین - تیسری اور سب سے پچھلی شان فارسیون کے خط کی ہے - جس مین فقط ۳۹ سے لے کے ۴۴ تک حروف تہجی باقی رہ گئے ہین - اور یہی خط پیکانی سب سے زیادہ مکمل اور اصلاح شدہ ہے - سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے حرفون مین باہمی تشابہ و التباس نہین باقی رہا ہے کہ ایک حرف پر دوسرے کا شبہہ ہو سکے - اُسکے حروف نہایت ہی واضح و متمائز بھی ہین - اور اُن کے پڑھنے مین بہت کم دشواری یا غلطی ہو سکتی ہے اسکے علاوہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ الفاظ ایک ترچھی لکیر کے ذریعے سے جدا اور ممتاز

کر دیے جاتے ہین - جو فارسی زبان اس خط مین لکھی ہوئی ہے اُسکی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ موجودہ فارسی کی مان یہی ہے - اور حیرت کی بات ہے کہ موجودہ حالت سے الگ ہو کر وہ سنسکرت سے بہت قریب ہو گئی ہے - جس سے یہ خیال قائم ہو گیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت زبانین اصل مین کبھی ایک ہی تھین -

اشوریا والون کے کتبون مین مختلف پیکانی قطع کے حروف ابتدائی خیالات ظاہر کرتے تھے - لیکن بیرونی ممالک کے لوگ یا جو لوگ دوسری زبان بولتے تھے اُنکی تحریر مین اُنھین الفاظ کی شکلین جو اُسی خیال کو ظاہر کرتین اشوریا والون کی لفظون کی شکلون سے جداگانہ تھین - اس خط مین بہ تعمق غور کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ حروف جن سے ایک لفظ مرکب ہوتا وہ بلا لحاظ اپنی شکلون کے ایک خاص خیال کو ظاہر کرتے - نتیجہ یہ تھا کہ ایک جملے کے سمجھنے مین یہ بڑی دشواری پیش آجاتی کہ آیا یہ جملہ خیالات کی شکلون کے لحاظ سے لکھا گیا ہے یا آوازون کی شکلون کے لحاظ سے - پھر اس سے بھی زیادہ مشکل یہ بات تھی کہ بعض حروف مختلف خیالات کی جگہ پر استعمال کیے جاتے - اور اس کا پتہ لگانا کہ یہان کون سا خیال مقصود ہے نہایت ہی دشوار تھا - لیکن خزف پارون پر بعض کھڑی کھڑی سطرین لکھی ملین جن سے بڑی مدد ملی - ان مین پہلے تو یہ بتا دیا گیا تھا کہ کون کون حروف خیالات کے ادا کرنے کے لیے مخصوص ہین - اور اُنکے مقابل وہ تمام حروف کندہ تھے جو آوازون کو ادا کرتے ہین یا خاص خاص آوازون کے لیے قائم کیے گئے ہین - چند ایسے خزف پارے ملے جن مین الفاظ کے مقابل اشوریا کی زبان مین اُن کا مطلب بھی بیان کر دیا گیا تھا -

یہ پیکانی وضع کے حروف اصطخر کے کھنڈرون مین پہلے پہل ۱۰۲۷ سنہ محمدی - (۱۶۱۸ء) مین نظر آئے - لیکن اُسوقت نہ اُن کا کچھ مطلب سمجھا جا سکتا تھا اور نہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ کیا ہے - ۱۰۸۳ سنہ محمدی (۱۶۷۴ء) مین ایم چارڈون نام ایک شخص نے اُن مین سے بعض کتبون کی نقلین لے لین - اور اُن پر غور ہونے لگا - یہان تک کہ ۱۲۱۷ سنہ محمدی (۱۸۰۲ء) مین ایک مستشرق عالم یورپ ٹامس ہائڈ نے اُس پر بے انتہا فکر کی - اور بڑے غور و پرداخت کے بعد اُس نے جو رائے قائم

گی یہ تھی کہ یہ کوئی تحریر نہیں۔ فقط خیالی شکلیں ہیں جو اس غرض سے بنا دی گئی ہیں کہ طرح طرح کے پیکانی نقش و نگار بنا کے خوشنمائی پیدا کی جائے۔ بعض لوگوں کا خیال اس جانب گیا کہ معماروں نے محض اتفاقی طور پر یہ نقش بنا دیے ہیں۔ ورنہ ان سے کوئی خاص غرض نہیں مقصود ہے۔ ایک جرمنی بزرگ نے یہ فرمایا کہ یہ نقش کیڑوں اور حشرات الارض نے بنا دیے ہیں۔ مگر باوجود ایسے خیالات کے ظاہر کیے جانے کے لوگوں کو اطمینان نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ نیبر نام ایک محقق نے اس بات پر اپنا یقین ظاہر کیا کہ یہ نقوش بے وجہ نہیں۔ اور بجز اسکے اور کوئی بات نہیں کہ یہ نقوش کسی اگلے رسم خط کے حروف ہیں۔ چند روز میں دیگر مبصرین بھی نیبر کے ہم خیال ہو گئے۔ مگر ایسی ہی کوئی تدبیر کسی کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ ان تحریروں کا مطلب سمجھا جا سکے۔ سنہ ۱۲۳۱ محمدی (سنہ ۱۸۰۲ع) میں جرمنی کے ایک مشہور عالم السنہ گروٹ فنڈ نے اعلان کیا کہ میں نے اس خط پیکانی کے تمام حروف بھی پڑھ لیے اور پتہ لگا لیا کہ یہ کتبے کیونکر پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ۳۳ سال تک خاموشی رہی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۲۶۴ محمدی (سنہ ۱۸۳۵ع) میں سر ہنری رالنسن نے ایران کا سفر کیا۔ کوہ بے ستون کے مشہور و معروف کتبے کو خود جا کے دیکھا۔ اور اسکی نقل اُتار لی۔ ایک بلند پہاڑ کے ایک پہلو پر جس جانب سر بفلک چٹان سیدھی بخط مستقیم کاٹ کے مسطح کر دی گئی ہے، دامن کوہ سے ۳۰۰ فٹ کی بلندی پر یہ کتبہ کھدا ہوا ہے۔ جہاں تک بمشکل انسان کی رسائی ہو سکتی ہے۔ یہاں پہاڑ کے اُس مسطح پہلو پر خط پیکانی میں تین تحریریں ہیں اور شان و رسم خط میں تینوں ایک دوسرے سے جدا اور متمائز ہیں۔ باوجود اسکے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اگرچہ تینوں خطوں کی شان بدلی ہوئی ہے مگر اصل میں ہے ایک ہی خط۔

یہ نقل لانے کے بعد سر ہنری رالنسن نے اُسپر غور کرنا شروع کیا۔ اور آخر محنت و جستجو کے بعد انھیں پوری کامیابی ہوئی۔ فارسی زبان سے وہ بخوبی ماہر تھے۔ پُرانی فارسی کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اسی فارسی دانی کی مدد سے انھوں نے یہ کتبے پڑھ لیے۔ اُن کا ترجمہ کیا۔ اُنکو اس تحریر میں ہر حرف اور

ہر لفظ کی آواز معلوم ہوگئی اور ربط عبارت کا سلسلہ بھی معلوم ہوگیا۔

اسکے بعد انگلستان اور دیگر ممالک یورپ کے علمانے اس جانب بے انتہا توجہ کی۔ اور ان تمام کتبون اور تحریرون کو جو پرانی عمارتون کے درودیوار پر، پہاڑون کے پہلوون میں، اور ظروف یا کھپرون کے خزف پارون پر ملین سب پڑھ لی گئین۔ اور اس ذریعہ سے اشوریا۔ بابل اور فارس کی اگلی سلطنتون کا بہت معتد بہ حصہ جو تاریخون مین موجود نہ تھا دنیا کو معلوم ہوگیا۔ اسی قدر نہین تفتیش و جستجو کا جو سلسلہ جاری ہوگیا ہے اور جو نیا کتبہ زمین سے نکلا یا کسی کھنڈر مین مل جاتا ہے ایک نئے صفحۂ تاریخ کا کام دیے جاتا ہے۔

رقص (اپریل ۱۹۱۹ء)

اگرچہ رقص اور سرود کا ساتھ ہے مگر ناچنا بذاتہ ایک نہایت ہی دلچسپ فن ہے۔ اس کا اصل منشا یہ ہے کہ پاؤن ایک معینہ و مقررہ مقدار و ترتیب سے اٹھائے جائین یا گانے مین اسکی گت کی مناسبت سے جسم کو حرکت دی جائے۔ ناچنا ان فطری جذبات سے ہے جن کی تعلیم خود فطرت نے دی ہے۔ اسی وجہ سے اس بات کا پتہ لگانا غیر ممکن ہے کہ انسان مین ناچ کا آغاز کب سے ہوا۔ اس کا پہلا موجد کون شخص ہے۔ یا پہلے پہل اس کا رواج کس قوم اور ملک مین ہوا۔ نہایت ہی وحشی و غیر متمدن قومون مین بھی ناچنے کا رواج قدیم سے قدیم زمانے مین پایا جاتا ہے۔

ہندوستان مین ناچ ایک بہت بڑا اہم فن ہے۔ اسکے موجد اولین مہادیوجی سمجھے جاتے ہین۔ اور اس کی ابتدا برہماجی کی پرستش و عبادت سے بتائی گئی ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ ناچنا فطری جذبات انسانی کے تقاضے سے ہے۔

ناچ کو عبادت سے وابستہ کرنا ہندوستان کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ دیگر اقوام نے بھی عبادت الٰہی مین اس سے کام لیا ہے۔ یہودیون مین بھی جو بت پرستی سے بالکل گریزان و متنفر تھے بعض موقعون پر ناچنا داخل عبادت تھا۔ توراۃ کے الفاظ ہین کہ "انھین ناچ کر خدا کی حمد کرنے دو۔" اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ "حضرت داؤد خدا کے سامنے ناچے۔" مسلمانون کو ان بیانات سے وحشت نہ

دکھانا چاہیے۔ اس لیے کہ دراصل ناچ جس چیز سے عبارت ہے اُس میں ہم کچھ نماز میں بہ ترتیب اُٹھنا بیٹھنا۔ رکوع و سجود کرنا کلام الٰہی سے متاثر ہوکر آپ سے کسی بیتابی کی حرکت کا ظاہر ہوجانا۔ شعر خوانی میں الفاظ کے مطابق ہاتھ پاؤں اور چشم و ابرو کو حرکت دینا۔ یا مشائخ صوفیہ کا صحبتِ سماع میں بیتابی سے اُٹھ کھڑا ہونا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگنا۔ یہ سب چیزیں رقص میں داخل ہیں۔

قدیم یونانیوں نے رقص کو علمی شان سے منضبط کردیا تھا۔ اور غرض یہ تھی کہ اُس کے ذریعے سے مختلف قسم کے جذبات نہایت ہی خوبی کے ساتھ نمایاں کیے جاسکتے۔ ہومر کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانیوں میں اکثر تقریبوں کے موقعوں پر ناچ ہوا کرتا تھا۔ ارسطاطالیس رقص کو بھی فنون شعر و نظم کے زمرے میں شامل کرتا تھا۔ اسپارٹا والے جو یونانیوں میں نہایت ہی بانکے جانباز سپاہی تھے بچوں کو پانچ ہی سال کی عمر سے ناچنے کی جبریہ تعلیم دینا شروع کردیتے تھے۔ وہاں بڑے بوڑھے سکھاتے اور قوم کے سارے بچے سیکھتے۔ اہل اسپارٹا ناچ کے ساتھ بھجن اور مختلف قسم کے گیت بھی گایا کرتے اسپارٹا کے نوجوانوں میں ایک خاص قسم کا ناچ "رقص فیرک" کا رواج تھا۔ یہ ایک جنگی ناچ تھا۔ جس کو ایک نمائشی لڑائی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

قدیم الایام کے لوگوں میں تین طرح کے رقصوں کا پتہ لگتا ہے (ایک) جنگی ناچ جو درحقیقت ایک قسم کی ورزش تھی۔ اور اُس کا مقصود یہ تھا کہ جسم تیار کیا جائے اور خوبصورت بنایا جائے۔ (دوسرا) تفریحی ناچ یہ صرف دل بہلانے اور صحبت میں زندہ دلی و برانگیختگی پیدا کرنے کے لیے ہوتا۔ (تیسرا) دینی ناچ یہ عبادت کے ساتھ مخصوص تھا اور توبہ کرانے یا چڑھاووں کے موقعوں پر جوش و خروش کے ساتھ عمل میں آتا۔

مصریوں میں ناچ فراعنہ کے زمانے سے ثابت ہوتا ہے۔ فرعونوں کے دربار میں اُنکے سامنے ناچنے والی عورتیں کھڑی ہوکر ناچا کرتی تھیں۔ اُسی طرح آج بھی مصر کے بازاروں اور وہاں کی صحبت ہائے عیش میں وہ پیشہ ور عورتیں ناچا کرتی

ہین جو اپنے آپ کو خاندان برامکہ کی یادگار بتاتی ہین -

اشوریا و بابل مین بھی معلوم ہوتا ہے کہ فتحمند فوجون کے آگے آگے نازنین و حسین عورتین ناچتی اور کھیلتی ہوئی چلتی تھین -

ہندوستان مین بھی ناچنے والی عورتون کا رواج نامعلوم زمانے سے چلا آتا ہے اُن مین سے اکثر مندرون مین روز دیوتاؤن کی مورتون کے سامنے ناچا کرتی تھین ایک ہزار سال پیشتر کا ایک عرب سیاح کہتا ہے "بعض راجاؤن کی سواری کے ساتھ بہت سی عورتین ناچتی ہوئی چلتی ہین"- عبادت کے لیے عورتون کے ناچنے کا رواج دکن کے بڑے مندرون مین آج بھی موجود ہے -

ساسانیون کے عہد مین ایران میں بھی رقاصہ عورتین موجود تھین - اور یہود مین تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادیون اور امیرزادیون تک کے لیے کسی صحبت مین کھڑے ہو کر ناچنا معیوب نہ تھا - ہیروڈ یہ جس نے بادشاہ کو اپنے رقص سے از خود رفتہ کر کے حضرت مسیح کو بپتسمہ دینے والے یحییٰ کا سر کٹوایا شاہزادی تھی -

ابتدائی زمانے کے مسیحی بھی اپنے مذہبی جلسون مین ناچا کرتے تھے - گو کہ انجیل مین اس کا ذکر نہین ہے مگر اُنھون نے اپنے طرز عمل سے رقص کو عبادت بنا لیا تھا -

اسلام مین البتہ بجز صوفیہ کی مجالس حال و قال کے قرآن و حدیث یا فقہ سے کہین اور کسی زمانے مین نہین ثابت ہوتا کہ رقص سے عبادت و خدا پرستی مین کام لیا گیا ہو - بلکہ علما علی العموم اُسکے حرام ہونے کا فتوے دے رہے ہین - مگر ہماری سمجھ مین نہین آتا کہ اِس فتوے کی بنیاد کیا ہے - قرآن و حدیث سے اسکی حرمت ثابت نہین ہوتی - اہل حبشہ کا رقص خود حضرت سرورعالم نے ملاحظہ فرمایا اور خاتون محترم ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے دکھایا تھا -

یورپ مین ناچنا اعلیٰ درجے کی شریفانہ صحبتون مین مہذب ترین دلچسپی تصور کیا جاتا ہے - اعلیٰ و ادنیٰ ہر طبقے کے زن و مرد بے تکلف ناچتے ہین - اور رقص کی تعلیم بچپن سے لازم ہوگئی ہے - خصوصاً لڑکیان اگر ناچنا نہ جانتی ہون تو بالکل پھوہڑ خیال کی جاتی ہین -

یورپ والون کا عام خیال ہے کہ رقص سے صحت اور اخلاق دونون پر نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔ مگر ہندوستان مین رقص چونکہ بدکار و عصمت فروش عورتون کا پیشہ ہے اس لیے اُس مین دلچسپی چاہے جس قدر زیادہ ہو مگر صحت و اخلاق پر ہرگز اچھا اثر نہین پڑ سکتا۔

ہمارے شعرا مین رقص بسمل بہت مشہور ہے۔ اس سے علی العموم کاری زخم کھانے یا ذبح ہونے کے بعد نیمجان لاش کا تڑپنا مراد لیا جاتا ہے۔ مگر بعض ظالم و بہائم صفت وحشی قومون مین رقص بسمل کا خوفناک تماشا حیرت ناک بیرحمی و سنگدلی کی مسرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اس طرح کہ رقص بسمل کے شایق کسی جنگل مین مسافرون کی رہگذر پر جا کے جمع ہوتے ہین۔ اور آگ جلا کے اُسپر ایک لوہے کا توا رکھ دیتے ہین جو خوب گرم ہو کر سرخ ہو جاتا ہے۔ اُسوقت جو مسافر یا اجنبی شخص مل جاتا ہے اُسکو پکڑ لیتے ہین اور فوراً تلوار سے اُس کا سر کاٹ کر وہ جلتا توا گردن پر رکھ دیتے ہین۔ توا جم کے بیٹھ جاتا ہے۔ خون جو جوش مار کے نکلنا چاہتا ہے محتبس ہو کر بند ہو جاتا ہے اور بے سر کی لاش جس کی گردن پر سر کے عوض توا ہوتا ہے گھنٹون دوڑتی کودتی ناچتی اور گرتی پڑتی ہے۔ جسکو دیکھ کر وہ لوگ قہقہے لگاتے اور بہت ہی خوش ہوتے ہین۔

افسوس انسان مین اگر رحم اور خدا کا خوف نہ ہو تو اُس سے زیادہ وحشی و خونخوار کوئی نہین ہو سکتا۔ درندہ پیٹ بھرنے کے لیے ذی روح مخلوق کی جان لیتا ہے اور وہ بے ضرورت محض تفنن طبع۔ اور دل بہلانے کے لیے۔ جانور بھوک کے تقاضے سے کسی جاندار کو مارتا ہے تو وہ سیر و تفریح اور دلچسپی کے لیے جس کا نام شکار رکھ دیا گیا ہے۔

گلستان

شیخ سعدی کی کتاب گلستان کو پڑھتے تو سب ہین مگر شاید یہ کسی کو نہ معلوم ہوگا کہ اُس کے نام کا ماخذ و مخرج کیا ہے۔ اور لوگ یہ سُن کر تعجب کرین گے کہ اس نام کا اصلی ماخذ یونانی زبان اور اُس کا ادب ہے۔

ولادت حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوا چھ سو برس پیشتر یا یون کہیے کہ حضرت مسیح سے پہلی صدی کے وسط مین ارضِ شام کے شہر غدارہ مین ملیاغر نام زبان یونانی کا ایک شاعر و معلم رہتا تھا۔ اس نے اپنے زمانے تک کے یونانی شاعرون اور ادیبون کے نظم و نثر کلام کا ایک منتخب مجموعہ مرتب کیا جس مین ہر شاعر کی بہترین نظمین اور ہر ادیب کی افصح و مؤثر و مختصر نثرین جمع کی تھین۔ ملیاغر نے اس مجموعہ مین یونانی شاعرہ سافو سے لے کر اپنے عہد تک کے تمام شعرا و اُدبا کا منتخب کلام جمع کیا تھا۔ اور آخر مین اپنا بھی بہت سا کلام درج کر دیا تھا۔ اُسکے شروع مین اپنی ایک تمہیدی نظم درج کی جس مین ہر شاعر کو اپنے خیال و مذاق کے مطابق کسی خاص پھول سے تشبیہ دے کر اُسی پھول سے تعبیر کیا۔ اور اسی رعایت سے اُس مجموعے کا نام "پھولون کا ہار" رکھ دیا۔

ملیاغر کے بعد تھسالونکا کے فلپ نے اس "پھولوں کے ہار" مین زمانۂ مابعد کے تیرہ اور شاعرون اور انشا پردازون کے کلام کا انتخاب اضافہ کیا۔ اور اپنے اس نئے مجموعۂ سخن کا نام "انطالوغی" رکھدیا۔ یونانی زبان مین "انطوس" پھول کو کہتے ہین اور "لوغیہ" کے معنی خرمن کے ہین۔ لہذا "انطالوغی" کا لغوی ترجمہ "خرمنِ گل" یا "گلستان" و "گلزار" ہے۔

فلپ کے بعد شہر ہرقلہ کے دیوجیناؤس۔ شہر سارڈیس کے اسٹراٹو اور اغاتھیاس نام ایک اور یونانی سخن سنج نے جو اپنے دَور کے بڑے نامور اساتذۂ سخن مین تھا۔ بہت سے نئے منتخبات کے اضافے کر کے نئے نئے مجموعے شایع کیے۔ مگر ان سب مجموعون کا نام وہی "انطالوغی" یعنی گلستان یا خرمنِ گل رہا۔ جن مین سو یونانی شعرا اور ادیبون کی ۴،۵۰۰ نظمین اور نثرین درج تھین۔ اور اب یونانی مین اس قسم کے مجموعون کا عام نام "انطالوغی" ہوگیا۔ گویا یہ کسی کتاب کا نام نہین بلکہ ایک فن یا خاص قسم کی کتابون کا عام نام تھا۔ چند روز بعد یونانی زبان کے تمام مذکورہ مجموعہ ہاے سخن دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔ فقط "انطالوغی" کا نام رہ گیا۔ جس پر یورپ کی زبانون نے اپنے لب و لہجہ کے لحاظ سے تصرفات کیے۔ چنانچہ انگریزی مین وہ "انتھالوجی" بن گیا۔ انگریزی مین آج بھی اس قسم کے

بے دلیل خدا کو مانتا ہے اُسی طرح ایک لڑکا کسی زبان کو آغوش مادر مین سیکھ کے بے دلیل اُسکی خوبیون کا قائل ہو جاتا ہے - اس لیے اس بات کی امید رکھنا حماقت ہے کہ جو بچے دہلی و توابع دہلی مین پیدا ہوکے - وہان آغوش میں پل کے اور وہان کی صحبتون مین اُٹھ بیٹھ کے بڑا ہوا ہے لکھنو کی زبان کو پسند کرے گا اور اسی طرح اسکے برعکس یہ خیال کرنا جنون ہے کہ جو لوگ لکھنو اور توابع لکھنؤ مین پیدا ہوے ہین اور وہین کی سوسائیٹیون مین اُن کا نشو و نما ہوا ہے وہ دہلی کی زبان کو کسی دلیل یا فیصلے سے مان لین گے - مین ہون یا ہمارے دوست مولوی عبدالحق صاحب دونون پر یہی اثر پڑا ہوا ہے - اور اُسکا نتیجہ یہ ہے کہ اپنی اپنی زبان کی خوبیون کے دلدادہ ہین - اور دوسرے اسکول کی زبان پر اعتراض اور نکتہ چینیان کرتے ہین - جن سے سوا اپنا دل خوش کر لینے کے کوئی نتیجہ نہین حاصل ہو سکتا - مولوی عبدالحق صاحب اطراف میرٹھ مین پیدا ہوے - اور علیگڈھ مین تعلیم پائی - یہ دونون شہر زبان دہلی کے زیر اثر ہین - اس لیے اُنکے کانشنس سے بجز اسکے کہ لکھنؤ کی زبان کو پسند نہ کرین ہم اور کوئی امید بھی نہین کر سکتے - بیشک زبان مین لکھنؤ والون کے تصرفات انکو ناگوار گذرتے ہون گے مگر اس ناگواری کو اُنھین تھوڑی نفس کشی اختیار کر کے برداشت کرنا چاہیے - کیونکہ اس نزاع مین وہ قاضی نہین بلکہ فریق ہین -

قابل لحاظ فقط اُن لوگون کا بیان ہو سکتا ہے جو ہون تو لکھنؤ کے اثر کے ساختہ و پرداختہ مگر زبان دہلی کی تعریف مین رطب اللسان ہون یا بخلاف اسکے اُنھون نے دہلی مین نشو و نما پایا ہو اور زبان لکھنؤ کی مدح سرائی کرتے ہون - مثلاً غالب مرحوم کہ اگرچہ دہلی کے اُستاد عدیم المثال اور شاعر صاحب کمال تھے مگر لکھنؤ کی حد سے زیادہ مدح خوان تھے اور تسلیم کرتے تھے کہ دہلی کی زبان مٹ گئی -

یا مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور جو اکبر آباد آگرہ مین پیدا ہوے وہین نشو و نما پایا - تا شیبے ہمتاب نمنے کے بعد لکھنؤ مین آئے - اور یہان کی معاشرت و زبان اس قدر پسند آئی کہ بہ آواز بلند مدح خوانی کرنے لگے - اور اس کا یہ

انعام ملا کہ وہ لکھنؤ والے خیال کر کے مورد سہام بن گئے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم باوجودیکہ ثقہ آدمی تھے اور جانتے تھے کہ مرزا رجب علی بیگ صاحب بھی ایک شریف آدمی ہین اُن سے دست و گریبان ہو گئے اور اُنھین "لکھنؤ کا شہدا" کہدیا۔ اور آج تک اکثر آپے سے باہر ہو جانیوالے دلدادگان زبان دہلی جب قلم اُٹھاتے ہین اُنکی یہ سنت ادا کرنے کے لیے مرحوم مرزا صاحب کو دو ایک گالیان ضرور دے دیا کرتے ہین۔ اور اس کا خیال نہین کرتے کہ وہ بیچارے تو خاص اکبر آباد کے رہنے والے اور دہلی کے اسکول زبان کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ تلاش معاش مین لکھنؤ آئے۔ لوگون نے قدر کی۔ دیگر صاحبان کمال کی طرح ہاتھون ہاتھ لیا اور اُستاد بنا دیا۔ رہا اُنکا رنگِ عبارت تو اُنکے زمانہ تک لکھنؤ ہو یا دہلی سب جگہ کا وہی رنگ تھا جو فارسی کی نثّاری سے ماخوذ تھا۔ اُسی رنگ کو اُن دنون تمام اہل علم لکھنؤ کے ہون یا دہلی کے پسند کرتے تھے۔ اور اگر انگریزی تعلیم نے ترقی کرکے اُردو کے لیے ترقی کی سڑک نہ بدل دی ہوتی تو آج بھی سب جگہ وہی رنگ ہوتا۔

اس رنگ کو لکھنؤ کا رنگ بتانا ہی غلطی ہے۔ اس لیے کہ وہی نثر اُردو کا وہ قدیم رنگ تھا جو دہلی سے لکھنؤ مین آیا۔

بہر حال ان بحثون میں پڑنے کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ اب سب جگہ اُردو کا وہی رنگ ہے جس کا آغاز انگریزی اثر اور انگریزوں کی رہبری مین میرامن سے ہوا تھا۔ غالب نے اُس مین اور سادگی پیدا کی۔ آزاد مرحوم نے شرقی و مغربی رنگ کو ملا کے ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ اور چند روز مین سارے ہندوستان کی نثر ایک ہی وضع کی ہو کے ایک سطح پر آگئی۔

العادة کالطبیعة الثانیہ

(ماخوذ از ایڈیسن)

عوام و خواص سب مین ضرب المثل ہے کہ عادت فطرتِ ثانیہ ہے۔ یعنی جو چیزین قدرت نے انسان کی سرشت و جبلت مین داخل کر دی ہین اُنھین کے مثل وہ باتین

بھی ہوتی ہین جن کی عادت پڑ گئی ہو۔ اس کے صحیح ہونے مین تو کوئی شک و شبہہ نہین۔ لیکن ہمین اکثر یہ نظر آتا ہے کہ عادت سرشت پر بھی غالب آ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا وہی عادت اصلی فطرت و جبلت ہے۔ کہتے ہین کہ کوئی شخص ایک ایسے مقام پر رہا کرتا تھا جہان ہر وقت گھنٹے کی آواز سُنی جاتی تھی۔ اور اُس کا معمول تھا کہ جب گھنٹہ بجتا وہ بھی گھنٹے کی آواز کے ساتھ با آواز بلند کہتا جاتا ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ وغیرہ وغیرہ۔ چند روز بعد اتفاقاً گھڑی بگڑ گئی۔ اُس کا بجنا موقوف ہو گیا۔ لیکن جہان گھنٹہ بجنے کا وقت آیا اُس کی زبان پر خود بخود الفاظ ایک۔ دو۔ تین۔ چار جاری ہو جاتے۔ اس واقعے کے تسلیم کرنے مین شاید بہت سے لوگون کو عذر ہو۔ لیکن اس سے وہ انکار نہین کر سکتے کہ عادت کا انسان کی طبیعت پر اثر پڑتا ہے۔ اور اسکے اثر سے اُسکے اخلاق و عادات سب بدل جاتے ہین۔

سچ یہ ہے کہ اگر ہم عادت کی قوت اور اُس کے اثرون سے فائدہ اُٹھانا چاہین تو بہت سے بکار آمد نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ سب جانتے ہین کہ وہی چیزین جو ہمین پہلے ناگوار معلوم ہوتی تھین عادت پڑ جانے کے بعد نہایت خوشگوار ہو جاتی ہین۔ اس مین اچھے یا بُرے کی تفریق نہین۔ جو شخص جوے یا کسی بد اخلاقی کے شغلے مین منہمک ہوتا ہے ابتدائً اُسے ان باتون مین اتنا لطف نہین آتا تھا اور نہ اُن کی طرف ایسی رغبت تھی۔ مگر بُری صحبتون مین پڑ کے اور بدکار لوگون مین اُٹھ بیٹھ کے اُسے ان باتون کی عادت پڑ گئی۔ اور اب اس قدر مزہ آنے لگا کہ بغیر اُنکے دم بھر نہیں رہا جاتا۔ عزیز و اقارب بُرا کہتے ہین۔ اپنے پرائے لعنت ملامت کرتے ہین۔ مذہب عذاب آخرت سے ڈراتا ہے۔ قانون دنیا ہی مین سزا دیتا ہے۔ مگر وہ اپنی حرکتون سے باز نہین آتا۔ اُسے نظر آنے لگتا ہے کہ اُس کی زندگی کا مقصد اصلی یہی کام ہین۔ انھین کامون کے لیے دنیا مین آیا ہے۔ اور اس قابل ہی نہین رہا کہ دوسری قسم کی زندگی بسر کرے۔

تنبا کو کھانے۔ حقہ پینے۔ ناس لینے۔ یا شراب پینے کی عادتین بھی اسی طرح

طبیعت ثانیہ بنجاتی ہین - اور یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بغیر اُنکے ایک گھڑی بھی چین نہین پڑتا - انھین چیزون پر موقوف نہین - تم اپنی غذاؤن - اپنے شربتون - اپنے کپڑون - اپنی خوشبوؤن - اپنی مسرتون - اپنے غمون - اپنی شاعری اپنی موسیقی ہر چیز پر عادت کو حاکم و متصرف پاؤگے - یہان تک کہ تمھارا معشوق اور تمھارا دوست بھی تمھاری عادات کا لباس پہنے ہوگا - اور اُنھیں اخلاق - اُنھین کرشمون - اُنھین غمزون - اور حسن و جمال کے اُنھین نمونون اور زیورون سے آراستہ نظر آئیگا جو تمھاری عادت کے بنائے اور تیار کیے ہوے ہین -

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عادت کے ان تصرفات سے ہم فائدہ کیونکر اُٹھا سکتے ہین - جس طرح بُرے نشے - اور بدکاری کی عادت پڑتی ہے اُسی طرح اگر تم علوم و فنون یا کسی چیز کے مطالعے کا شوق کرو اور اُسکی عادت ڈالو تو کیا اُس کی عادت نہ پڑ جائے گی ؟ ضرور پڑیگی - اسی پر منحصر نہین جس کام مین محنت کی جائے اور جس کی مزاولت کی جائے عادت پڑ ہی جاتی ہے - اور چند روز کے بعد اُسی مین لطف آنے اور مزہ ملنے لگتا ہے -

وہی کام جو پہلے بار معلوم ہوتا ہے اور اُسکے انجام دینے مین تکلیف ہوتی ہے عادت ڈالنے کے بعد خوشگوار اور پُر لطف ہو جاتا ہے - مغربی فیلسوف فرانسس بیکن اپنی کتاب فلسفۂ قدرت مین کہتا ہے "ہمین اُسی چیز مین زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے جو ابتداءً ہمارے لیے بار اور دشوار تھی اور ہم اُس سے نفرت کرتے تھے" اس کی مثال وہ دیتا ہے کہ شراب - کافی - چاء - پہلے ہمین بدمزہ معلوم ہوتی تھین - مگر عادت پڑ جانے کے بعد یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بغیر اُنکے قرار نہین آتا - اور زندگی بھر نہین چھوٹ سکتی ہین -

ہمارے دل و دماغ کی یہی حالت ہے کہ کسی خاص کام یا محنت کی عادت ڈالنے سے اسی قدر نہین ہوتا کہ اُسکی دشواری کم ہو جاتی ہو بلکہ اُس کی جانب ایک طرح کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور دل مین شوق نمایان ہوتا ہے - ایک بڑے عالم بے ہمتا اور فاضل گران پایہ کا مقولہ تھا کہ پہلے مجھے مصنفین سلف کی کی کتابون مین کسی قسم کا لطف نہ حاصل ہوتا تھا مگر ایک مجبوری اور ضرورت سے

چند روز تک مجھے یہ دشوار و ناگوار کام کرنا پڑا - اب نہایت حیرت سے دیکھتا ہون کہ ان کتابون مین مجھے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے - اور جب تک اُنکا مطالعہ نہین کر لیتا ہون دل کو قرار نہین آتا - بہر حال ان باتون سے یہ نتیجہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ عادت ڈالنے سے ناگوار اور بے مزہ کام ہم پر آسان ہی نہین ہو جاتے بلکہ خوشگوار اور با مزہ معلوم ہونے لگتے ہین -

انسانی فطرت کی اس خصوصیت پر اگر ہم زیادہ غور کرین تو اس سے بڑے بڑے فائدے اُٹھا سکتے ہین اور بہت سے اچھے اور نتیجہ بخش اصول ہاتھ آ سکتے ہین - اس سے اخذ کیا ہوا سب سے پہلا اور نہایت ہی اہم اصول یہ ہے کہ "جو کوئی جس کام مین مصروف ہو گا اور محنت کریگا اُس مین محروم و ناکام نہین رہ سکتا" ممکن ہے کہ ابتدا مین وہ اُسے بہت دشوار - نامناسب اور اپنے مذاق و رجحان کے خلاف نظر آتا ہو لیکن چند روز کی محنت و مصروفیت مین مذاق کے موافق ہی نہین نظر آنے لگے گا بلکہ اچھا اور خوشگوار معلوم ہو گا -

دوسرے عادت کے ان معجز نما اثرون سے فائدہ اُٹھا کے مین ہر شخص کو وہی نصیحت کرنا چاہتا ہون جو فیثا غورس نے اپنے شاگردون کو کی تھی - اس نے اُن سے کہا "ہمیشہ وہ پیشہ اختیار کرو جو عمدہ اور اعلیٰ نظر آتا ہو - عادت ڈالنے سے اگر مشکل بھی ہو گا تو آسان ہو جائے گا - اور آخر مین تم خود اُسے پسند کرنے لگو گے - جن لوگون کو اس بات کا موقع حاصل ہے کہ اپنے لیے سوچ سمجھ کے کوئی پیشہ اختیار کرین وہ اگر کوئی سودمند اور پسندیدہ عام مشغلۂ معاش نہ اختیار کرین تو ہرگز قابل معافی نہین ہین - انتخاب صورت کسب معاش کے وقت ہمین سب سے زیادہ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کس کام مین ہم زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہین - ابتدائی حالت مین دلی رجحان کے ہونے یا نہ ہونے کی مطلق پروا نہ کرنی چاہیے - کیونکہ عادت پڑ جانے کے بعد خود بخود طبیعت عادی ہو جائے گی اور آخر کار اس مین لذت ملنے لگے گی -

تیسری بہت بڑی بات معاد اور زندگی مابعد الموت کا خیال ہے - سخت سے سخت دنیا پرست جو مذہب کی دشواریون اور قیدون کو نہ برداشت کر سکتا ہو

اور بالکل بندۂ ہوا و ہوس ہو اُسے بھی عالم آخرت کا کچھ نہ کچھ خیال ضرور ہوتا ہے۔ اور نیکو کاروں کی طرح وہ بھی باوجود اپنی بدکاریوں کے اسی بات کا آرزومند ہوتا ہے کہ اُس عالم ابدی و سرمدی مین فلاح حاصل ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے گنہگار کو بھی اُن فرائض کے ادا کرنے مین جو مذہب کے بتائے ہوے ہین مسرت ہوتی ہے اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ مگر باوجود اسکے اُن لوگون کو مذہب کے بتائے ہوے اخلاق حسنہ خدا پرستی کے فرائض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس قدر بار و دشوار معلوم ہوتے ہین کہ پابندی نہین کر سکتے۔ اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ انھون نے اُن دینی باتون کی عادت نہین ڈالی۔ لیکن اگر ہم ان باتون کی عادت ڈالین اور چند روز کی محنت مین اُنکو گوارا بنا لین تو پھر ہمین عبادت و ریاضت اور زہد و تقوی مین لذت حاصل ہونے لگے۔ اور وہ اطمینان قلب اور فلاح دارین حاصل ہو جو خدا ہر دیندار کو نصیب کرے۔

چوتھے اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہم نے جب ایک اسلوب زندگی اختیار کر لیا تو پھر ہمین اس پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ دلچسپی اور تفریح و تفرج کے لیے ہم جن باتون کو اختیار کرین وہ نہایت ہی لطیف۔ پاکیزہ۔ بے عیب اور دل کو ظلمتِ گناہ سے صاف کرنے والی ہون۔ اگر اسکی احتیاط نہ کی گئی اور جو بُری باتین تمھاری دلچسپیون مین داخل ہو گئین تو اُن کے اثر سے رفتہ رفتہ آئینۂ دل زنگ آلود ہو جائے گا۔ صفائی و پاکیزگی مٹ جائے گی۔ سچی مسرت سے دل خالی ہو گا۔ اور ادنی درجے کے ذلیل۔ مضر۔ اور بُرے کامون مین لطف آنے لگے گا۔

آخر مین اس نتیجے کو پہونچتا ہون کہ انسان چند روز تک جو کام کرتا ہے عام ازین کہ وہ بُرا ہو یا بھلا اُس مین اسکو ایک گونہ خوشی ضرور حاصل ہونے لگتی ہے۔ لہذا ہر معمولی مسرت کو دیکھ کے اُسے نفس پروری کے پھندے مین نہ پڑ جانا چاہیے۔ دین و دنیا کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے اُس کے لیے ضروری ہے کہ اس چند روزہ زندگی مین ایسی پاکیزہ اور نیک عادتین اختیار کرے جو اُس عالم مین بھی اُسے فائدہ پہونچائین اور زندگی اُخروی میں بھی کام آئین۔

جنۃ الفردوس اصل پوچھو تو کامل اور دائمی مسرت کا نام ہے جو ہمین اپنے مذاق کے مطابق دنیوی شکلون مین دکھائی اور بتائی گئی ہین - ان مسرتون کے مستحق ہم اُسی وقت ہو سکتے ہین اور اُسی وقت وہ ہمارے لیے موزون و مناسب ہو سکتی ہین جب ہم اپنے آپ کو اُنکے قابل بنائین - اس عالم مین تم سچائی اور نیکوکاری کے عادی ہو اور اپنی زندگی اُس اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے مین صرف کرو - دوسرے عالم مین بھی اچھے رہوگے - اور وہان کی سچی اور پاکیزہ لذتون کے اہل ہو جاؤگے - اصل یہ ہے کہ اُس ابدی روحانی مسرت کا بیج اس امتحان گاہ فانی کی زمین مین بویا جاتا ہے - اور گو تخم ریزی یہان ہوتی ہے مگر اُگھوا اُس دوسرے عالم مین نکلتا اور ایک خوشنما فرحت بخش پودھا بن کے پھولتا پھلتا ہے - خلاصہ یہ کہ جنت کی نسبت یہ کہنا کہ ہمین اپنے اعمال نیک کے صلے مین ملتی ہے فقط کہنے کی بات ہے - اصل مین پاکبازی اور شریفانہ زندگی کا قدرتی نتیجہ جنت ہے -

برخلاف اسکے وہ طبیعتیں جو شہوت پرستی - خواہشات نفسانی - جھوٹ - کینہ پروری اور عداوت و خصومت اور اسی طرح کی اور بہت سی باتون کی عادی ہو گئی ہین اُنھین یقینی طور پر رنج و الم اور ندامت و افسوس کے لیے تیار رہنا چاہیے - اُن کی یہ تکلیف دنیا ہی سے شروع ہو جاتی ہے اور اُس کے بعد جب اُنکی روحین اس جسم خاکی فانی سے علحدہ ہو جاتی ہیں تو اُس وقت بھی اُنھین مسرت نہین نصیب ہو سکتی - اور گو وہ اُس عالم مین نہ ہون گے جہان اُنھون نے بد اخلاقی سے اپنی زندگی خراب کی اور معاصی و جرائم کے مرتکب رہے تھے مگر اُسی دوسرے عالم مین اُنکے اعمال و افعال کا صدمہ و الم ہر وقت پیش نظر رہے گا - اور ان باتون سے اُنکو اس قدر تکلیف ہوگی اور ایسے پریشان رہین گے کہ اُن کا وہ عالم آخرت اشد ترین دوزخ اور عذاب الٰہی کا مرکز ہوگا -

یہ اہل مذہب کے مذاق پر نہین کہا جاتا جو جنت و دوزخ کو مستقل مقامات ثواب و عقاب مانتے ہین - مگر وہ لوگ جو اس کے قائل نہین وہ بھی اس دوسرے عالم کو اسی حیثیت سے مزرعۃ الآخرۃ تسلیم کرتے ہین کہ وہان اپنے دنیوی افعال

خیر کی بے اندازہ مسرت اور بدکاری کی ناقابل برداشت تکلیف ہوگی۔ اور اسی کو دنیا والوں کے جنت و دوزخ بتاتے ہین۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جنت و دوزخ کا خیال فطرت کے مطابق ہے۔ اور بڑے بڑے محققون اور مبصرون نے بخوبی غور کر کے ان دونون عالمون کا پتہ لگا لیا ہے۔ چنانچہ اُن کا دعوے ہے کہ ہماری عادتین اور خصلتین ہی ہمارے لیے جنت و دوزخ کو پیدا کر دیا کرتی ہین۔

خط پیکانی

اس دور کی ترقیون مین سب سے زیادہ حیرت انگیز اُن قدیم کتبون کو پڑھ لینا ہے جو آج تک نہین پڑھے جا سکے تھے۔ اور پھر اُن کے ذریعے سے اہم حصۂ تاریخ کا پتہ لگا لینا ہے۔ یہ تھوڑی حیرت کی بات نہین ہے کہ مسلمان ایران و عراق اور شام مصر پر تیرہ صدیون تک حکمران رہے مگر اس جانب توجہ نہ کی کہ اگلی دنیا کے کتبون پر غور کرتے اور پتہ لگاتے کہ اُن مین کیا لکھا ہے۔ اور جس قدر زیادہ زمانہ گذرتا جاتا تھا اُسی قدر انکا پڑھنا دشوار ہوتا جاتا تھا۔ یہان تک کہ کمال مایوسی کے ساتھ یقین کر لیا گیا کہ مردہ اور فنا شدہ زبانون کی ان مجہول و نا معلوم تحریرون کا مطلب سمجھنا غیر ممکن ہے۔

مگر نہایت ہی صحیح ہے کہ "من طلب وجد" جس نے ڈھونڈھا پایا۔ اور حضرت مسیح نے سچا ارشاد فرمایا تھا کہ "جو دروازہ کھٹکھٹائے گا اُسکے لیے دروازہ کھلجائیگا" آج کل کے محققون نے اس بارہ خاص مین کوشش کی۔ ان قدیم کتبون پر غور و خوض کرنے مین عمرین صرف کین اور آخر اس طلسم کو توڑ ہی کے دم لیا جو کسی کے توڑے نہ ٹوٹ سکا تھا۔ بلکہ کسی کو اُسکی طرف توجہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی۔

قدیم نا معلوم خطون مین سب سے زیادہ اہم تو اہل مصر کا "خط تصویر" ہے۔ جس کا حال ہم آیندہ لکھین گے۔ مگر اسکے بعد سب سے زیادہ اہمیت ایران و عراق کے "خط پیکانی" کو ہے جسکے بہت سے کتبے جا بجا اشوریا۔ بابل اور فارس

انتخابات سخن کو "انتھالوجی" کہتے ہیں جسکے معنی وہی خرمن گل یا گلستان کے ہیں۔

مگر ولادت سرور عالم کے تقریباً چار سو برس بعد یعنی دسویں صدی عیسوی میں قسطنطین قفالاس کی جستجو سے پھر بعد ازان نویں صدی ولادت محمدی یا چودھویں صدی ولادت عیسوی میں مقیموس فلانودیس کی جستجو سے فنا شدہ یونانی "انتھالوجی" یعنی قدیم گلستان یونان کے چند اجزا دستیاب ہو گئے جو بعد والون کی کوشش سے دنیا میں محفوظ رہ گئے۔

مقیموس کا ترتیب دیا ہوا مجموعہ بسلسلۂ لسکریس ایڈیشن سنہ ۸۳۴ محمدی (سنہ ۱۴۰۴ ع) میں شہر فلارنس میں طبع ہوا۔ اسکے بعد اُسکے اور کئی ایک عمدہ ایڈیشن ترجمے اور توضیحات کے ساتھ شایع ہوے۔ لوگ اسی مقیموس کے نسخے کے دلدادہ ہو رہے تھے کہ یکایک سلماسیوس نام ایک شخص نے سنہ ۱۰۳۵ محمدی (سنہ ۱۶۰۶ ع) میں قسطنطین قفالاس کے گم شدہ مجموعے کو ہیڈل برگ کے کتب خانے سے برآمد کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ مجموعہ زیادہ مکمل تھا اور اُس میں بمقابل مقیموس کے مجموعے کے زیادہ استیعاب تھا۔ یہ نسخہ سی سالہ جنگ کے زمانے میں رومۃ الکبرے میں لایا گیا۔ وہان سے پیرس میں گیا۔ اور آخر سنہ ۱۲۳۵ محمدی (سنہ ۱۸۱۶ ع) میں پھر ہیڈل برگ میں بھیج دیا گیا۔

اس یونانی گلستان (انتھالوجی) کی دیکھا دیکھی رومیون نے اپنی لاطینی زبان میں بھی شعر و سخن کے کئی مجموعے منتخب کر کے مدون کیے۔ جن کے مولف کملاے روم سقالیغر۔ پتھوس۔ بورمان۔ اور چند اور سخن سنجان لاطینی تھے بورمان کا مجموعہ زیادہ ضخیم تھا جو سنہ ۱۱۸۸ محمدی اور سنہ ۱۲۰۰ محمدی (سنہ ۱۷۵۹ ع) و (سنہ ۱۷۷۳ ع) میں ایمسٹرڈم سے شایع ہوا۔ پھر اُسکو کسی قدر ترقی دے کے زیادہ خوبی کے ساتھ مے‌یر نام ایک یورپین فاضل نے سنہ ۱۲۶۴ محمدی (سنہ ۱۸۳۵ ع) میں اور اُسکے بعد اُس سے بھی زیادہ خوبی و خوش اسلوبی سے اسکندروس نام ایک عالم لاطینی نے سنہ ۱۲۹۸ محمدی (سنہ ۱۸۶۹ ع) میں شایع کیا۔

عربی زبان اس قسم کے گلستانون سے بمقابل یونانی و لاطینی کے زیادہ مالا مال ہے۔ اُس میں سب سے پہلے ابو تمام

حبیب بن اوس[ع۵] المتوفی سنہ ۲۶۲ محمدی (۸۴۵ء) نے بھی بعد ازان

ع۵ یہ دونون ادیب اسلام کی پہلی صدیون کے نامور ادیب اور تاریخی روایات عرب کے عالم بے بدل تھے - ابو تمام کا نام حبیب بن اوس تھا وہ بنی طے مین سے تھا - ادب شاعری مین اُستاد زمانہ تھا - اسکی کتاب " حماسہ " نہایت مشہور و مقبول ہے اور آج تک ادب عربی کے نصاب مین داخل ہے - اُس نے اپنے ایک مجموعۂ اشعار کا نام " فحول الشعرا " رکھا - جسکے معنی شعرائے نامور کے سمجھنے چاہییے - اس مین جاہلین (جاہلیت کے شعرا) مخضرمین (وہ شاعر جنھون نے جاہلیت و اسلام دونون زمانون کو دیکھا) اور اسلامیین (شعرائے عہد اولین اسلام) کا نہایت ہی عمدہ انتخاب کیا ہے - اُسکی ایک اور کتاب " کتاب الاختیارات " ہے اس مین محض شعرائے سلف کے مقبول و پسندیدہ اشعار جمع کیے ہین - اُسکو اتنے اشعار زبانی یاد تھے کہ اور کسی کی نسبت نہین سنے گئے - کہتے ہین کہ قصیدون - غزلون - اور متفرق اشعار کے سوا اُسکو صرف چودہ ہزار عربی مثنویان برزبان یاد تھین - اُس عہد کے ایک رئیس اور والی ملک ابودلف عجلی کی مدح مین اُس نے قصیدہ پڑھا - ابودلف نے پچاس ہزار درہم صلہ مین دیے - اور کہا " خدا کی قسم یہ ادنیٰ رقم اس قصیدہ کے سامنے حقیر و ہیچ ہے - اس لیے کہ آپ کی اس نظم کو بجز اُس مرثیے کے جو آپ نے محمد بن حمید طوسی کے غم مین کہا ہے اور کوئی نظم نہین پہونچ سکتی " ابو تمام نے کہا " اُس کے غم مین تو مین نے کئی مرثیے لکھے ہین اُن مین سے کس مرثیے کو آپ نے پسند فرمایا ؟ " ابودلف نے اُس مرثیے کا مطلع پڑھا اور کہا " کاش مین مر گیا ہوتا اور یہ مرثیہ آپ نے میرے مرنے پر کہا ہوتا - اس لیے کہ جس شخص کے غم مین یہ مرثیہ ہو وہ مر نہین سکتا - وہ ابدالآباد تک زندہ رہے گا "

لوگ کہتے ہین کہ بنی طے مین تین شخص ایسے پیدا ہوے کہ ساری دنیا مین اُنکا جواب نہین ہوا حاتم طائی سخاوت مین - داود طائی زہد و تقویٰ مین اور ابو تمام طائی شعر و سخن مین -

آخر عمر مین وہ شہر موصل کی ڈاک کا مہتمم مقرر ہو گیا تھا - سنہ ۲۳۴ محمدی (۸۰۵ء) مین مضافات دمشق کے قریۂ جاسم مین پیدا ہوا تھا - گندم گون، کشیدہ قامت، فصیح البیان اور شیرین زبان تھا - مگر بات اس قدر جلدی کرتا تھا کہ بعض اوقات سمجھنا دشوار ہو جاتا - سنہ ۲۶۲ محمدی (۸۴۵ء) مین چالیس ہی سال کی عمر تھی کہ دنیا سے رخصت ہو گیا - ابو نہشل بن حمید طوسی نے اُسکی قبر پر ایک مقبرہ بنوا دیا جو مدت تک تمام مشاہیر کا مقبرہ کہلاتا تھا -

ابو الفرج اصفہانی المتوفی ۳۹۵ سنہ محمدی (۹۶۶ء) نے اُن تمام عربی نغمون اور گیتون کے منتخب مجموعے مرتب کیے جو جاہلیت عرب مین یعنی حضرت سرورعالم سے پہلے مروج تھے - انکی مجموعی ضخامت دس جلدون کو پہونچ گئی - ابو الفرج اصفہانی نے .... اسکے علاوہ اپنی مشہور کتاب اغانی مین ان تمام گیتون اور نغمون کو بھی مرتب کرکے شایع کردیا جو علی العموم عربون مین مروج و متداول تھے - اس ضخیم عربی کتاب کو یورپ مین کوسے گارٹن نے ۱۲۶۹ سنہ محمدی (۱۸۴۰ء) مین نہایت خوبی و تحقیق سے چھاپ کے شایع کردیا ہے - پھر اُس کی نقل دوبارہ مصر مین چھپی اور اب دُنیا کے تمام مشہور کتب خانون مین موجود ہے -

ان کتابون کے علاوہ عربی مین اور بہت سے اسی قسم کے مجموعے یعنی گلستانین

عـہ ابو الفرج علی بن حسین اُموی اصفہانی - یہ ادیب خاص خلفاے بنی اُمیہ دمشق کی نسل سے اور اُنکے آخری خلیفہ مروان بن محمد کا پرپوتا تھا - مگر باوجود بنی اُمیہ مین ہونے کے اسکا شمار شیعیان علی مین کیا گیا ہے - اُسکی کتاب اغانی جو اکیس جلدون مین ہے ادب و حالات عرب کی ایک ایسی عدیم المثال کتاب ہے کہ باتفاق علماے سلف اپنا جواب نہین رکھتی - صاحب علم فرمان رواے اسپین صاحب بن عباد کے ہمراہ سفر اور دورے مین تین سو اونٹون پر اُس کا کتب خانہ رہا کرتا تھا - اغانی تصنیف ہو کے اُسکے پاس پہونچی تو کہنے لگا "بس اب اتنے اونٹون کے رکھنے کی ضرورت نہین - اکیلی یہی کتاب اغانی کافی ہے" اسپین کے خلیفۂ اُموی حکم نے جو علم کا بڑا مربی تھا اس کتاب اور مصنف کی بڑی قدر کی - ہزارون دینار اُس کے پاس مشرق مین بھیجے - اور اُس کے کہنے سے اس مصنف نے بنی امیہ کی تاریخ اُن کے خاندانون - نسبون - اور ہر قسم کے حالات کو - اور انکی شان مین نظمون اور قصیدون کو جمع کیا تھا - انکے علاوہ اور بہت سی کتابین تھین جو آج موجود ہوتین تو حالات عرب اور اُس عہد کی ترقیون کا کوئی ادنیٰ کرشمہ بھی ہماری نظر سے مخفی نہ رہ جاتا -

مگر وہ زندگی بھر وزیر مہلبی کی ذات سے وابستہ رہا - اُس کی شان مین قصیدے کہتا اور اُسی کی قدردانی و فیاضی پر بسر کرتا تھا - ۳۲۶ سنہ محمدی (۸۹۸ء) مین پیدا ہوا تھا اور ۳۹۵ سنہ محمدی (۹۶۶ء) مین خاص بغداد مین وفات پائی -

ہین جو عموماً پسند کی جاتی ہین مگر اُن مین سب سے بہتر اور نہایت مکمل وہ مجموعۂ انتخاب ہے جس کو ثعالبی نے مرتب کرکے "یتیمۃ الدہر" کے نام سے شایع کیا ہو ثعالبی کی وفات کے بعد اور لوگون نے اُس کو اور بڑھایا - اور زیادہ مکمل کیا - جو آج تک موجود اور مقبول و مشہور ہے -

لیکن عربون نے انتھالوجی (فن گلستان) مین کتابین تو لکھین مگر اُسکے یونانی نام کو نہین لیا، بلکہ ہر مؤلف نے اپنی کتاب کا ایک جداگانہ نام رکھ دیا -

عـــہ ثعالبی کا پورا نام ابو منصور عبدالملک بن محمد بن اسمٰعیل ثعالبی تھا - اپنے عہد مین علم و ادب کے اُستاد بے ہمتا اور نظم و نثر مین مرجع عالم تھے - ان کے سیرت نگار اُنھین اپنے زمانے کے تمام مصنفون کا سردار اور سارے مؤلفین کا امام بتاتے ہین - زندگی ہی مین اُن کا نام ہر جگہ ادب و شعر مین ضرب المثل ہوگیا تھا - اور اُن کی زیارت کے شوق مین دُور دُور سے اونٹون کے قافلے برابر آتے رہتے تھے - اُن کے دیوان یکایک دنیا مین شایع ہوے تو تمام لوگون کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے افق مشرق سے ماہتاب اور تارون نے طلوع کیا ہے -

ان کی کتابون مین سب سے زیادہ مشہور و مقبول "یتیمۃ الدہر" فی محاسن اہل العصر ہے - جس مین تمام شعرائے عرب کا منتخب کلام جمع کر دیا ہے - یہ اس فن یعنی فن گلستان کی تمام کتابون سے بڑی - اچھی - اور بہت حاوی ہے اسکی تعریف مین ابوالفتوح نصراللہ اسکندری نے جو ایک نازک خیال شاعر عرب تھا اور بہت مشہور تھا یہ دو شعر کہے ہین -

ابیات اشعار الیتیمہ ابکار افکار قدیمہ

یتیمہ کے اشعار قدما کے ابکار افکار یعنی اُنکی طبعزاد دوشیزائین ہین

ماتو و عاشت بعدہم فلذاک سمیت الیتیمہ

قدمائے سلف مرگئے اور وہ اُنکے بعد زندہ رہین اس سبب سے اُن کا نام یتیمہ پڑگیا -

ثعالبی کی اور بھی کتابین ہین جن سے اُن کی وسعت نظر کا پتہ لگتا ہے - ۳۵۰ھ محمدی (۹۶۱ء) مین پیدا ہوے اور ۴۲۹ھ محمدی (۱۰۳۸ء) مین سفر آخرت کیا - اُنکو ثعالبی اس لیے کہتے ہین کہ ثعلب لومڑی کو کہتے ہین اور اُن کا اصلی پیشہ یہ تھا کہ لومڑیون کی کھالون کو بناتے اور درست کرتے اور پھر اُنکو سیتے تھے -

عربون کے اثر اور اُنکی علمی تعلیم سے فارسی۔ ترکی۔ ہندوستانی اور دیگر السنۂ مشرق مین بھی اس قسم کی صدہا کتابین تصنیف ہو گئین۔ فارسی مین جتنے شعرا کے تذکرے ہین اُن مین زیادہ تر مقصود شاعرون کے حالات نہین بلکہ اُنکے کلام کا انتخاب ہوتا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو انتھالوجی یعنی فن گلستان کی کتابین ہین۔ سعدی نے اگرچہ دوسرون کے کلام یا دیگر شعرا کی نظمون کو نہین جمع کیا۔ مگر درحقیقت انکی کتابین مختلف واقعات عالم۔ تجربون۔ نصیحتون۔ اور اگلے کارنامون کا انتخاب ہین جو اُمور اخلاقی اصول پر مرتب کیے گئے ہین۔ لہذا صحیح معنون مین اُنکی دونون کتابون گلستان اور بوستان پر "انتھالوجی" "خرمن گل" یا "گلستان" کے الفاظ صادق آتے ہین۔ اور یقیناً اُسی خیال سے اور اس فن کی حقیقت و تاریخ کو معلوم کر کے اُنھون نے یہ دونون نام اختیار کیے ہین جو اُنکو براہِ راست تو نہین تو بواسطہ یونانی سے ملے ہین۔ فارسی مین کلام شعرا کو پھول سے تعبیر کرنے کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ اُردو مین مجموعۂ اشعار کا عام نام "گلکدہ" یا "گلدستہ" مشہور ہو گیا ہے۔ فارسی مین "گلستان مسرت" کے نام سے اس فن کی ایک اعلیٰ درجے کی مکمل کتاب مصطفائی مطبع نے لکھنؤ سے شایع کی تھی جو اب دستیاب نہین ہوتی۔

اُردو مین بھی اس فن نے بہت ترقی کی۔ جتنے گلدستے نکل رہے تھے یا اب نکلتے ہین سب اسی فن کی کتابین "خرمن گل" یا "گلستان" ہین مگر اُن کے علاوہ اور بھی بہت سے مجموعہ ہاے اشعار مختلف حیثیتون سے منتخب کیے گئے ہین۔ بعض مین عوام کے مذاق کی غزلین جمع کی گئی ہین بعض مین گانے کی غزلین اکٹھا کر دی گئی ہین۔ دو چار ایسے بھی ہین جن مین اچھا اور مقبول کلام چھانٹ لیا گیا ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ابھی تک اُردو مین کوئی ایسا مستند و مقبول عام انتخاب نہین شایع ہوا جو یونانی و عربی گلستانون کا جواب ہو سکے۔

مگر چینی زبان مین "نغمون کی کتاب" کے نام سے کنفیوشیس کی مرتب کی ہوئی ایک گلستان موجود ہے۔ جو ادب مشرق کا ایک قدیم ترین اور سب سے پہلا مجموعۂ انتخاب ہے۔ اس لیے کہ کنفیوشیس حضور سرورِ عالم سے تقریباً بارہ سو برس پیشتر تھا۔ لہذا اُس کی گلستان کی نسبت سمجھنا چاہیے کہ آج سے ڈھائی ہزار

سال پیشتر کی لکھی ہوئی ہے جبکہ بخت نصر ارض فلسطین اور بیت المقدس کو پامال اور بنی اسرائیل کو جلا وطن کرنے کے لیے اسیر کر رہا تھا - اہل چین اپنی اس قدیم گلستان کو ایک الہامی و آسمانی کتاب خیال کرتے ہیں اور اس کا بڑا ادب کرتے ہیں -

افسوس کہ سنسکرت میں سب علم ہیں مگر تاریخ کی قسم کی کوئی چیز نہیں - اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کسی قدیم انتھا لوجی (گلستان) کا بھی پتہ نہیں لگا -

تاج

تاج کو بعض لوگ سر کا ایک زیور بتاتے ہیں - مگر اصل میں یہ زیور نہیں بلکہ ایک زیور نما مرصع و مکلل ٹوپی کا نام ہے جو امتیاز کے لیے پہنی جاتی تھی - ابتداءً فقط بادشاہوں کے ساتھ مخصوص تھی اور اُنکے سوا کوئی بھی اسکو نہ پہن سکتا تھا لیکن بعد کے زمانے میں بادشاہوں نے اپنی فیاضیوں سے شاہزادوں - امیروں - اور معزز و ممتاز لوگوں کو بھی حسب حیثیت تاج عطا کرنا شروع کر دیے - اس کا پتہ لگانا غیر ممکن ہے کہ تاج کا پہلا موجد کون تھا یا پہلے پہل کس قوم سے اس کا آغاز ہوا - ہر قوم اپنی تاریخ میں اپنے کسی قدیم بادشاہ کو اس کا موجد بتاتی ہے - ہندوؤں میں ہم راماین اور مہابھارت کے زمانوں میں بھی مکٹ (تاج) کا رواج پاتے ہیں - مگر توراۃ کی تاریخ سے چونکہ قدیم ترین تمدن اشور یا یعنی فرماں روایان نینوا کا ثابت ہوتا ہے اس وجہ سے مورخین نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ تاج کی ایجاد سب سے پہلے وہاں کے بادشاہوں سے ہوئی -

علامہ مسعودی مروج الذہب میں کہتے ہیں " دنیا میں سب سے پہلے جسنے تاج پہنا وہ سُریانی (یعنی اشوریا کا) بادشاہ سوسان تھا - اس نے پہلے پہل تاج کو ایجاد کیا - پھر مسعودی ہی کے مطابق ایران والے تاج کا موجد اور پہلا تاجدار کیومرث کو بتاتے ہیں -

انسان ابتداءً پتوں سے ستر پوشی کرتا تھا - اُس وقت اور اُسکے بعد بھی یعنی کپڑے اور چمڑے کے لباس کے مروج ہونے کے بعد بھی مدتوں تک جسمانی آرائش و زیبائی پتوں اور پھولوں ہی سے ہوا کرتی تھی - چنانچہ تاج کا پہلا نمونہ بھی پتوں

سا ایک ہار تھا جو سر میں لپیٹ لیا جاتا۔ یہی اور اسی شکل کا تاج پہلے پہل دنیا کی تمام قوموں میں مروج ہوا۔ اسکے بعد جب جواہرات اور سونے چاندی سے زیب و زینت کا کام لیا جانے لگا تو تاج میں بھی ان چیزوں نے پھولوں اور پتیوں کی جگہ لینا شروع کی۔ چنانچہ ہندوستان کے راجاؤں کے قدیم تاج اُنکی تصویریں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ہی قیمتی۔ بھاری اور مرصع بہ جواہر تھے۔ یہی کیفیت ایرانی تاجداروں کے تاجوں کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ مرصع تاجوں کی سب سے پہلی وضع یہ تھی کہ ایک پٹی میں ایک ہیرا نصب کیا جاتا۔ وہ پٹی سر میں لپیٹ کے پیچھے کی طرف باندھ لی جاتی۔ اور ہیرا پیشانی کے اوپر چمکا رہتا۔ یونان کے سب سے بڑے دیوتا جیوپٹر۔ مصر کے یونانی فرماں روا بطلیموس اور شاہان شام کے بادشاہوں کی مورتوں کے سروں پر اسی وضع کا تاج نظر آتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُن دنوں تاج کی خصوصیت بادشاہی کے لیے نہ تھی اور بہت سے معزز عہدہ دار و معتمدین دربار بھی تاج پہنا کرتے تھے۔ مگر بادشاہ کے تاج میں اور اُن لوگوں کے تاجوں میں نمایاں فرق ہوتا تھا۔ بادشاہوں کے تاج کی پٹی سنہری ہوتی اور دیگر عہدہ داروں کے تاجوں کی پٹی اور رنگ کی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس پٹی میں اور زیادہ کام ہونے لگا۔ اور دیگر اقسام کے بیش قیمت جواہرات بھی جڑے جانے لگے۔

ایرانیوں میں ساسانیوں کے آخر عہد تک ثابت ہوتا ہے کہ والیان ملک اور مخصوصین دربار کو خاص وضع اور خاص درجے کے تاج عطا ہوا کرتے جو نہایت ہی قیمتی ہوتے۔ عربوں سے اُن سے جب لڑائی ہوئی ہے تو عجمی سردار اپنے تاجوں سے پہچان لیے جاتے تھے کہ وہ کس رتبے اور درجے کے امیر ہیں۔ چنانچہ سب سے اعلیٰ رتبے کا سردار ایک لاکھ دینار کا تاج پہنا کرتا جو خاص دربار خسروی سے عطا ہوتا۔ ان سرداروں کو قتل کرنے کی بدولت کئی صحابیوں کو اُنکے تاج ہاتھ لگے۔ جنھوں نے انکو دولت سے مالا مال کر دیا۔ اسی قدر نہیں شاہان عجم نے تاج کی وضعوں اور اُسکے پہننے کے طریقوں میں طرح طرح کے اسرار و اشارات مقرر کر رکھے تھے۔ سب سے زیادہ قیمتی اور مرصع تاج ساسانی شاہ ایران کا تھا جسکی نسبت مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار کے مکان میں صدر مقام پر

تخت کے اوپر دو مرصع طلائی ستونوں کے درمیان سونے کی زنجیروں میں لٹکا رہتا۔ وہ اس قدر بھاری اور وزنی تھا کہ کسی انسان کا سر اُسکے بوجھ کا متحمل نہ ہو سکتا۔ مگر وہ تخت سے اتنا بلند رہتا کہ بادشاہ جب سریر خسروی پر جلوہ فرما ہوتا تو وہ تاج جو اوپر آویزاں ہوتا اُسکے سر میں پہن جاتا۔ اور اہل دربار کو نظر آتا کہ بادشاہ اُس کو پہنے ہوئے ہے۔

ایرانیوں ہی کو دیکھ کر یونانیوں میں یہ رواج ہوا کہ تاج عہدے کی علامت سمجھا جاتا۔ یونان میں یہ بھی رواج تھا کہ اُنکے قومی دنگلوں میں جو لوگ شہسواری، شہزوری، شمشیرزنی، نیزہ بازی یا دوڑ میں سب سے بازی لے جاتے اُن کو انعام میں بجائے تمغے کے ایک تاج دیا جاتا۔ اسی طرح یہ تاج اُن لوگوں کو بھی ملتا جنھوں نے اپنے ملک کی کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہوتی۔ مگر یہ سب تاج پھولوں اور پتوں کے ہوتے۔ جن کی قیمت تو کچھ نہ ہوتی مگر عزت بڑی تھی۔

یونانیوں سے تاج کو رومیوں نے لیا۔ اور اُن میں اُس کا رواج زیادہ تعمیم کے ساتھ تھا۔ اُن میں سب سے زیادہ معزز و ممتاز تاج کورونا اوسی ڈیونالیس کہلاتا یہ تاج کسی محصور شہر یا فوج کی طرف سے اُس سپہ سالار کو عطا ہوتا جس نے اُن کو دشمن سے نجات دلا کر آزادی دی ہوتی۔ یہ تاج فقط جنگلی پتیوں اور پھولوں سے بنایا جاتا۔ اور اُس بہادر و جانباز سپاہی کو مرحمت ہوتا جس نے کسی میدان جنگ میں کسی رومی باشندے کی جان بچائی ہوتی۔ جس شخص کو یہ تاج ملتا اُسکو اُسکے ساتھ اور بہت سے حقوق بھی مل جاتے۔

رومیوں میں ایک اور تاج تھا جو موٗرل کہلاتا۔ یہ سونے کا ہوتا اور اس پر قلعے کے بُرج اور دمدمے بنے ہوتے۔ یہ اُس سپاہی کو ملتا جو کسی محصور شہر کی فصیل پر لڑائی میں سب سے پہلے سیڑھی لگا کے چڑھ جاتا۔ اس کے علاوہ ایک اور تاج جو کرونہ والاریس کہلاتا اُس شخص کو دیا جاتا جو کسی دشمن کے پڑاؤ یا مورچے میں سب سے پہلے گھس پڑتا۔ اسی طرح کرونہ ناوالیس اُس بہادر کو عطا ہوتا جو سب سے پہلے دشمن کے جہاز پر قدم رکھتا۔ ان مذکورہ تاجوں میں سے موٗرل اور سوک تاج آج بھی وہاں نقشوں میں مستعمل ہیں۔

رومیوں میں تین طرح کے اعزازی تاج تھے جو "فتح کے تاج" کہلاتے۔ یہ حسب رتبہ اُن سپہ سالاروں کو ملا کرتے جو کسی مہم کو سر کرتے اور فتح حاصل کرنے کے بعد جلوس اور فوج کے ساتھ شان و شوکت سے رومۃ الکبریٰ میں داخل ہوا کرتے انھیں پر منحصر نہیں اور وضعوں کے بھی مختلف تاج اہل روم میں مروج تھے جو مختلف درجوں اور جداگانہ حیثیتوں کے ناموروں کو ملا کرتے۔ اُنھیں میں چند مقدس تاج بھی تھے جو سونے کے ہوتے یا غلّہ کی بالیوں یا زیتون کی پتیوں سے بنائے جاتے۔ ان تاجوں کو مقتدایان دین اور دیگر حاضرین چڑھاوے اور قربانی کے موقع پر پہن لیا کرتے۔ اور غالباً اُنھیں سے پاپاؤں نے اپنے تہرے تاج اور اسقفوں اور بشپوں نے خاص خاص وضعوں کے تاج حاصل کیے ہیں جو کیتھولک مسیحیوں میں آج تک مروج ہیں۔

اہل روم میں ایک قسم کے ماتمی تاج بھی تھے جو معزز مُردوں کو پہنائے جاتے اس تاج کا آغاز یونانیوں سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ اُنکے وہاں یہ لاشوں کو پہنانے کے تاج ایک قسم کی ہری خوش رنگ گھاس سے بنائے جاتے۔

رومی اپنی دلچسپی کی محفلوں اور عیدوں میں بھی ایک قسم کا تاج پہنا کرتے جو پھولوں کے ہاروں سے بنتا۔ اور اسی وضع کا تاج رومی دولھنیں بھی پہنا کرتیں۔ جسکے لیے وہ خود اپنے ہاتھوں سے توڑ کر پھول جمع کرتیں اور اُنکو گوندھ کے شادی و زفاف کے موقع پر پہن لیا کرتیں۔ اسی قبیل کا ایک تاج زچگی کے لیے مخصوص تھا۔ یہ ہار کی وضع میں گوندھ کر اُس کمرے یا کوٹھری کے دروازہ پر لٹکا دیا جاتا۔ جس میں بچہ پیدا ہوتا۔ لیکن یہ شادی و زچگی کے تاج ہندوستانیوں کے مذاق کے مطابق تاج نہیں کہے جا سکتے۔ شادی والا تو ہمارے نزدیک سہرا تھا اور زچگی والے تاج کو بجائے تاج کے بندھنوار کہا جائے تو شاید زیادہ موزوں ہوگا۔

عرب میں بعہد جاہلیت تاج کا ہونا یقینی ہے۔ اس لیے کہ قدیم شاہان یمن نے اشوریا اور عجمیوں کے تعلقات سے بعد ازاں والی حیرہ و کندہ کی ریاستوں نے ساسانیوں اور بنی غسان کی سلطنت نے رومیوں سے ضرور دیگر اوضاع و اطوار

شہریاری کے ساتھ تاج بھی حاصل کر لیے تھے - اس لیے کہ شاہان فرنگ وعجم مین اُن دنون علی العموم تاجون کا رواج تھا - جاہلیت کا نامور شاعر عمرو بن کلثوم تغلبی اپنے قصیدۂ معلقہ مین پہلے اس پر فخر کرتا ہے کہ ہم نے کبھی بادشاہ کی اطاعت نہین کی - اور پھر کہتا ہے "وسید معشر قد توجوہ" (اور سردار جماعت جسے لوگون نے تاج پہنایا) اور اسکے بعد کہتا ہے کہ اُس تاج پوش کو ہم نے قتل کر کے ڈال دیا - اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ بادیہ نشین عربون کی آزادی اس سے نفرت کرتی تھی کہ تاج کی اطاعت کرین مگر اُن مین بادشاہ کہلانے والے تاجدار موجود تھے - لیکن یہ طلوع نیر اسلام سے پہلے کی باتین ہین -

ظہور اسلام کے بعد چونکہ حکمرانی کا پہلا نمونہ اُس معصوم ناموس الٰہی نے دکھایا جو انوار قدس کا سرچشمہ تھا اس لیے شاہی وشہریاری انسانی آزادی پر قربان کر دی گئی - اور حکمرانی وامارت محض چوپانی اور قوم کی خدمتگذاری کا نام رہ گیا - اسی وجہ سے مسلمانون مین مدت ہاے دراز تک فرمان رواؤن کے لیے سوا خلیفہ ونائب رسول کے اور کوئی لفظ نہین تھا - خدا مراتب اعلیٰ کرے حضرت عمر فاروق رضؓ کے کہ انھون نے "امیر المومنین" کا ایک سادہ سا لقب بنا دیا جو آج تک خلفا کا سرمایۂ ناز رہا - اس لیے کہ مسلمانون کا بادشاہ اور شہنشاہ صرف خداوند کریم تھا - کئی صدیون تک یہی حالت رہی کہ "بادشاہ کے لقب سے مسند آرایان خلافت باوجود ہر طرح کے کر و فر کے برا مانتے اور عوام اسلام ان ان الفاظ کو خدا کے سوا کسی بندے کی طرف منسوب کرنا شرک اور ناجائز تصور کرتے - یہان تک کہ خلافت کمزور پڑی - عربی معاشرت نسیاً منسیا ہو گئی - اور اسلامی وصفداریان اکاسرہ وقیاصرہ کی سنتین اختیار کر لینے کے باعث بالکل مٹ گئین - دیلمیون - آل بویہ - اور سلجوقیون کا زور ہوا جو خلیفہ تو نہ مانے جا سکتے تھے مگر سطوت وجبروت مین خلفا سے بڑھے ہوے تھے - امیر المومنین اور خلیفہ کے القاب مسند خلافت ہی مین لپٹ کے رہ گئے اور اُنکے لیے نئے معزز القاب کی تلاش ہوئی - اس جستجو نے چند روز مین اُنکو سلطان و بادشاہ بنا دیا - آخر بادشاہ - سلطان - اور شہنشاہ کے لقب مسلمانون کو ایسے مانوس ہو گئے کہ

اُن کے استعمال کرنے مین نہ شرع کا پاس تھا اور نہ شرک کا اندیشہ - چنانچہ حکمرانانِ غزنوی - سلجوقی - ترکی و ایوبی سب سلطان کہے جانے لگے - اسپین و افریقہ مین تو البتہ جہان عربی معاشرت پر بیرونی اثر کم پڑا بادشاہ اور سلطان کے الفاظ کم استعمال ہوے باقی مشرق کے تمام مسلمان حکمران چھوٹے ہون یا بڑے رتبے کے سب سلطان - بادشاہ اور شہنشاہ کہے جانے لگے -

ہندوستان مین اس شرکانہ بے احتیاطی کو یہان تک ترقی ہوئی کہ ضعیف الاعتقاد اکبر نے اپنے سامنے رکوع و سجود کرانا شروع کر دیا - اور القاب مین تو ایسی ترقی ہوئی کہ خدا کے لیے کوئی نام اور لقب نہین باقی رہا - اور حضرت رب العزت کی شان مین جتنے القاب و صفات مستعمل ہوتے تھے سب سریر آرایان سلطنت کی شان مین استعمال ہونے لگے -

خیر سلطان یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ فرعون بے سامان تو حکمرانان اسلام بن گئے مگر اس بات کو آج مسلمان حیرت سے دیکھین گے کہ قدیم تاج کو بہت کم لوگون نے اختیار کیا - وہی عربی عمامہ جو بادیہ نشینان عرب مین مروج تھا تھوڑی ترمیم و ترقی کے ساتھ خلفا مین اور اُنکے بعد سلاطین و شاہانِ اسلام مین تاج کا کام دیتا رہا - تاج کا جو خیالی خاکہ ہندوستانیون کے ذہن مین ہے یہ انگریزون اور مسیحیون سے ہوا ہے - خصوصاً جب انگریزون نے یہ تاج نواب مسند آرایان لکھنؤ کو دیا تو سارے ہندوستان مین یہ خیال پھیل گیا کہ تاج ایسا اور اس وضع کا ہوتا ہے - ورنہ مسلمانون مین کہین اور کسی جگہ سوا مقطع اور شاندار عمامون کے اس قطع کے تاجون کا رواج نہین رہا تھا - چند روز بعد اُن عمامون مین بڑے بڑے قیمتی موتی اور جواہرات لگائے جانے لگے - پھر اس پر یہ ترقی ہوئی کہ ایک یا کئی کلغیان قائم کر دی گئین - کلغیون کا رواج خلفاے بنی اُمیہ و بنی عباس کے عہد تک ثابت نہین ہوتا -

لیکن خلفا کے بعد جب مسلمانون مین سلاطین اور بادشاہون کی حکومت جاری ہوئی تو تاج کے عوض تاج کی کلغیان لے کے مرصع جیغون کے ساتھ شاہی عمامون مین لگائی جانے لگین - سلاطین آل عثمان - شاہان ہند - اور فرمان روایان

عجم سب کے تاج یہی کلغی دار عمامے تھے - ایران کے بادشاہون مین خصوصاً آخری زمانے مین ایک لمبی اونچی اور کنگرہ دار ٹوپی کا رواج معلوم ہوتا ہے جو انکی تصویرون کے سرون پر نظر آتی ہے - مگر یہ کلاہ پاپاخ تھی جس نے تھوڑی تبدیلی کے ساتھ موجودہ ایرانی ٹوپی کو پیدا کیا ہے - اس ٹوپی کو اس لیے تو تاج کہہ سکتے ہین کہ شاہان ایران کے سرون سے اس نے زینت و عزت پائی تھی مگر فی نفسہ اُسکو تاج سے کوئی تعلق نہ تھا -

دنیا و آخرت

تہذیب و مذہب کا تقاضہ ہے کہ انجام کا خیال کرو اور دو روزہ عیش کی ہوس مین نہ پڑو - مگر دل کہتا ہے کہ لطف کی جو گھڑی نصیب ہو جائے اُسے بے مزہ ہاتھ سے نہ جانے دو - رندون نے اس آخری مسلک کو اختیار کیا اور عیش پرستی کے پیچھے دنیا و عقبیٰ دونون کو بھول بیٹھے - مگر صوفی ضرورت سے زیادہ عاقبت اندیش تھے - دنیا کی تمام لذتون کو چھوڑا - عیش و عشرت سے دست بردار ہو گئے - اور بعد والے عالم سرمدی کی مسرتون کے شوق مین دنیا سے متنفر رہے - دونون کے مختلف مذاقون کا ماحصل یہ ہے کہ ایک دنیا مین پھنسا ہے اور دوسرا آخرت کے شوق مین دنیا کو بھولا ہوا ہے - ایک آج کی مقصدوری پر کل کی اُمیدون کو اور دوسرا کل کی مسرتون پر آج کی کامیابی کو قربان کر رہا ہے - دونون اپنے مقام پر خوش اور مطمئن ہین اور دوسرے کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہین -

لیکن غور سے دیکھو تو بنی نوع انسان کو دونون نقصان پہونچا رہے ہین - ایک اگر دنیا کے مزے لوٹ رہا ہے تو آخرت سے دست بردار ہو کر - دوسرا اگر فلاحِ آخرت کا شائق ہے تو دنیا کو ہاتھ سے کھو کر - یہ دونون غلطی پر ہین - دونون گھاٹے مین پڑے ہوے ہین - اور دونون اسی غلطی مین مبتلا ہین جس نے ہزارون سال تک دھوکے مین رکھا اس لیے کہ اگلے تمام سلاطین و اہل مذاہب اس مذاق مین ڈوب کر مسلسل نقصان اُٹھاتے رہے - بادشاہون نے رندانہ مشربی اختیار کی تو دینداردن نے صوفی گری - پہلون کو دنیا سے غرض تھی تو دین سے

خارج تھے اور دوسرون نے عقبیٰ سے سروکار رکھا تو دنیا سے بے پروا ہوکر۔

اسلام کا دنیا مین آنا دراصل اسی غلطی کے مٹانے اور اسی نقصان کے دُور کرنے کے لیے تھا۔ اسلام نہ یہ کہتا ہے کہ عیش دوروزہ دنیا کو چھوڑو اور نہ یہ کہتا ہے کہ فلاح آخرت کی طرف سے بے پروا ہو جاؤ۔ اس کے اصول سے نہ دنیا آخرت کی ضد ہے اور نہ آخرت دنیا کے خلاف۔ اس کا دعویٰ ہے کہ "الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" جس کے معنی اور کوئی چاہے کچھ سمجھے ہم تو یہ سمجھتے مین کہ اگر تم نے دنیا کی کھیتی درست کرلی تو آخرت مین بھی اچھے رہوگے۔ یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ "دُنیا اچھی ہے تو عقبیٰ بھی اچھی ہو گی"۔ خلاصہ یہ کہ اسلام دنیا اور آخرت دونون کے سدھارنے اور سنوارنے کو آیا ہے۔ اس کے فیصلے کے مطابق دنیا ہی کی اصلاح سے عقبیٰ کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور عقبیٰ ہی کی غرض سے دنیا درست ہوتی ہے۔ اس بات کو لوگ مدت تک نہین سمجھے مگر یہ کوئی عقل کی بات نہ تھی کہ خدا نے بھیجا تو دنیا مین ہے اور مقصد یہ ہے کہ اسکو چھوڑ دو۔ چھوڑانا تھا تو پھر بھیجا کیون؟

مگر اگلے بزرگون اور آجکل کے بھی بہت سے مقطع و فرشتہ صورت صالحین کی سمجھ مین نہین آتا کہ دنیا و عقبیٰ کی اصلاح ایک ساتھ کیسے ہوسکتی ہے ظلمت و نور کا ساتھ کیسا؟ اور عالم ظلمت مین منہمک ہونے سے انسان عالم نور مین کیسے اچھا رہ سکتا ہے؟ یہ ظلمت و نور کے استعارے خود تم نے اپنے قدیم مذاقِ روحانی سے ایجاد کر لیے ہین ورنہ حقیقت واقعیت کی نظر سے دیکھو تو وہی ٹھیک نظر آتا ہے جو ہم نے کہا اور جو اسلام کی اصلی تعلیم ہے۔

اسلام کیا کہتا ہے؟ اسلام کہتا ہے کہ دنیا مین جس طرح بنے اوج و عروج پیدا کرو۔ ہر طرح کی مسرتین حاصل کرو۔ ہر قسم کا لطف اُٹھاؤ۔ اور دوروزہ عیش کے مزے ہاتھ سے نہ جانے دو۔ دولت جمع کرو۔ سامان عیش فراہم کرو۔ سلطنت و حکومت حاصل کرو۔ ملکون اور قومون پر جہاد اور فرمان روائی کرو۔ حسین سے حسین اور مہ جبین سے مہ جبین پری وشون کو اپنی معشوقہ و محبوبہ بناؤ۔ جادو نگاہ کنیزون اور حورون سے اپنے کاشانۂ عیش کو رونق دو۔ لذیذ سے لذیذ غذا کو

قوت جان بناؤ - اور لطیف سے لطیف خوشبو سے دماغ کو تروتازہ کرو - اور اگرچہ زندگی تھوڑی ہے مگر ورد زہ عیش کے سامانون مین سے کوئی رہ نہ جانے۔ لیکن ان سب لذتون اور عیش کے سامانون کو خدا کی دی ہوئی نعمتین تصور کرکے شکر اور خدا ترسی کے ساتھ برتو -

شکر و خدا ترسی کیا ہے؟ یہ کہ شکریہ مین ہر روز تھوڑا مقررہ وقت خدا کی یاد مین صرف کرو - اور خدا کے خوف سے ہر لذت کے حاصل کرنے اور برتنے مین تمھارا قدم حد اعتدال سے باہر نہ ہونے پائے - تم سے کسی کو آزار نہ پہونچے - نعمتون کو ناجائز یا ظالمانہ و غاصبانہ طریقون سے نہ حاصل کرو - اور اُن سے لطف اُٹھاتے وقت شکستہ حال محتاجون اور مصیبت زدہ ستم کیشون کو نہ بھولو - آپے سے باہر نہ ہو کہ بُرے بھلے اور عدل و ظلم کا امتیاز نہ باقی رہے - اگر خدا ان نعمتون سے محروم کردے تو صبر و شکر سے کام لو اور حرف شکایت زبان پر نہ آئے - یہی صبر و شکر - یہی اعتدال و انصاف - اور یہی صبر و قناعت جنت کے دروازے کی کنجی ہے - اور ان احتیاطون کے ساتھ تمھاری زندگی دنیوی کا عیش دوروزہ ہی آخرت کے ابدی عیش کا ذریعہ بن جائے گا -

سچ یہ ہے کہ جو شعرا تصوف کے دعوے ترک دنیا سے دھوکا اُٹھا کر لوگون کو لذت ہائے دنیوی سے روکنے لگے اُنھون نے نجات کا سچا راستہ نہین دکھایا بلکہ اور بھٹکا دیا - مگر ہان جن فطرت پرستون نے رندون کی طرح یہ کہا کہ کوئی گھڑی بے عیش کے نہ گذرنے پائے - خوشیان مناؤ اور مزے اُڑاؤ - وہی کچھ سیدھے راستہ پر تھے - مگر افسوس ہم نے اُنکی قدر نہ کی - یونانیون کے فلسفیون کا جو گروہ دنیا پرستی سکھاتا تھا وہ ان لوگون سے اچھا تھا جو دنیا چھڑاتے تھے - اور آج بھی ہم مین جو لوگ رند مشربون کی طرح عیش دُنیا سے بہرہ یاب ہونے کی تلقین کرتے ہین اُن سے اچھے ہیں جو دنیا چھوڑنے کو کہتے ہین -

اس صحیح نتیجے تک نوع انسان کو سب سے پہلے اسلام نے پہونچایا تھا - مگر افسوس کہ اسلام کی ابتدائی صدیون ہی مین عیسائیون - ہندوون - اور پارسیون کے فلسفۂ الٰہی نے انکی دینی تعلیم پر غالب آکر مسلمانون کو اپنے اصلی دین

سے غافل کر دیا۔ اور مسیحیوں نے جو ترک دنیا کے تاریک سمندر میں غوطے کھا رہے تھے ہماری اُن تعلیموں کو اختیار کر کے ترقی دنیا کی طرف توجہ کی تو وہ حیرت انگیز کمالات دکھا دیے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ یہ کلیں، یہ ریلیں، یہ ہوائی جہاز اور یہ سائنس کے معجزانہ انکشافات سب اُسی تعلیم کی برکت ہیں جس کا سبق تو قرآن کے مکتب نے دیا تھا مگر عمل کرنے والے انجیل کے پیرو تھے۔

مگر اس "وضع الشئ علیٰ غیر محلہ" سے دنیا والوں کو ایک بہت بڑا نقصان پہونچ گیا جو نہایت خطرناک ہے اور اب اس کا دُور ہونا بہت دشوار بلکہ غیر ممکن نظر آتا ہے۔ تعلیم چونکہ در اصل اسلام سے حاصل ہوئی تھی اس لیے اسکو اصول و عقائد اسلام سے فطری مناسبت تھی۔ اگر اصلاح عالم کی غرض پیروان اسلام کے ہاتھ سے پوری ہوتی تو لوگ پورے پورے دیندار اور خدا پرست رہ کر اس کام کو پورا کرتے۔ اور سائنس چاہے کیسی ہی کرامات و خوارق عادات دکھاتا خدا پرستی کا نقش دلوں پر سے نہ مٹتا۔ برخلاف اسکے مسیحیت چونکہ اصولاً روحانیت اور بت پرستوں کے فلسفۂ روحانی کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اس لیے اُسکو اُن دنیا داری و دنیا دارانہ نفس پرستی کی باتوں سے کوئی ذاتی علاقہ نہ تھا۔ اسکے عقائد و اصول کا جوڑ ان چیزوں سے نہیں بیٹھتا۔ اور اس کا انجام یہ ہے کہ دنیا جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے اور سائنس جو جو جدید انکشافات کرتا جاتا ہے اُسی قدر مذہب کمزور پڑتا جاتا ہے۔ مسیحیوں نے اصول اسلام سے سیکھ کر دنیا تو بیشک اچھی طرح سیکھ لی مگر اُنکا مذہب اُنکے دلوں پر اپنی گرفت نہ باقی رکھ سکا۔ چنانچہ تمام ممالک یورپ اور اُن کے پیرو لا مذہب اور خدا کو بھولے ہیں۔

یہی کام اگر امت اسلام کے ہاتھ سے انجام پاتا تو یہ لا مذہبی کا نتیجہ نہ پیدا ہوتا۔ اور جس معتدل خدا پرستی و تہذیب کی تعلیم اسلام نے دی ہے وہ سائنس کے مقابلہ میں ہرگز کمزور نہیں پڑ سکتی تھی۔

ہم کو مسیحیوں پر حسد نہیں۔ ان کی ترقیاں دیکھ کر خوش ہوتے بلکہ اُنکی پیروی کرنے کو تیار رہیں مگر یہ صدمہ ہمارے دل سے دور نہیں ہو سکتا کہ اُن کے ہاتھ سے دنیا کو جو ترقی حاصل ہو رہی ہے وہ مذہب کو مٹائے دیتی ہے اور وہ

سچی الٰہی تہذیب جس کی گرفت دلوں پر تمام دنیوی تہذیبوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے صفحۂ زمین پر سے فنا ہونے کے قریب پہونچ گئی۔ لیکن اگر ہم گمراہی میں پڑ کے اپنے فرض کو نہ بھولتے اور حضرت مخبر صادق صلعم کی ہدایت کے مطابق سرگرمی سے اس کام کو شروع کر دیتے تو دنیا بھی ترقی کرتی اور عقبیٰ بھی نہ خراب ہونے پاتی۔

علاماتِ اوقاف

ہمارے فاضل دوست مولانا نظام الدین حسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ال۔ جج ہائی کورٹ دولت آصفیۂ نظام نے کمال ذکاوت و ذہانت اور نہایت ہی جستجو و دقیقہ سنجی کے ساتھ ایک بالکل نئی اور اچھوتی تحقیقات کی ہے جس کی طرف جہاں تک ہم جانتے ہیں اس سے پیشتر کسی کا خیال نہیں کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے ایک مختصر رسالہ انگریزی میں ایک چھوٹے پمفلٹ کی شان میں شایع کیا ہے جو فلسکیپ کے تین صفحوں سے کم پر ختم ہو گیا ہے۔ لیکن ان گنتی کے تین صفحوں کی قدر و قیمت سچ یہ ہے کہ بڑی بڑی ضخیم کتابوں سے بھی زیادہ ہے۔ ہمارے فاضل مولانا ثابت کرتے ہیں کہ انگریزی خط میں جو مختلف علامتیں طرز ادا ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں نہ پُرانی انگریزی میں تھیں، نہ یونانی میں، نہ لاطینی میں۔ اسکے ثبوت میں وہ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا جلد ۱۸۔ صفحہ ۱۶۳ کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں کہ "جو علامات یورپ کی تحریروں میں مستعمل ہیں اِن کی اصلیت نہ یونانی الفاظ سے ہاتھ آسکتی ہے اور نہ رومی الفاظ سے"۔ اسکے بعد اُنھوں نے یہ بھی بوضاحت اور مستند طریقوں سے بتادیا ہے کہ جو چند علامات یونانی اور رومی تحریرون میں استعمال کیے جاتے تھے وہ موجودہ خطِ یورپ کی علامت سے بالکل جدا تھے۔ اور اُن کا ان مروجہ علامات سے کوئی تعلق نہیں ثابت کیا جا سکتا۔

اور جب صاف ہو گیا کہ ان علامات کو یورپ کی قدیم زبانوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں تو وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ علامتیں اُن علامتوں سے لی گئی ہیں جو سنہ ۷۱۱ء سے سنہ ۱۴۹۲ء تک مملکت ہسپانیہ میں عربی زبان کے طلبہ اور اہلِ علم میں

مروج تھین - وہ یہ بھی کہتے ہین کہ قاہرہ اور مصر کے عربی اہل علم مین بھی بعض علامتین مروج تھین مگر وہ ان سے جدا تھین مگر وہ ان سے جدا تھین اور اور قسم کی تھین

اب اسکے بعد مولوی نظام الدین حسن صاحب ان علامات اور انکے نشأ انتزاع کی تصریح فرماتے ہین - اور ہر ایک علامت کو جدا جدا یون بیان کرتے ہین-

کاما comma جو انگریزی خط مین اس وضع مین (و) لکھا جاتا ہے۔ لکھا جاتا ہے عربی کے لفظ "وقف" سے نکلا ہے - جس کے معنی ٹھہرنے کے ہین لہذا وہ عربی مین اُس محل پہ بھی استعمال کیا جاتا تھا جہان انگریزی مین اُلٹے کاما استعمال کیے جاتے ہین - انگریزی مین نہ اس حرف کے معنی "او" کے ہین اور نہ کسی لفظ کا جز بتایا جا سکتا ہے - اور نہ اس کی کوئی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ یہ حرف کیون اُلٹ کے لکھا گیا۔عربی مین ان علامات کے محل پہ یہ کاما یعنی (و) ہمیشہ اُلٹا اور اس طرح (ٗ) لکھا جاتا تھا اور یہ بھی مروج تھا کہ جب کسی اور کی یا اور جگہ کی عبارت نقل کی جاتی تو اُسکے دونون طرف دو دو اُلٹے واؤ (انورٹڈ کاما) لکھے جاتے اور یہی طریقہ یورپ کے اہل علم کے عمل درآمد مین ہے - اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ (و) خواہ وقف کے محل پہ استعمال کیا جائے یا عبارت نقل کرنے کے محل پر دونون موقعون کے لیے عربی ہی سے لیا گیا ہے -

سمی کولن جو انگریزی مین یوں (؛) لکھا جاتا ہے یہ بھی عربی کے الفاظ "نصف وقف" سے لیا گیا ہے - نقطہ لفظ "نصف" کے نون کا قائم مقام ہے - اور "و" لفظ وقف کا پہلا حرف ہے - اور جن معنون اور جس محل پہ عربی مین مستعمل تھا اُسی طرح انگریزی مین بھی نصف وقف کے محل پہ استعمال کیا جاتا ہے -

کولن (:) البتہ ایک ایسی علامت ہے جس کا عربی مین پتہ نہین لگتا - اور یورپ کے موجودہ خط مین نیچے اوپر دو نقطے بنا کے قائم کی گئی ہے لیکن صاف نظر آتا ہے کہ عربی ہی کی علامات دیکھ کے مستنبط کی گئی ہے -

علامت فل اسٹاپ — انگریزی میں ایک گول نقطہ (۰) کی وضع میں لکھی جاتی ہے یہ بھی عربی میں نہ تھی - اس جگہ عرب لوگ "بت" لکھا کرتے تھے - جس کے معنی قطع کرنے کے ہیں - لیکن اس میں شک نہیں کہ کثرت تحریر میں "بت" کی صورت ایک لکیر کی رہ گئی تھی اور انگریزی میں ڈیش (–) جو مختلف علامتوں کے ساتھ اور جا بجا بنائے جاتے ہیں اصل میں عربی کی علامت "بت" ہی سے ماخوذ ہیں -

سوال کے محل پر انگریزی خط میں جو قریب قریب ساری یورپین زبانوں کا خط ہے علامت (؟) بنائی جاتی ہے - اس کو عربی میں علامت استفہام کہتے ہیں، استفہام کا اصلی مادہ فہم ہے - اور اسی لفظ فہم کی قائم مقام علامت ہے جس میں ابتدا کے دو حرف "ف" اور "ہ" اپنی اصلی صورت پر قائم ہیں - اسکے سوا اور کوئی بنیاد اس علامت کی بتائی ہی نہیں جا سکتی -

پکارنے اور مخاطب کرنے کے محل پر انگریزی میں علامت (!) استعمال کی جاتی ہے - یہ علامت بھی صاف طور پر بتا رہی ہے کہ عربی لفظ "ندا" کی قائم مقام ہے جسکے معنی پکارنے کے ہیں - نیچے نقطہ نون کی جگہ ہے - اور اُس پر الف قائم کر دیا گیا جو اصلی لفظ کا آخری حرف ہے -

اسی طرح برکیٹ [ ] - ( ) جنھیں عربی میں خطوط و صدائی اور قوسین کہتے ہیں - یہ بھی عربی ہی سے ماخوذ ہیں -

مندرجۂ بالا اشارات و علامات اور اُن کا پتہ دیکھ کے لوگ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولوی نظام الدین حسن صاحب نے کیسا کام کیا ہے اور کس خوبی سے ثابت کر دیا ہے کہ انگریزی رسم خط کی تہذیب بالکل عربی کی زیر بار احسان ہے - بہتر ہو کہ اس مضمون کو جس کا نام "ڈرایویشن آف پنکچوئشن مارکس" (تخریج علامات رسم خط) ہے ہمارے معصر ایڈیٹران اخبار خصوصاً وہ جن کے ہاتھ میں انگریزی اخبار ہیں مولوی نظام الدین حسن صاحب سے منگوائیں - اور اُن پر بحث کر کے اور اور پوری کوشش کر کے انگریزی پبلک کو بتا دیں کہ انگریزی تحریر عربی رسم خط کی کس قدر خوشہ چین ہے -

ریختی گوئی

اُردو شاعری کو جس چیز نے سب سے زیادہ ناپاک بنایا اور اُس مین گندگی و نجاست کا ایک بہت بڑا دفتر پیدا کر دیا وہ ریختی ہے۔ شہوت پرست امیرون کی صحبتون مین مسخرہ پن کی صورت مین یہ بیہودگی و بے شرمی شروع ہوئی۔ اور آخر اسی طریقے سے اور ایسے ہی ناپاک مذاق والے رئیسون کی محفلون مین پرورش پا کے اس درجے کو پہونچی کہ اُس رنگ کے دیوان مرتب ہونے لگے۔ اور ہر صحبت مین اُس قسم کے شعرون کا چرچا ہونے لگا۔

اس سے بڑھ کے بیحیائی اور بے شرمی کا شاید کوئی نمونہ نہ نظر آئے گا کہ ایک مرد جو آپ کو شاعر کہتا ہے ڈاڑھی مونچھ لگا کے سر سے دوپٹہ اوڑھتا ہے اور عورتون کی تو سچی نقل کر نہین سکتا (کیونکہ عورتون کے جذبات مردون پیدا ہون یہ امر فطرت اور قانون قدرت کے خلاف ہے) ہان زنانون اور ہیجڑون کی طرح ناک پر اُنگلی رکھ رکھ کے اور تالیان بجا بجا کے زنانے لہجے اور بازاری عورتون کے نخرون کے ساتھ شعر پڑھتا ہے۔

ایسے اشعار کی بنیاد ہی چونکہ بدکاری اور بیحیائی سے پڑی ہے۔ لہذا عموماً اس قسم کے اشعار مین فحش اور ناپاک و ذلیل الفاظ بہت کثرت سے ہوتے ہین جنھین سن سن کے ہمارے بے غیرت امیرزادے خوش ہوتے اور کھلکھلاتے ہین۔ کاش عورتون ہی کا مذاق دکھانا تھا تو شریف بہو بیٹیون اور پاکدامن اور باعفت خاتونون کے مذاق کا لحاظ رکھا جاتا۔ مگر نہین۔ یہان تو اس سے غرض ہے کہ بیحیا اور بدکار عورتون کی ادائین اور اُنکی بد اخلاقی و بد اطواری کی حرکتین دکھائی جائین

افسوس ہماری شاعری پر جو الہام ربانی کا نمونہ بتائی جاتی ہے ان ہرزہ سراؤن کے ہاتھون ایسا ظلم ہوتا ہے اور بد مذاق و بدکار امیرزادون کو اپنے نفسانی جذبات کے سامنے اس کی بھی تمیز اور حس نہین باقی رہتی کہ ایسے شرمناک کلام اور بیحیائی کے شعرون سے قوم اور ملک کو کتنا بڑا ضرر پہونچ رہا ہے۔ دوسرے ملکون اور دوسری قومون کے لوگ جب اس شرمناک کلام کو دیکھین گے تو اُنھین

اس کی تو مطلقاً حس نہ ہوگی کہ یہ بازاری عورتوں اور زنانوں کی زبان اور انھین کی وضع ہے - بلکہ وہ یقین کرلین گے کہ یہ شریف زادیوں کے حرکات اور چال چلن کا نمونہ ہے - اور پھر ایسا خیال قائم ہوجانے کے بعد اُردو بولنے والی عورتون کی عصمت و عفت غیرون کی نظر مین کس قدر ادنیٰ اور ناقص ثابت ہوجائے گی۔

جس قسم کا ظلم ریختی کی شاعری نے اُردو زبان اور اُردو شاعری پر کیا ہے ایسا ظلم آج تک کبھی کسی قسم کے اشعار سے کسی زبان پر نہین ہوا تھا - سلف سے آج تک کسی زبان مین ایسی ناپاک شاعری نہین پیدا ہوئی تھی جس سے پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ آج تک کسی قوم مین ایسے بیہودہ اور ایسے بیحیا شاعر نہین پیدا ہوے تھے جیسے کہ اُردو مین پیدا ہوے ہین -

اکثر ترقی یافتہ قومون اور مشہور و معروف زبانون مین لائق عورتون نے اپنے جذبات اور اپنے خیالات اپنی ہی زبان مین ضرور ظاہر کیے ہین مگر نہایت تہذیب و شایستگی کے ساتھ - اس مین کوئی شک نہین کہ عورتون کی زبان جو عموماً سادی اور دلکش ہوتی ہے اور اکثر اُس مین ایک خاص قسم کا لوچ اور لطف ہوتا ہے شاعری اور انشاپردازی کی جان ہے - مگر اُسی تہذیب کے ساتھ جس تہذیب سے کہ کوئی پاکدامن اور عفیفہ عورت اپنے خیالات ظاہر کرے - یہ نہین کہ مرد عورتون کا سا دوپٹہ اُوڑھ کے اور زنانی صورت بنا کے اپنی شہوت پرستی کی آرزو پوری کرین - اور اپنے ناپاک دل کا حوصلہ نکالین -

انگریزی مین انشاپردازی کا بہت زیادہ حصہ خاتونان قوم ہی کے قلم سے زینت پا رہا ہے - جو نیز شاعری کی حیثیت سے اور نیز ناول نویسی کے انداز سے اپنے پاکیزہ خیالات - اپنی ستھری زبان - اور اپنے مہذب و شریفانہ جذبات کو پبلک کے سامنے پیش کر کے داد خواہ ہوتی ہین - اور قوم اور زبان مین تہذیب و پاکبازی کی روح پھونکتی ہین - وہان مرد بیحیائی کے یہ آپتے نہین کرتے کہ عورت بن کے اور بھاؤ بتا بنا کے فحش بکنے لگین -

یہی حالت عربی کی ہے جس مین ہزارہا شاعرہ عورتین گذری ہین - انھون نے اپنی پاک و صاف اور مقبول زبان آور اور داد دینے والون کے کوثر مین دھوئی ہوئی

زبان مین قصیدے بھی کہے ہین۔ مرثیے بھی کہے ہین۔ جوش دلانے والے اشعار بھی تصنیف کیے ہین۔ مگر کبھی یہ نہین کیا کہ ہیجڑون کی طرح نخرے کرنے اور تالیان بجانے لگی ہون۔ یا مردون نے ان کا بہروپ بھر کے اُنکی نہایت ہی فحش اور شرمناک تصویر دکھائی ہو۔

افسوس بہت سے لوگ ہون گے جو جان صاحب کا دیوان پڑھ کے یقین کرتے ہون گے کہ لکھنؤ کے شریف زادیون کی یہی حرکتین۔ یہی ادائین اور اُن کے یہی الفاظ ہین۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ سوا بازاری رنڈیون کے شریف عورتون مین ان الفاظ اور حرکات کا کہین نشان دگمان بھی نہین ہے۔

اگر عورتون کے کلام اور اُنکی سادی زبان کا لطف دیکھنا چاہتے ہو تو اُنھین کو موقع دو کہ اپنے مہذب اور پاک وصاف خیالات کو اپنی زبان مین ادا کرین۔ ہمارے یہان ایک دوسرا ستم ہو گیا ہے کہ جو عورتین شعر کہتی ہین وہ مرد اُستادون کی تقلید اور موجودہ شعرا کے تتبع مین اپنے آپ کو مذکر کی ضمیرون سے یاد کرتی ہین۔ صرف اسی قدر نہین۔ وہ مردون کے تیور اختیار کرتی ہین اور اُنھین کے دلی جذبات کو اپنی زبان مین ظاہر کرتی ہین۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورتین تو شاعری کی دنیا مین آ کے مرد بنجاتی ہین۔ اور ریختی گو مرد شعر کہتے اور پڑھتے وقت عورت بنجاتے ہین۔ اور سچ پوچھیے تو دونون ناقص اور بیہودہ۔ کیونکہ جس طرح مرد کا عورت بنا بھی انتہا سے زیادہ خلاف نیچر اور نازیبا معلوم ہوتا ہے۔ فطرت ہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ مرد پر مردانگی ہی کی باتین کھبتی ہین اور عورت پر نسائیت ہی کی باتین۔ مگر اُردو شاعری نے واقعی یہ عجیب وغریب انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ اسکی طرف توجہ کر کے عورتین مرد بن جاتی ہین۔ اور مرد عورتین۔

پاک سرزمین عرب مین جب کسی عورت نے شعر کہا ہے تو ہمیشہ اپنے آپ کو عورت ہی دکھایا ہے۔ مؤنث ہی کی ضمیر سے اپنے کو یاد کیا ہے۔ عورت ہی کے خیالات و جذبات باقی رکھے ہیں اور عورت ہی کے الفاظ۔ اور چونکہ وہ نیچرل ہین لہذا ان مین اثر بھی بلا کا ہے۔

عباسی خلیفہ بغداد مقتفی باللہ کے عہد مین بغداد کی ایک حسین وصاحب

جمال پارسا و پاک دامن نازنین نے جس کا نام سلمیٰ بنت قراطیس بغدادیہ چند شعر کہے تھے

عیونٌ بها الصریمِ فداءُ عینی ۔۔۔ وأجیادُ الظباءِ فداءُ جیدی

أُزَیِّنُ بالعقود وإنّ نحری ۔۔۔ لَأزینُ للعقودِ من العقودِ

ولا أشکو من الأوصاب ثقلاً ۔۔۔ وتشکو قامتی ثقلَ النهودِ

یہ اشعار اس قدر دلچسپ اور پسندیدہ تھے کہ تصنیف ہوتے ہی سارے بغداد میں پھیل گئے۔ اور اکثر لوگوں کی زبان پر جاری تھے۔ ہوتے ہوتے خلیفۂ مذکور یعنی مستکفی باللہ کے گوش گزار ہوئے۔ اُس نے سُن کے اہل دربار سے کہا "ذرا دریافت تو کرو کہ یہ عورت ایسی ہی ہے جیسا کہ اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے یا یہ فقط مبالغۂ شاعرانہ ہے" لوگوں نے بخوبی معلوم کر کے عرض کیا کہ "حضور یہ نازنین جتنا کہ ان شعروں سے ظاہر ہوتا ہے اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ صاحب جمال ہے۔ اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد اُس نے کہا "اچھا اب تحقیق کرو کہ اس کا چال چلن کیسا ہے؟" یہ بھی دریافت کر کے دربار میں عرض کیا گیا کہ نہایت ہی پارسا و پاکدامن ہے" جب یہ بھی معلوم ہو گیا تو مستکفی نے بطور انعام و اکرام کے بہت سا روپیہ اُسکو بھجوایا اور کہلا بھیجا کہ "یہ رقم تمہیں اس غرض سے دی گئی ہے کہ اس سے اپنی عفت و پاکدامنی کے محفوظ رکھنے میں مدد لو"

یہ ہے شان سچی شریفانہ شاعری کی۔ اور چونکہ ایک شریف خاتون نے ان اشعار کے ذریعہ سے اپنے دل کے سچے جذبات ظاہر کیے ہیں لہذا ان میں وہ اثر اور وہ لطف ہے کہ ریختی کے پندرہ ہزار دیوان انکے سامنے پھاڑ کے پھینک دیجیے۔ الغرض اگر اُردو کو فائدہ پہونچانا ہے تو یہ کوشش کی جائے کہ مرد و عورت جو کوئی شعر کہے اپنے اصلی جذبات و خیالات کو اپنے ہی لہجے اور اپنی ہی زبان میں ادا کرے

عہ جنگلی گاؤں کی کالی آنکھیں میری آنکھوں پر قربان۔ اور ہرنیوں کے گلے میرے گلے کے صدقے۔

عہ میں آرایش کے لیے موتیوں کا ہار پہن لیتی ہوں مگر جتنی زینت اُن ہاروں سے میرے سینے کو حاصل ہو سکے اُس سے زیادہ رونق وہ خود میرے گلے سے پاتے ہیں۔

سہ میں سُرینوں کی شکایت نہیں کرتی کہ بھاری ہیں۔ مگر ہاں میرا قد سینے کے اُبھار کا البتہ شاکی ہے (اس لیے کہ چھاتیوں کے بوجھ سے لچک لچک جاتا ہے)

تاکہ کلام میں پورا اثر ہو۔ اور اگر ایسا کرنا اُسے پسند یا گوارا نہ ہو تو شاعری کا نام نہ لے۔ اپنی حماقت پر شاعری کے قربان کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں۔

بدقسمت زبان اُردو

شاید یہی مصرعہ زبان حال سے آج کل اُردو زبان پڑھ رہی ہوگی۔ ایک مدت دراز تک مساعدت زمانہ کے مزے اُٹھا کے اب بظاہر اُسے ناسازی قسمت سے سابقہ پڑا ہے۔ کیونکہ بیرونی حملوں کے ساتھ اُسکے دوستوں نے باہمی خلاف اور جھگڑے پیدا کر کے اُسے ایک سخت کشمکش میں ڈال رکھا ہے۔

جب زمانہ اسکے موافق تھا اور نازبرداروں کی گود میں پل پل کے یہ ترقی کر رہی تھی اُس وقت اس نے تھوڑے زمانہ میں بہت اچھا رنگ اور روپ نکالا۔ مختلف مذاق اور مختلف خیال کے صاحب کمال شعرا پیدا ہوے جنھوں نے اسکو چمکا کے چمکاتے آسمان کا تارا بنا دیا۔ اُنھوں نے اپنی جادو بیانیوں سے زمانے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور اس میں کچھ ایسے جذبات بھر دیے کہ ہندوستان کے ہر گوشے سے لوگ قدردانی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں یہ زبان ہر جگہ پھیل گئی۔ اور سارے ہندوستان میں اُسے یہ مقبولیت اور تعمیم حاصل ہو گئی کہ غیر ملک کا جو شخص ہندوستان میں آئے اُسے صرف اسی زبان کے سیکھنے کی ضرورت ہوتی۔

چونکہ تقدیر برسر یاری تھی لہذا برٹش گورنمنٹ نے بھی ہندوستان میں فروغ پاتے ہی اپنا مربی گری کا ہاتھ اسکے سر پر رکھدیا۔ سرکاری دفتروں میں رواج پانے کے ساتھ ملکی آئین و قوانین بھی اسی زبان میں شایع ہونے لگے۔ پوسٹ آفس کی ترقی نے اسے اور آگے بڑھایا۔ اور تھوڑی ہی مدت میں یہ حالت کر دی کہ ڈاک خانوں کے ذریعے سے جتنی مراسلت ہوتی ہے اُس کا شاید دو ثلث حصہ صرف اُردو زبان میں ہوگا۔

برٹش آزادی نے جب اخبارات جاری کرائے تو اُسکو اور فروغ ہوا۔ انشا پردازی کے مختلف رنگ پیدا ہوے۔ پُرانی قافیہ بندی متروک ہو گئی۔ مرادف

الفاظ لانا بے مزہ سمجھا جانے لگا۔ اور انگریزی و عربی نیز سنسکرت سے مدد لی گئی۔ اور اس مین نئے نئے محاسن اور طرح طرح کی جدید خوبیان پیدا ہونے لگین۔ رہی یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ اُردو اخبارون کو اُتنی کامیابی نہیں ہے جتنی کہ بنگالی یا مرہٹی اخبارون کو ہے۔ اس کا سبب یہ نہین ہے کہ اُردو زبان مین کسی قسم کا نقصان ہے یا اس مین کسی بات کی کمی ہے۔ بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اُردو مین ٹائپ کا رواج نہ ہو سکا۔ اور اب تک بعض لائق اور روشن خیال لوگ یہ سمجھ رہے ہین کہ لیتھوگرافی اُردو کے لیے بمقابل ٹائپ کے زیادہ موزون ہے۔ حالانکہ یہ سخت غلطی ہے۔ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک ٹائپ کو عام رواج نہ دیا جائے گا اُردو لٹریچر پوری ترقی نہین کر سکتا۔ اور نہ اُردو اخبارات فروغ پا سکتے ہین۔

خیر اُردو زبان بہت تیزی کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کر رہی تھی کہ بدنصیبی سے اُردو ہندی کا جھگڑا پیدا ہوا۔ اور ہندوستان کی شامت اعمال سے ہندو مسلمانون مین جو تعصب پیدا ہو گیا ہے اُس نے اس جھگڑے کو بڑھانا اور طول دینا شروع کر دیا۔ ایک طرف ہندوون کی ایک جماعت یہ کوشش کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی کہ ہندی کو اُردو کا مدمقابل بنائے۔ اور اُسے جس طرح ممکن ہو ہندوستان مین فروغ دے۔ تاہم اس وقت تک خود ہندوون کی جماعت کثیر اُردو ہی کی طرفدار تھی۔ مگر اُس خاص جماعت نے اپنی کوششین برابر جاری رکھین کہ اسی اثنا مین سر انٹونی مکڈانل نے ہندی کو بھی سرکاری دفاتر مین داخل کرا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان مین ہر طرف ایک آگ سی لگ گئی۔

مسلمانون کو جو اُردو کے طرفدار تھے ضرورت تھی کہ اس موقع پر نہایت ہوشیاری اور عاقبت اندیشی سے کام لیتے۔ مگر اُنھون نے انتہا درجے کی ناعاقبت اندیشی ظاہر کی۔ اُردو زبان کو اپنا مذہبی یا قومی ورثہ قرار دیا۔ اور اسی طرح اُردو زبان کے لیے لڑنے لگے جس طرح اپنے دیگر مذہبی حقوق کے لیے لڑتے تھے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو زبان ہندوستان مین ہندو مسلمان دونون کے میل جول اور اختلاط و ارتباط کا نمونہ ہے۔ ان دونون

مذہبون کی بے تعصبی اور دونون کے باہمی میل جول اور اختلاط وارتباط کا نمونہ ہے۔ ان دونون مذہبون کی بے تعصبی اور دونوں کے میل جول کی اگر کوئی زندہ یادگار دنیا مین بتائی جا سکتی ہے تو وہ صرف اُردو زبان ہے۔ اس سے جیسا تعلق عربی فارسی کو ہے ویسا ہی سنسکرت اور بھاشا کو ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو سوا خاص الفاظ ولغات کے جو عربی وفارسی سے لیے گئے ہین عام بندشین۔ ضمائر وصفات، تذکیروتانیث۔ اور افعال کے اشتقاق سب بھاشا سے اخذ کیے گئے ہین۔ ایسی صورت مین اُردو شایستہ، سلجھی اور زیادہ صاف کی ہوئی ملکی زبان ہے۔ اور اُس پر جتنا حق مسلمانون کا ہے اُتنا ہی ہندوُون کا ہے جس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جس طرح اس زبان مین مسلمان شعرا و مصنفین ہوے ہین اُسی طرح ہندو شعرا و مصنفین ہوے ہین۔ جب ہندوؤن مین دیاشنکر نسیم اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ایسے ہندو شاعر اور مصنف موجود ہین تو پھر کیا وجہ کہ اس زبان کو خاص مسلمانون کی زبان کہا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ شعرا و مصنفین اُردو مین مسلمانون کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اگلے زمانہ مین مسلمانون کی حکومت تھی۔ لٹریری مذاق اُن مین زیادہ تھا اس لیے اُن مین ایسے لوگ زیادہ پیدا ہوے۔ اُردو پر کیا منحصر ہے ہندی زبان مین بھی ہندو شعرا کم گذرے ہین جس کا سبب اسکے سوا اور کچھ نہین ہو سکتا کہ درباری تعلقات کم ہونے کی وجہ سے اُن مین تصنیف وتالیف اور شعر وسخن کا ذوق ہی کم تھا۔ ہر تقدیر اُردو کے ساتھ ہندو مسلمانون کے تعلقات یکسان اور ایک ہی قسم کے تھے۔ اور اس پر اپنے حقوق ثابت کرنے اور اُسکو اپنا بنانے کا جیسا حق مسلمانون کو ہے ویسا ہی ہندوون کو ہے۔ مگر مسلمانون نے غلطی ونادانی سے اس زبان کو اپنی زبان بنا یا اور اُن ہندوو کو بھی توڑ کے خلاف کر دیا جو اُردو کی ہمدردی وطرفداری کو تیار وآمادہ تھے۔ اور لطف یہ کہ اس غلطی کی آخر تک اصلاح نہ کی گئی۔ اور مسلمان اخبارات تین سال گذر جانے پر آج بھی اُسی طرح اس مسئلہ کو ایک قومی مسئلہ کی طرح چھیڑ چھیڑ کے لڑتے جاتے ہین۔ اور تعصب کو روز بروز بڑھا کے اُردو کو بجاے فائدہ

پہونچانے کے اور نقصان پہونچا رہے ہین۔

اب یہ ہندو مسلمانون کا اختلاف ایک طرف ڈال کے خود مسلمانون کی اندرونی حالت کو دیکھیے تو اور زیادہ افسوسناک حالت نظر آتی ہے۔ اُردو کے متعلق دہلی و لکھنؤ کے جھگڑے مدت سے چلے آتے تھے۔ دہلی والے اس کے پہلے موجد اور پہلے ترقی دینے والے تھے۔ اس پچھلی صدی مین جب لکھنؤ کا دربار زیادہ چمک گیا۔ دہلی کے تمام اساتذۂ زبان کھنچ کھنچ کے لکھنؤ مین چلے آئے۔ اور شاعرانہ مذاق نے لکھنؤ مین عروج حاصل کرتے کرتے ناسخ و آتش کے ایسے شعرا۔ انیس و دبیر کے ایسے مرثیہ گو۔ اور نواب مرزا شوق۔ و پاشنکر نسیم کے ایسے مثنوی لکھنے والے اور مرزا رجب علی بیگ سرور کے ایسے نثار خاک لکھنؤ سے پیدا کیے تو لکھنؤ والون نے اپنے آپ کو دہلی کی خوشہ چینی و تقلید سے آزاد کر کے خود اُستادی و ایجاد کا دعویٰ کیا۔ اسی وقت سے اُردو کے دو جداگانہ اسکول قرار پا گئے۔ ایک دہلی کا پُرانا اسکول اور دوسرا لکھنؤ کا نیا اسکول۔ لکھنؤ سے پورب کی طرف جہان تک چلے جائیے تمام شعرا عموماً لکھنؤ کے اسکول کے مقلد ملین گے اور مغرب کی طرف جہان تک بڑھیے دہلی کے اسکول کا اثر بڑھتا ہوا نظر آئیگا۔ مگر باوجود اس اختلاف کے ہندوستان کے دیگر شہر والون کو اس قدر ضرور تسلیم کر لینا پڑا کہ اُردو کا ایک اسکول لکھنؤ بھی ہے عام اس سے کہ وہ اس کے پیرو ہون یا نہ ہون۔

اس اختلاف نے ابتدائً بڑے بڑے جھگڑے پیدا کیے۔ اور ایک مدت سے عام طور پر یہ حالت چلی آتی ہے کہ چاہے ہندوستان مین کوئی شہر ہو اگر وہان دو چار شاعر بھی موجود ہین تو لکھنؤ اور دہلی کی رقابت کا جھگڑا سخت تعصب کی شان سے ضرور چھڑ گیا۔ اور شاعرے کشتی کے دنگل بن گئے۔ یہ اختلاف شعر و سخن کی ترقی اور زبان کے زیادہ منجنے اور زیادہ شائستہ بننے کے لیے شاید کسی حد تک مفید ثابت ہوتا۔ مگر اس سے خود دہلی اور لکھنؤ والون مین ایک نہایت ہی سخت عیب پیدا ہو گیا۔ جو زبان اُردو کو بجائے ترقی دلانے کے مٹا کے خاک کر دینے والا ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح کوئی کم ظرف آدمی تھوڑی سی دولت ہاتھ آ جانے پر

آپے سے باہر ہو جاتا ہے اُسی طرح ان لوگون نے اپنی اس فوقیت پر اسقدر ناز کرنا، بلکہ مین کہون گا اترانا شروع کیا کہ سمجھنے لگے گویا ساری دنیا تہذیب مین ہے اور یہ کسی اونچی جگہ پر بیٹھے ہوے ہین - انگریزی زبان خاص انگلستان اور اُس مین بھی لندن کی ہے مگر کبھی لندن والون نے امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے مصنفون کا کبھی ایسا ناطقہ نہ بند کیا ہوگا جیسا کہ ان لوگون نے ہندوستان کے اُردو دانون اور اُردو لکھنے والون کا ناطقہ بند کر رکھا ہے - عربی مین اہل حجاز اور خاصتہً قریش کو فصاحت و بلاغت کا دعویٰ تھا - مگر جاہلیت اور اسلام دونون زمانون مین شعراے عرب کے لیے یہ قید نہ تھی کہ صرف قریش یا اہل مکہ مین سے ہون - ان مین مضری و نزاری شعرا بھی تھے اور یمانی شعرا بھی تھے - کوئی بنی طے مین سے تھا، کوئی بنی شیبان مین سے - کوئی یمن کا تھا اور کوئی نجد کا - کوئی بنی کندہ سے علاقہ رکھتا تھا اور کوئی آل غسان سے - وہ عموماً ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے، اپنی اور اپنی قوم کی فوقیت جتاتے تھے مگر یہ نہ کہتے تھے کہ چونکہ فلان شاعر قریشی نہین ہے لہذا اُسکے کلام کا اعتبار نہین - اب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ قرآن اگرچہ قریش کی زبان مین اُترا تھا مگر دیگر قبائل کی زبانون کے بھی مستند مانے جانے ہی کی وجہ سے قرآن کی مختلف قرائتین ہو گئین - یہی حال فارسی کا ہے - پہلے شیراز فصاحت کا سرچشمہ تھا اور اب طہران کو اُس کی رقابت کا دعویٰ ہے - مگر شعراے ایران نے سارے ملک کے شعرا کو بلا استثناء و امتیاز اُن کی لیاقتون کے اعتبار سے مستند و معتبر مانا ہے - اور کبھی یہ بات زبان سے نہ نکالی کہ چونکہ فلان شاعر شیراز یا طہران کا نہین ہے لہذا اُس کا اعتبار نہین کیا جا سکتا -

یا تو مذکورۂ بالا ترقی یافتہ زبانون کے شعرا اور سخن سنجون کی یہ وسیع الخیالی ہے یا ہمارے دہلی اور لکھنؤ کے شاعرون کی یہ تنگ نظری ہے کہ اُنکے شہر کی چاردیواری سے جو باہر ہو وہ چاہے محنت کرتے کرتے مرجائے اور چاہے زبان ہی کی تحصیل مین جان دیدے مگر اُنکے نزدیک وہ اس قابل ہی نہین کہ اُس کا کلام دیکھا جائے یا اُس پر اعتبار کیا جائے یا زبان پر اُس کا کوئی حق سمجھا جائے -

ان کے خیال میں ایسی ہوئی ہے کہ انکے شہر کا جاہل بھی دیگر مقامات کے اُن شاعرون سے بدرجہا بہتر ہے جو اپنی ساری زندگی شعر و سخن کی نذر کردین -

اسکے ماننے مین کسی کو عذر نہین ہو سکتا کہ یہ لوگ ایک فصیح و شایستہ زبان آغوش مادر مین سیکھ لیتے ہین اور انکو ایک خاص لب و لہجہ حاصل ہو جاتا ہے جو دوسرون کو نہین نصیب ہو سکتا - مگر الفاظ کی تحقیق اور بندش - خیالات کے عمدگی سے ادا کرنے کا سلیقہ اُسی شخص کو آئے گا جو محنت کرے گا اور اُسی حد تک آئے گا جہان تک محنت کرے گا عام اس سے کہ وہ دہلی کا ہو یا لکھنؤ کا -

انگریزی زبان کی آمیزش' عام صاحبان علم مین انگریزی مذاق کے پیدا ہو جانے - کتب قانون کے اُردو مین ترجمہ ہونے اور اخبارات کے مختلف شہرون مین جاری ہونے کا اب یہ نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اُردو زبان بدل گئی اور بدلتی جاتی ہے - جو زبان اب رواج پا گئی ہے اور جس کو ترقی ہو رہی ہے وہ سچ پوچھیے تو نہ لکھنؤ کی ہے اور نہ دہلی کی - بلکہ وہ ایک عجیب ملی جُلی اور نئی ترکیبون اور نئی بندشون کی زبان ہے - اُسکے لکھنے کے لیے بغیر جدید مذاق کی تعلیم پائے نہ دہلی والے قلم اُٹھا سکتے ہین اور نہ لکھنؤ والے - بلکہ میرا تو یہ تجربہ ہے کہ یہ لوگ اس زبان سے بمقابل دیگر مقامات کے لوگون کے زیادہ ناآشنا ہین -

وہ دہلی اور لکھنؤ کے پُرانے شاعرانہ اور لٹریری دنگل فنا ہوگئے - یہ شہر نہ علم و فضل کے مرکز رہے اور نہ تعلیم و ترقی کے - دہلی ایک محدود درجے کی تجارت کا مستقر بنا ہوا ہے لکھنؤ کو یہ بھی نہین نصیب - اب تو علمی مرکز حیدرآباد اور علی گڑھ وغیرہ ہین - یا اخبارات کی ترقی اور پنجاب یونیورسٹی کی اورینٹل شاخ کی وجہ سے لاہور ہے - اور انھین شہرون مین علم و فضل کو ترقی ہو رہی ہے حیدرآباد اگرچہ پہلے بہت پیچھے تھا مگر اب شاعرانہ مذاق کے بڑھنے اور اسکیلئے اُردو جاننے والون کو اطمینان و فارغ البالی حاصل ہونے کی وجہ سے بہت ترقی کر رہا ہے - اور ادھر آخری چند برسون مین وہان شاعری کا بہت اچھا ڈولپمنٹ ہوا ہے - مولٰنا شبلی کی کوشش سے انجمن ترقی اُردو کا مستقر وہی قرار پا گیا ہے - جس مین یہ نہین کہتا کہ ان شہرون کی زبان دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے فصاحت

اور صحت میں بڑھ گئی ہے۔ لیکن اگر زمانہ کا یہی رنگ اور زبان کی یہی رفتار رہی تو پوری طرح پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ عنقریب کسی زمانے میں حیدر آباد۔ علی گڑھ اور لاہور زبان کی ترقی کے مرکز بنین گے اور یہی شہر صحیح و فصیح زبان کے معیار ہون گے۔

لیکن ابھی تک زبان کے مرکز دلی اور لکھنؤ ہی بنے ہوے ہیں۔ اور انکو یہ فوقیت اور فخر حاصل ہے کہ صحت میں انکی سند مانی جاتی ہے۔ اور جب کوئی مسئلہ زبان کے متعلق پیدا ہوتا ہے تو عموماً انھین شہرون کے شعرا کی جانب لوگ رجوع کرتے ہین۔ ان شہرون کے لوگون کا فرض تھا کہ اپنی اس فضیلت پر خوش ہو کے کوشش کرتے کہ زبان کو ہر جگہ وسعت اور ترقی حاصل ہو اور اُردو سارے ہندوستان کی زبان بنتی جائے۔ مگر بجاے اسکے چاہتے ہین کہ دلی و لکھنؤ کے باہر جو کوئی اُردو مین گفتگو کرتا ہو اُس پر ہنسین۔ قہقہے اُڑائین۔ اور زور چلے تو اُسکی زبان بند کر دین۔ اور دعوی کرین کہ سوا اُنکے اور کوئی اُردو مین شعر و سخن کہنے کا مجاز ہی نہین ہے۔ کیونکہ جب یہ ہر شہر والے کی نسبت خیال رکھتے ہین کہ اسے کبھی اُردو آہی نہین سکتی تو پھر ظاہر ہے کہ گویا اُس کی زبان بند کرنے ہی کی کوشش کر رہے ہین۔

افسوس کہ یہ مضمون ناتمام رہ گیا۔ آیندہ نمبر مین ہم یہ بھی بتائین گے کہ خلافِ مذاق اور لٹریچر کے مختلف اغراض کے مصنفون نے اسے کس طرح کشمکش مین ڈال رکھا ہے۔ اور ترقی کی اصلی تدبیر کیا ہے۔

اُردو لٹریچر

انگریزی دانون یا اُن لوگون کو جو آج کل کی اصطلاح مین تعلیم یافتہ تسلیم کیے جاتے ہین، اپنی مادری زبان اُردو کے متعلق سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ بہت ہی محدود زبان ہے۔ اور نازک خیالات یا اعلیٰ مضامین اُس مین نہین ادا کیے جا سکتے۔ اور انشا پردازی جیسے کمالات اور جیسی خوبیان انگریزی یا دیگر زبانون مین پیدا کر سکتی ہے اُردو مین نہین پیدا کر سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اُردو باوجود اِن ترقیون کے جو اُسے اگلے اور پچھلے دَورون مین حاصل ہوتی رہین نہایت ہی بدنصیب زبان ہے۔ پچاس سال پہلے جب ہندوستان مین عربی و فارسی کا دور دورہ تھا خود اُردو بولنے والون اور صاحبِ علم اہل زبان کا یہ خیال تھا کہ عربی و فارسی کے سامنے اُردو کوئی وقعت نہین رکھتی۔ فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ عربی ہے اور اُس سے تھوڑا بہت فیضِ قابلیت اگر کسی زبان کو حاصل ہوا ہے تو وہ فارسی ہے جس کے لٹریچر مین غیر معمولی شیرین زبانی۔ اور جس کی نظمون مین بہت ہی اعلیٰ درجے کی نازک خیالی و بلند پروازی موجود ہے۔ غرض اُنکے مذاق مین جو کچھ خوبیان تھین عربی و فارسی کے لٹریچر مین تھین۔ اُردو کوئی چیز نہ تھی۔

اب عربی و فارسی مذاق کے ختم ہونے کے بعد جب انگریزی کا دور شروع ہوا اور ہمارے تعلیم یافتہ مغربی مذاقِ سخن سے آشنا ہوے تو اُنھون نے عربی وفارسی کو تو یہ کہہ کے خارج از بحث کر دیا کہ ہم اُن زبانون سے واقف نہین۔ مگر بمصداے "مادّہ بر عضوِ ضعیف می ریزد" اُن کی اعلیٰ تعلیم اور مسلم الثبوت قابلیت کا سارا بار بھی غریب اُردو ہی پر پڑنا شروع ہوا۔ اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہوئی کہ اُردو نہایت ہی ناقص زبان ہے۔ اس مین نہ انگریزی کی سی فصاحت و بلاغت ہے اور نہ مغربی مذاق سخن کی سی دلفریبیان۔

خلاصہ یہ کہ بدنصیب اُردو جس طرح پہلے دور مین بدنام تھی اُسی طرح اِس دَور مین بھی بدنام ہے۔ جیسے اگلے دنون صدہا شعراے سخن سنج پیدا ہو جاتے۔ گھر گھر مشاعرون کی گرم بازاری ہوتی۔ میر۔ سودا۔ اور غالب و ذوق کے ایسے پیغمبرانِ سخن کے غزل سرائی کرتے۔ اور سرور کے ایسے جادو بیان نثار کے داد فصاحت دیتے پر بھی اُردو کوئی عمدہ اور قابل توجہ زبان نہ سمجھی گئی۔ ویسے ہی اب باوجود اس کے کہ دولت برطانیہ کی توجہ سے اُردو عدالت پر حکومت کر رہی ہے۔ تمام ملکی مراسلت اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ اُردو مین جاری ہے۔ آزاد۔ مولوی نذیر احمد۔ اور سرسید کے سے جادو بیان نثار۔ حالی کے سے معجز نما شاعر۔ مولوی شبلی کے سے مورخ اپنے زور قلم کے جادو دکھا رہے ہین۔ شہر شہر اور قصبے قصبے مین اُردو کے مدارس

جا رہی ہین - اور کوئی فن نہین جس کے متعلق کوئی نہ کوئی کتاب اُردو مین نہ شایع ہوگئی ہو - تعلیم یافتہ جماعت یہی کہہ رہی ہے کہ اُردو کی کچھ ہستی نہین - نہ اسکی نظم مین کوئی مزہ ہے نہ اُس کی نثر مین کوئی خوبی ہے -

الحاصل اُردو پہلے بھی مظلوم تھی اور اب بھی ہے - اور اُس پر ظلم کرنے والے خود وہ لوگ ہین جو اُردو کے اہل زبان ہونے کے مدعی ہیں -

هر کس از دست غیر ناله کند سعدی از دستِ خویشتن فریاد

لیکن اس کا سبب کیا ہے کہ اُردو پبلک کو دنیا بھر کی زبانون مین مزہ آتا ہے اور نہین آتا تو خود اپنی زبان مین - اس راز کا پتہ لگانے کے لیے ہم نے اکثر تعلیم یافتہ دوستوں سے سوالات کیے ہین - معلوم کرنا چاہا کہ آخر وہ کون سی خوبی ہے جسے یہ لوگ اُردو مین ڈھونڈھتے ہین اور نہین پاتے؟ ہمین اپنے سوالون کے جواب مین جو کچھ معلوم ہو سکا وہ اسی قدر ہے کہ بعض حضرات کو تو انگریزی سے اُردو ترجمہ کرتے وقت ویسے جامع اور صحیح مفہوم ادا کرنے والے الفاظ نہین ملے جیسے انگریزی مین تھے - بعض حضرات انگریزی کے سے اشعار اُردو مین ڈھونڈھتے ہین اور وہ اُردو مین معدوم ہین - اور جن چند انگریزی نظمون کے ترجمے اُردو مین کر دیے گئے ہین اُن میں وہ انگریزی کی سی بات نہین - غالبًا اِسی قسم کے نقصانات عربی مذاق رکھنے والے سلف صالح کو ہون گے کہ عربی سے اُردو مین ترجمہ کیجیے تو ویسے جامع و حاوی الفاظ نہین ملتے - اور اُردو شاعری مین عربی شعر و سخن کی خوبیان نہین ہین -

لیکن اگر یہی اعتراضات ہین اور اسی قسم کی رائین قائم کرنے کی بنیاد اسی قدر ہے تو میرے خیال مین اُردو زبان تو اتنی تنگ اور محدود نہین - مگر خود اُنکے خیالات مین تنگی اور کج فہمی ہے - اور اس کا الزام بجاے اسکے کہ زبان اُردو کو دیا جائے خود اُنکی لیاقت و قابلیت پر عائد ہوتا ہے -

دنیا کی ہر زبان کا قاعدہ ہے کہ اُس مین گرد و پیش کی چیزون - بولنے والون کی صحبتون - اور اُنکے عادات - اطوار - معاملات کے لحاظ سے اس قسم کے خاص الفاظ ہوا کرتے ہین جو تمام پہلوؤن اور جملہ مفہوماتِ متعلقہ کے اعتبار سے بے مثل و نظیر

ہوتے ہین اور اُسکے مماثل الفاظ جو تمام جہتوں اور کل حیثیتوں سے اُسکے مماثل ہون دنیا کی کسی دوسری زبان مین نہیں مل سکتے"۔ ایسے ہی الفاظ ہین جن کی مناسبتوں اور خوش ترتیبون سے اُس زبان کا لٹریچر بنتا ہے۔ اُنھین کے ضمنی اشارون اور اُنھین کے لوازم و تعلقات سے شاعرانہ خوبیان پیدا ہوتی ہین اور فصاحت و بلاغت کا جوہر چمکتا ہے۔

یونانی - لاطینی - سنسکرت - عربی - فارسی - فرانسیسی - یا انگریزی کی تخصیص نہین۔ ہر معمولی سے معمولی زبان مین بھی اس قسم کے الفاظ کثرت سے موجود ہوتے ہین جن کے تناسب سے کبھی رعایت لفظی کی خوبیان پیدا ہو جاتی ہین اور کبھی رعایت معنوی کی - اور یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کے اعلیٰ درجے کے اشعار اور عمدہ نثرون کا ترجمہ کسی دوسری زبان مین (چاہے وہ کوئی ہو) نہین ہو سکتا۔

موجودہ مذاق کے جو تعلیم یافتہ حضرات اُردو کی بے مائگی کے اس لیے قائل ہو گئے ہون کہ اُنھین کسی انگریزی فصیح و بلیغ کتاب کا ترجمہ کرنے مین دشواریان پیش آئین (گو ہمین اُن کی مصیبت سے پوری ہمدردی ہے۔ اور افسوس کہ اُن کی اس مشکل کو ہم دُور بھی نہین کر سکتے مگر اُن کی غلط خیالی کی اس طرح اصلاح ضرور کر سکتے ہین کہ) اگر اُن مین قابلیت ہو تو کسی با محاورہ اور فصیح اُردو عبارت کا ترجمہ انگریزی مین بھی کر کے دیکھین - اور انصاف سے بتائین کہ اُردو زبان مین ترجمہ کرنا مشکل ہے یا انگریزی زبان مین؟ جتنی دشواریان اُردو ترجمہ کرتے وقت پیش آیا کرتی ہین اُن سے زیادہ یا کم از کم اُتنی ہی انگریزی ترجمہ کرنے مین بھی پیش آتی ہین یا نہین؟ یہ امر سب کو گران گذر رہا ہے کہ شیکسپیر کے کسی ڈراما کا ویسا ہی با مزہ ترجمہ اُردو مین باوجود متواتر کوششون کے نہ ہو سکا۔ مگر اسکی طرف کسی کا خیال نہین گیا، کہ مثنوی میر حسن ؔ- اور مثنوی گلزار نسیم کے دو چار شعرون - یا فسانہ عجائب کی چند سطرون کا انگریزی ترجمہ کرنے کی کسی کو جرأت بھی ہو سکی یا نہین؟ مگر افسوس تعلیم یافتگی کا موجودہ مذاق ایسا ہے کہ کیا عجب جو یہ بھی کوئی اُردو ہی کا عیب نہ تصور کر لیا جائے۔ اور صاف الفاظ مین کہہ دیا جائے کہ اُردو ایسی بیہودہ اور ناقص زبان ہے کہ اُس مین انگریزی لٹریچر کی خوبیان نہ پیدا

ہو سکنے کے علاوہ یہ بھی عیب ہے کہ اُس کی بہو دگیان انگریزی الفاظ مین کسی طرح نہین ادا ہو سکتین۔

الغرض یہ جتنے اعتراضات ہو رہے ہین اور اُردو کے جتنے عیوب بتائے جا رہے ہین خود معترضون کے نقصانات اور اُنکی خام خیالیان ہین۔ اور موجودہ طور پر اُردو کا کوئی سچا عیب نہین بتایا جا سکتا۔ مگر ہمین ابھی یہ معمہ حل کرنا باقی ہے کہ اگلے دنون خود اُردو کے اہل زبان عربی دانون کے خیال مین اُردو اس قدر حقیر کیون تھی؟ یا آج کل ہمارے اہل زبان انگریزی دانون کے نزدیک وہ اس قدر بے مایہ اور ناقص کیون ہے؟

اصل یہ ہے کہ لٹریری ذوق بھی منجملہ اُن مذاقون کے ہے جن کو انسان کوشش کرکے اپنی طبیعت مین پیدا کیا کرتا ہے۔ جیسے کہ حُقّے اور تمباکو کا ذوق ہے کہ فطرۃً انسان اُسکو پسند نہین کرتا۔ مگر چند روز تک اپنے آپ کو اُس کا عادی بنا لینے کے بعد پھر اُسے معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان چیزون مین کیا ذوق ہے۔ صرف اسی تمباکو پر موقوف نہین۔ غور کیا جائے تو انسان کے تمام ذوق اُسکے مکسوبہ ہوا کرتے ہین۔ اور اسی کسب نے مختلف ممالک مین اختلاف مذاق پیدا کر دیا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کی لذیذ غذائین۔ دماغ معطر کرنے والی خوشبوئین۔ نظر فریب خوبصورتیان۔ سامعہ نواز آوازین۔ اور اسی کے ساتھ وضع قطع۔ لباس۔ اور سامان معاشرت کی سب چیزین بدلی ہوتی ہین۔ جو غذا مغرب مین لذیذ ہے، مشرق مین بدمزہ۔ جو عطر مشرق مین دماغ کو تازہ کر دیتا ہے اُسی کی خوشبو پر مغرب مین ناکین بند کر لی جاتی ہین۔ حتیٰ کہ ایک ملک کی معشوقۂ دلربا دوسرے ملک کی بدشکل اور بدقطع عورت ہے جسکے سایہ سے بھی لوگ بھاگتے ہین۔ اسی طرح ہر قوم اور ہر زبان کا لٹریچر بھی ایک نیا ذوق رکھتا ہے۔ اور ذوق صرف حاصل کرنے اور کوشش کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور اسی ذوق کے پیدا کرنے کے لیے ہر ملک مین پہلے خود وہان کی مادری زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور طلبہ جب اُس مین پختگی حاصل کر لیتے ہین تو اُن اعلیٰ درجے کی زبانون کی طرف متوجہ کیے جاتے ہین جو کلاسیکل سمجھی جاتی ہین اور علمی اور تاریخی عظمت رکھتی ہین۔ بخلاف اسکے ہندوستان کو بدنصیبی سے شاید ہی

کبھی وہ زمانہ نصیب ہوا ہو جبکہ ابنائے وطن کو وہ زبان سکھائی جاتی ہو جو وہان بولی جاتی تھی۔

شاید کبھی ہندوستان مین ایسا ہو کہ سنسکرت بولی بھی جاتی ہو اور پڑھائی بھی جاتی ہو۔ مگر خود ہندوون کو اس سے انکار ہے۔ اس لیے کہ اُنکے خیال مین سنسکرت دیوتاؤن کی زبان ہے۔ اور کبھی انسان کی مادری زبان نہ تھی۔ جن انگریزی مورخین نے اُسے آریہ فاتحین کی زبان ثابت کیا ہے اگر اُنکی تحقیق مان لی جائے تو تاریخی عہد سے پیشتر اُس قدیم متبرک زمانے مین بھی صرف فتحیابون اور حاکمون کی زبان ہوگی۔ ہندوستان کے لوگون کی کوئی اور زبان ہوگی۔ جس سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اُس عہد مین بھی تعلیم سنسکرت کی ہوتی تھی۔ جو ملکی زبان نہ تھی۔ اور جس وقت مسلمانون نے ہندوستان کو فتح کیا ہے اُسوقت تو اس مین شک نہین کہ مادری زبان اور تھی اور تعلیمی زبان اور۔ کیونکہ سارا لٹریچر سنسکرت یا ماگدھی مین تھا جو کہ ملکی زبانین نہ تھین۔

مسلمانون کا عہد شروع ہونے کے بعد پہلے سے زیادہ خرابیان پیدا ہوئین یعنی ہندوون کی تعلیمی زبان تو سنسکرت رہی۔ اور مسلمانون کی تعلیمی زبان بلحاظ مذہب عربی اور بلحاظ حکومت فارسی ہوگئی۔ مگر وہ زبان جو ملک مین بولی جاتی تھی اُسے تعلیم گاہون مین ہرگز جگہ نہ مل سکی۔ یہان تک کہ بازاری میل جول اور ہندو مسلمانون کے امتزاج نے اُردو زبان پیدا کی۔ لیکن تعلیم آخر تک فارسی و عربی ہی مین ہوتی رہی۔ یہی کیفیت تھی کہ انگریزی عہد شروع ہوا اور فارسی کی جگہ انگریزی کی تعلیم ہونے لگی۔ اب یہ ہوا کہ مذہبی اور قومی ضرورتون کے لیے مسلمانون نے فارسی اور عربی کو اور ہندوون نے ہندی و سنسکرت کو اختیار کیا۔ اور حکومت کی زبان انگریزی ہوگئی۔ اُردو جو ملک کی مادری زبان ہے اُسکی طرف سے اب بھی بے پروائی رہی۔

اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ برٹش گورنمنٹ نے اُردو زبان کو ممالک متحدہ وغیرہ کی مادری زبان تصور کر کے ہندوستان کے قدیم رواج کے خلاف سرکاری اور دفتری زبان بنا دیا۔ جس کی وجہ سے عام طور پر خط و کتابت اُردو مین ہونے لگی۔ اخبارات بھی اُردو مین جاری ہوے اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی اُردو ہی اختیار کی جانے لگی۔ سرکار نے اُس کا یہ فروغ دیکھ کے دیہات اور قصبات مین اُردو کی

تعلیم بھی جاری کر دی۔ مگر اول تو وہ تعلیم اس قدر ناقص اور ناتمام درجے تک تھی کہ اُس سے طلبہ میں کوئی لٹریری ذوق نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف ہندو مسلمانوں میں ایسا اختلاف ہوا کہ ہندوؤں نے ہندی کو اپنی مادری زبان بتایا جو اگرچہ بھی تھی تو چند روز کی کوششوں سے اُن کی مادری زبان بن گئی۔ اور اُردو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھی جانے لگی۔ ان دونوں باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ اُردو کی تعلیم کی طرف جو عام رجحان تھا اُسے نقصان پہونچنے لگا۔ بہر حال اُردو کی جیسی تعلیم ہونی چاہیے تھی نہیں ہوتی۔ اور اُردو خوانوں میں کسی قسم کا ذوق انشا پردازی پیدا ہونے نہیں پاتا

علاوہ بریں محض اُردو خوان ایک طرف انگریزی دانوں کے مقابل میں اور دوسری طرف عربی فارسی جاننے والوں کے مقابل اس قدر کم حیثیت تصور کیے جاتے ہیں کہ اُنکی راؤں۔ اُنکے خیالوں اور اُنکے مذاق کی ذرا بھی وقعت نہیں ہوتی۔ جاہلوں سے وہ کچھ یوں ہی سے ممتاز خیال کیے جاتے ہیں جنھوں نے ابتدا سے انتہا تک انگریزی یا عربی و فارسی لٹریچر کی با ضابطہ طریقے سے تعلیم پائی ہے۔ اور جنھوں نے اپنے دل و دماغ میں انگریزی یا عربی کے مذاق سخن کو پرورش کر کے خوب راسخ کر لیا ہے۔

یہ لوگ ابتدا ہی سے انگریزی اور عربی کی نحو و صرف اور فصاحت و بلاغت کو محنت اور توجہ سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اور علوم پڑھتے ہیں اُن سب کو انھیں زبانوں میں سیکھتے اور درجۂ کمال حاصل کرتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ سب یا انگریزی لٹریچر کے دلدادہ ہو جاتے ہیں یا عربی لٹریچر کے۔ اپنی مادری زبان سے رشد و بلوغ کے زمانے میں کوئی اُنس نہیں پیدا ہونے پاتا۔ اگر کبھی تفنن طبع کے لیے مادری زبان کی طرف توجہ بھی کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ اُس میں بھی اُنکو وہی لطف آئے جو انگریزی یا عربی و فارسی میں آتا تھا مگر وہ لطف نہیں حاصل ہو سکتا۔ کیونکہ اُنکو جو لیاقت و قابلیت پیدا ہوئی ہے یا جس زبان میں اُنھوں نے لیاقت و شایستگی کو دیکھا وہ عربی ہے یا انگریزی۔ لہذا خواہ مخواہ اپنی مادری زبان یعنی اُردو ہی کو الزام دینے لگتے ہیں کہ بہت ناقص زبان ہے اور اس میں کسی قسم کے علمی مضامین نہیں

ادا ہو سکتے۔

خلاصہ یہ کہ اُردو زبان کو جو صحیح ترقی نہین ہوتی اور خود اپنے اہل زبان کاملین مین اسے مقبولیت نہین حاصل ہوتی اُس کا اصلی سبب یہی ہے کہ اہنا سے وطن بجاے مادری زبان کے کسی اور زبان کے لٹریچر کو خوب پر ورش کر کے اپنا اصلی مذاق بنا لیا کرتے ہین۔ یورپ مین جو تم دیکھتے ہو کہ ہر ملک اور ہر قوم کا لٹریچر روز افزون ترقی کرتا جاتا ہے اور انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمنی۔ اور اِٹیلالی زبانون کا لٹریچر بڑھتے بڑھتے ساری دنیا پر چھا جاتا ہے۔ اور دنیا کی دوسری قومین اُن کی خوبیون کے مقابل خود اپنی زبانون کو بھولی جاتی ہین۔ اس کا اصلی باعث یہی ہے کہ اُن ممالک کے باشندے پہلے خود اپنی زبان کے لٹریچر مین کمال حاصل کر لینے کے بعد دوسری زبانون کی طرف توجہ کرتے ہین۔ وہان بڑے بڑے لنگوسٹ (ماہرین السنہ) اور اورینٹلسٹ (مستشرقین) اور فائلالوجسٹ (علم السنہ کے جاننے والے) پیدا ہوتے ہین۔ جو تحقیق کے ساتھ دنیا کی تمام زبانون پر اجتہادی نظر ڈالتے ہین۔ مگر یہ سب کمالات اُسوقت پیدا کرتے ہین جب اپنی زبان مین باکمال بن لیتے ہین اور اپنی زبان کے نحو و صرف اور علم ادب کا ذوق اُنکے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی ہو چکتا ہے۔

اس کا علاج یہ تھا کہ سررشتۂ تعلیم کے اُردو مدارس کی اصلاح کی جاتی۔ مگر افسوس کہ یہ غیر ممکن ہے۔ اُردو مدارس کی حالت سُدھارنے مین نہ آج تک کامیابی ہوئی اور نہ کامیابی کی اُمید ہے۔ اس لیے کہ سررشتۂ تعلیم ترقی تعلیم کا ذریعہ ہونے کے عوض اپنے خود غرض عہدہ دارون کے ہاتھون ایک اعلیٰ درجے کی تجارت گاہ بنگیا ہے اور اُنھین لوگون کی کتابین داخل درس کی جاتی ہین جو اپنے نفع مین عہدہ دارون کو شریک کرین۔ دکھانے کے لیے ایک بورڈ ہے۔ مگر بورڈ کے نفس ناطقہ ڈائرکٹر صاحب ہین جن کے اشارون پر بورڈ چلتا ہے اور ڈائرکٹر صاحب کی رائے دراصل اُنکے کسی معتمد علیہ ماتحت عہدہ دار سررشتۂ تعلیم کی راے ہوتی ہے۔

گو ہندو خود کہہ رہے ہین کہ اُردو ہماری زبان نہین۔ وہ مسلمانون کی زبان ہے۔ مگر باوجود اسکے اکثر یہی نظر آیا کرتا ہے کہ سررشتۂ تعلیم کی اُردو کتابون کے مصنف و مولف ہندو ہی ہوتے ہین۔ یا کبھی مسلمان بھی ہوئے تو وہ جو سوا اسکے کہ سررشتۂ تعلیم

مین کسی خدمت پر ممتاز ہین۔ ملک مین اُنھین کوئی لٹرری وقعت نہین حاصل ہوتی۔ اسی خرابی کی وجہ سے اُردو نصاب تعلیم سے بدتر شاید کسی زبان کا نصاب نہ ہوگا۔ نحو و صرف اور معانی و بیان کے مفید رسالون کا تصنیف ہونا درکنار سچ یہ ہے کہ آج تک اُردو کی الف بے بھی صحیح اصول پر مرتب نہ ہو سکی۔

ایسی صورت مین اُردو کے درست ہونے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے اور کس طرح سے ملک مین ملکی زبان کا سچا مذاق پیدا ہو سکتا ہے۔ بہرحال اُردو ایک فلاکت زدہ قوم کی مصیبت زدہ زبان ہے۔ اور جس حال مین اپنی قوم کو پاتی ہے اُسی کے مناسب طریقے سے نباہ رہی ہے۔

اُردو و لٹریچر

ایک بہت بڑی کمی ہمارے لٹریچر مین یہ بتائی جاتی ہے کہ اُردو مین اسوقت تک علمی مصطلحات کی بہت کمی ہے۔ اور ہم جس وقت کسی علمی مسئلہ کے متعلق یا کسی فن کے مسائل پر بحث کرنا چاہین تو مجبور ہین کہ اگر وہ کوئی قدیم علم و فن ہو تو عربی کی اصطلاحات اختیار کرین اور اگر کوئی نیا علم و فن ہو تو انگریزی کی اصطلاحات۔ کہا جاتا ہے کہ اہل عرب نے جب ان علوم کو لیا ہے تو خاص اپنی زبان مین سے اصطلاحی الفاظ تراش لیے تھے جسکی یہ برکت تھی کہ غیر زبانون کی غلامی سے آزاد ہو گئے۔ اور عربی سچے خود ایک علمی زبان بن گئی۔ مگر ہم سوا دوسری زبانون کی خوشہ چینی کے اور کچھ نہین کر سکتے۔

یہ کمی اس قدر محسوس کی جا رہی ہے کہ ہندو مسلمان دونون اس فکر مین ہین کہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق علمی اصطلاحات تصنیف کرین۔ ہندو چاہتے ہین کہ ہندی مین کھپنے والے اصطلاحات ہون اور اُنکا ماخذ سنسکرت قرار دی جائے۔ مسلمان چاہتے ہین کہ اُردو کی مناسبت کے لیے عربی زبان ماخذ قرار دی جائے۔ اور جتنے اصطلاحات لیے جائین عربی سے لیے جائین۔ اسی دُھن مین دونون گروہ طرح طرح کی کوششین کر رہے ہین۔ کوئی چاہتا ہے کہ اصطلاحات کی ایک جدید کتاب لغت تصنیف کر کے شایع کر دی جائے۔ کوئی تھوڑے تھوڑے اصطلاحات

بنا کے اخباروں اور رسالوں میں شایع کر دیتا ہے تاکہ عام لوگ انکو اختیار کر لیں اور وہی مصطلحات آیندہ علمی کتابوں میں اختیار کیے جائیں۔

جدید علوم جو اب نئے نئے یورپ میں پیدا ہوے ہیں انکی اصطلاحوں کے ترجمہ کی کوشش چند روز ہوے مصر میں بھی ہو رہی تھی۔ اور متعدد علما نے اپنی متحدہ کوشش سے اس قسم کے نئے عربی اصطلاحات تراش تراش کے وہاں کے رسالوں اور اخباروں میں شایع کرنا شروع کیے تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ سب لوگ عام اس سے کہ مصر کے ہوں یا ہندوستان کے اور ہندو ہوں یا مسلمان سب غلطی پر ہیں۔ اور انکی یہ سب کوششیں نقش بر آب ہیں۔ نہ انکے تراشے ہوے الفاظ زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ ان سے انکے لٹریچر کو کسی قسم کا نفع حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ ایک سامنے کا اور کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ لغت زبان کا تابع ہے نہ یہ کہ زبان لغت کے تابع ہو۔ جو الفاظ کسی زبان میں پیدا ہو چکے ہیں عام اس سے کہ اس زبان کے اصلی الفاظ ہوں یا کسی دوسری زبان سے لیے ہوے ان کا استقرا اور استقصاء کر کے لغت مدون کیے جاتے ہیں۔ مگر آج تک دنیا میں کبھی یہ نہیں ہوا کہ الفاظ عام اس سے کہ مصطلحات ہوں یا عام قسم کے کتب لغت سے لے کے تحریر و تقریر میں شامل کیے جائیں۔ اصطلاحوں کی تصنیف و ایجاد کا صحیح محل یہ ہے کہ ہر فن پر ایک کتاب تصنیف کی جائے اور اس میں ضرورت کے مطابق نئے اصطلاحی الفاظ تریج کے کام میں لائے جائیں۔ اور جب وہ کتابیں اس فن کے نصاب میں شریک ہو جائیں تو ان سے لیکے وہ مصطلحہ الفاظ لغت میں اضافہ کیے جائیں۔

لیکن یہاں ایسا نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسوقت تک جتنی کتابیں علوم قدیمہ و جدیدہ کی اردو میں لکھی گئیں ان سب میں عموماً یہی طریقہ اختیار کیا گیا کہ بجاے اسکے کہ اصطلاحات کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈھے جاتے عربی و انگریزی کے الفاظ بجنسہ نقل کر دیے گئے۔ جن سے صرف اردو جاننے والے نہ مانوس ہیں اور نہ انھیں صحیح طور پر زبان سے ادا کر سکتے ہیں۔ ان اصطلاحوں کی غیر مانوسی کی وجہ سے علوم و فنون کی تعلیم ہندوستان میں کسی طرح عام نہیں ہو سکتی۔ اور اردو لٹریچر کے حامیوں کو اپنے سامنے ایک ایسی دشواری نظر آتی ہے جو کسی طرح

ہٹائے نہین ہٹتی۔

اس مشکل کا اصلی راز وہی ہے جو اسی مضمون کے پہلے حصہ مین بیان کر چکے ہین یعنی اُردو تعلیم کا ناقص ہونا۔ اُردو مذاق کا مغلوب رہنا۔ خود اہل زبان کا اپنے وطنی لٹریچر سے مطمئن نہ ہونا۔ اور خاص اُردو زبان کے متعلقہ مسائل مین بھی اُردو دانون کے مقابل عربی و انگریزی جاننے والون کا اثر زیادہ ہونا۔ ہمارے سامنے سب سے آخری مثال عربون کی ہے۔ اُنھون نے جسوقت یونانی و رومی اور دیگر السنہ کے علوم و فنون کو اپنی زبان مین لیا ہے اُسوقت چند محدود مترجمین علوم تھے اور جس پبلک کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ کتب علوم کا ترجمہ کرتے اُسپر عربیت کا ذوق غالب تھا۔ اُس مین صرف اپنی مادری زبان کا جاننے والا دیگر السنہ کے ماہرین کے سامنے ذلیل و کم وقعت نہین تصور کیا جاتا۔ بلکہ وطنی لٹریچر کا اثر اس قدر غالب تھا کہ مترجمین اگر اُسکے خلاف یا اُس سے نامناسب روش اختیار کرتے تو اپنی کوشش مین سرسبز نہ ہوسکتے۔ اس لیے وہ مجبور تھے کہ ہر اصطلاح کے مقام پر کوئی عربی ہی لفظ اختیار کرین بلا لحاظ اسکے کہ لغتہً وہ اصلی یونانی و رومی الفاظ کا پورا پورا ہم معنی ہو یا نہ ہو۔ جب وہ ایسے الفاظ کو اختیار کر لیتے تو کتاب کے مشہور ہوتے ہی وہ علمی دنیا مین مقبول ہو جاتے۔ اور اصل مین نہ بھی ہوتے تو اصطلاح قرار دیے جانے کے بعد اُن یونانی و رومی اصطلاحی الفاظ کے ہم معنے بن جاتے۔

خود اُردو زبان مین بھی ہمارے سامنے ایک اسی قسم کی نظیر موجود ہے۔ تعزیرات ہند اور دیگر کتب قوانین کا ترجمہ جب اُردو زبان مین کیا گیا اور گورنمنٹ نے چند قابل بزرگون کو اس خدمت پر مامور کیا تو اُنھون نے تمام قانونی مصطلحات کے لیے جو الفاظ مناسب معلوم ہوے تراش کے قائم کر دیے۔ گو ان الفاظ سے اُس سے پہلے کبھی اصطلاحون کا کام نہین لیا گیا تھا۔ اور پہلے پہل جب کام مین لائے گئے ہین بعض لوگون کو بھدے۔ گران۔ اور غیر مانوس معلوم ہوے ہونگے۔ مگر جیسے ہی وہ قانونی کتابین ملک مین پھیلین۔ عدالتون نے اُنکی طرف توجہ کی۔ وکلا اور اہل عمد اُن سے کام لینے پر مجبور ہوے۔ وہ اصطلاحین بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئین۔

اور اُن مین نہ کسی قسم کی گرانی تھی اور نہ کسی طرح کی نا مانوسی - اور چند روز بعد وہی الفاظ قانون کی کتابون سے لیکے کتب لغت مین بھی درج کر دیے گئے -

لہذا یہ کمی یون نہین پوری ہو سکتی کہ ان اصطلاحات کی ایک کتاب لغت تصنیف کر کے شایع کر دی جائے بلکہ انجمن اُردو یا دیگر حامی زبان انجمنون کا کام بجائے لغتون کے تصنیف کرانے کے یہ ہونا چاہیے کہ جن علوم و فنون کے اصطلاحات بنانا منظور ہون اُنھین کے متعلق جامع و مانع اور مختصر رسالے تصنیف کرا کے شایع کیے جائین اور اُن مین اصطلاحات کا ترجمہ مناسب الفاظ مین کیا جائے -

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مصطلحات کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہین بلکہ عربی سے علوم قدیمہ کے جو پُرانے اصطلاحات اُردو مین لیے جا چکے ہین وہ تو وہی برقرار رکھے جائین اور علوم جدیدہ اور خاصتہً سائنس کے لیے نئے اُردو یا عربی اصطلاحات پیدا کرنے کے بجائے انگریزی مصطلحات بجنسہ اُردو مین نقل کیے جائین - لیکن اس سے نہ اُردو کوئی علمی زبان بن سکتی اور نہ اُردو لٹریچر اپنی کوئی وقعت قائم کر سکتا ہے -

علم طب کے متعلق کون کتاب یا کون سا مسئلہ ہے جس کا ترجمہ فارسی یا اُردو مین نہین ہو گیا - بلکہ مفردات اور نیز قرابادینون کے لحاظ سے دیکھو تو فارسی و اُردو کی تو تصنیف کتابین زیادہ حاوی اور جامع ہین - لیکن محض اس وجہ سے کہ طب کے تمام مصطلحات عربی کے ہین اس فن مین فارسی اُردو دونون عربی کی غلامی سے آزاد نہ ہو سکین - جو طبیب عربی زبان نہ جانتا ہو مستند اور باوقعت نہیں مانا جاتا - حتیٰ کہ یہ خیال ہر شخص کے ذہن نشین ہے کہ بغیر عربی پڑھے طب آ ہی نہین سکتی -

اسی طرح اگر آپ سائنس کے متعلق اصطلاحات کو انگریزی سے بجنسہ نقل کر لین گے قطع نظر اس کے کہ علوم سائنس اُردو دان طلبہ کے لیے بالکل غیر مانوس اور نا قابل فہم رہین گے محض اُردو مین سائنس کی تعلیم پانے والون کا علمی دنیا مین کوئی اعتبار نہ قائم ہو سکے گا - اور ہمیشہ یہی سمجھا جائے گا کہ بغیر انگریزی پڑھے سائنس آ ہی نہین سکتا -

بہر تقدیر حامیان اُردو کو اگر اُردو سے کسی قسم کا اُنس ہے تو اُن کا فرض ہے

کہ اُردو مین سائنس کے فنون کا ترجمہ کرین اور مصطلحات کے مفہوم کو خوب سمجھ کے اُنکی جگہ مناسب الفاظ عام اس سے کہ وہ اُردو کے ہون یا فارسی کے یا عربی کے استعمال کرین - اگر اُن کتابون کو ذرا بھی مقبولیت حاصل ہوئی (اور ضرور حاصل ہو گی) تو ہم کو یقین ہے کہ اچھے خاصے اصطلاحات بن جائین گے اور اُردو چند ہی روز مین ایک علمی زبان بن جائے گی -

ایسے مصطلحات کے کام مین لاتے وقت اس بات کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہین کہ وہ الفاظ خوبصورت - موزون اور پوری طرح ہم معنی ہین یا نہین کیونکہ ابتدائے استعمال کے وقت ہر خوبصورت سے خوبصورت لفظ بھی اُس محل پر بھونڈا اور اُکھڑا ہوا معلوم ہو گا - اور یقین کر لو کہ یہ مصطلحات جس زبان مین قائم کیے گئے ہونگے پہلے پہل ایسے ہی بھونڈے اور غیر مانوس نظر آئے ہون گے - الفاظ و مصطلحات کو صرف استعمال مانوس اور خوبصورت بناتا ہے -

عذرِ گناہ بدتر از گناہ (جون ۱۹۰۱ء)

آزادی - کج خلقی کا نام نہین ہے - اور سختی چاہے علم ہی پر ہو کبھی قابل تعریف نہین ہو سکتی - اگر کسی کی نسبت کوئی کلمۂ خیر (وہ دھوکے ہی مین سہی) زبان سے نکل گیا ہو تو اول تو ہمارے نزدیک اُسکے واپس لینے کی کوئی ضرورت ہی نہین ہو سکتی اور اگر فرض کیجیے کہ واپس لینے کی ضرورت ہو بھی تو بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے "تاکہ کسی کی دلشکنی نہ ہونے پائے"۔

مارچ کے رسالہ "الندوہ" مین الہ آباد کے نئے اور اعلیٰ درجے کے رسالہ "ادیب" کی نسبت یہ الفاظ شایع ہو گئے تھے کہ "حال مین الہ آباد انڈین پریس سے ادیب ظاہری شکل و صورت میں اس آب و رنگ کے ساتھ نکلا کہ تمام لوگ پکار اُٹھے کہ ع اس طرح کا جمال ہو ایسا شباب ہو!" ادیب کی ظاہری حالت، اُسکی خوبصورتی، اور اُسکی تصویرون کے لحاظ سے یہ کوئی نامناسب الفاظ نہ تھے اور اسپر شبہہ ہوتا کیا لوگون کو یقین تھا کہ یہ الفاظ مولانا شبلی کے قلم سے نکلے ہین لیکن اصل مین مولانا کے نہ تھے - اور انکی جانب منسوب ہو جانے سے ان کے

معصومی کے دامن میں ایسا دھبا لگ گیا تھا جس کا دھویا جانا نہایت ضروری تھا چنانچہ اپریل کے الندوہ میں وہ دھبا دھویا گیا۔ دھل تو کیا سکتا تھا ہاں یون کہنا چاہیے کہ اُسی دھبا پڑی ہوئی عبا کو مولوی عبد السلام صاحب ندوی سب اڈیٹر الندوہ نے مولانا کے جسم اطہر سے اُتار کے خود پہن لیا۔ اور فرماتے ہین کہ مولانا کی ذات اس ارفع ہے کہ اُن کے قلم سے عام رسالون کے متعلق ایسے مبالغہ آمیز الفاظ نکلین" اس خیال کے اظہار کے ساتھ عام رسالون پر عام حملہ کر دینے اور اپنے شرمناک تبختر کے الم نشرح کرنے پر بھی الندوہ کو چین نہ آیا اور یہ بھی نہ گوارا ہوا کہ اُس کا سب اڈیٹر بھی" ادیب" کی اتنی تعریف کرے۔ چنانچہ مولانا ندوی مولانا شبلی کی پاکدامنی کی شہادت دینے کے بعد اپنی سابقہ فیاضی کے ایک بڑی حد تک واپس لینے کی غرض سے فرماتے ہین" ہم نے بھی جو کچھ لکھا تھا اُس کا تعلق رسالہ کی مادی حالت سے تھا۔ مضامین کے لحاظ سے ہم اُردو کے کسی رسالہ کو وقیع نہین سمجھتے"۔

کیون حضرت؟ ادیب کی تو خیر یہ خطا تھی کہ آپ کے قلم سے اُسکی تعریف نکل گئی ع اس پہ بگڑے ہین کہ کوئی مجھے کیون یاد آیا۔ مگر اُردو کے اور سب رسالون نے کون سا قصور کیا تھا جو آپ سب پر منہ آ گئے؟

ناوک نے اُسکے صید نہ چھوڑا زمانے مین ۔ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے مین

اچھا صاحب ہم نے مانا کہ آپ اُردو کے کسی رسالہ کو وقیع نہین مانتے۔ لیکن الندوہ کو تو وقیع مانتے ہونگے یا اُسے بھی نہین؟ بیشک اُسے آپ کی نظر مین وقیع ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ وقیع نہ ہوگا تو اور رسالون کے غیر وقیع بنانے کے فتوے کی کیا وقعت رہے گی؟ اور ادیب کی طرف پیاری نگاہون سے دیکھتے ہوے آنا اور آنے کے بعد ٹھکرا دینا" ناز معشوقانہ کے بجاے ایک مجنونانہ فعل تصور کیا جائیگا۔ لیکن سچ یہی ہے کہ جب اُردو کے سب رسالے بے وقعت ہوگئے تو اکیلے ایک الندوہ کے سر پہ فضیلت کی پگڑی بندھی بھی رہی تو کیا۔ لہذا اورون کی پگڑی اگر مولانا الندوہ نے اتاری تو اُن کی پگڑی ہم اُتارے لیتے ہین۔ اور دعوی کرتے ہین کہ الندوہ اُردو کے بدترین رسالون مین ہے۔ اور رسالون سے تو خیر دُنیوی حیثیت سے اسلامی پبلک

کو کچھ فائدہ بھی پہونچ جاتا ہے مگر الندوہ سوا اسکے کہ مسلمانون کے عقائد کو بگاڑکے اور تقدس آبی کی عبا ہین کے اعتزال کی تعلیم دے اسوقت تک کوئی اچھا کام نہین کرسکا۔

لٹریری دنیا مین آنے کے بعد ہر طرف سے تحسین و مرحبا کی آوازین کان مین آنے لگتی ہین۔ ایسی آوازین ان گذشتہ پچیس تیس سال مین اکثر ہمارے کانون مین بھی آتی رہی ہین۔ اور اپنی تعریف کے ہزارہا سرٹیفکٹ جو پبلک سے ملے ہین ہم بھی پیش کرسکتے ہین۔ مگر وہ لوگ قوم مین نہایت ہی بُرا اور ناپاک نمونہ ہین جو اُن تعریفون پر پھول کے سمجھنے لگتے ہین کہ "ہمچومن دیگرے نیست" افسوس عوام کی تو تھوڑی بہت اصلاح ہو بھی جاتی ہے مگر علما سے کبر و نخوت اور خود پرستی کا مرض نہ جانا تھا نہ گیا

علم سے ہمارے نزدیک صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ اپنے عجز اور اپنی لاعلمی کی حد معلوم ہوجاتی ہے۔ لہذا ضرور ہے کہ علم علما مین انکسار پیدا کرے۔ کیونکہ اُن سے زیادہ کوئی اس بات کو نہین جان سکتا کہ فضول دعوے کس قدر بے بنیاد ہوا کرتے ہین۔ اس لیے جن علما مین تکبر و خود پرستی کا مادہ ہو وہ یقیناً نہایت ہی جاہل بلکہ جاہلون سے بدتر ہین۔

الندوہ مین ادیب کی تعریف مین جو چند الفاظ لکھے گئے تھے وہ خود پکارکے کہہ رہے ہین کہ مولوی ندوہ صاحب نے صرف ادیب کی ظاہری صورت کی تعریف کی تھی۔ اور فضیلت مآبی کی سنت قدیم کے مطابق خالی صورت پر فریفتہ ہوگئے تھے۔ کیونکہ فرماتے ہین "انڈین پریس سے ادیب ظاہری شکل و صورت مین اس آب و رنگ کے ساتھ نکلا کہ تمام لوگ پکار اُٹھے ع اس طرح کا جمال ہو ایسا شباب ہو" ان الفاظ کو پڑھ کر کس کے دل مین اس بات کا ذرا بھی شبہہ ہو سکتا تھا کہ جناب قبلہ نے اُسکے مضامین کی تعریف فرمائی ہے۔ اور جب یہ پہلے ہی سے آشکارا تھا تو اس منطق کے معنی ہی کیا کہ "ہم نے جو کچھ لکھا تھا اُس کا تعلق رسالہ کی مادی حالت سے تھا۔ اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ ادیب کی محبت سے باز دعوے دینے پر بھی مولانا الندوہ اپنے کو پاکدامن نہین ثابت کرسکے۔ کیونکہ ادیب کی

مادہی یا دوسرے الفاظ مین یون کہیے کہ سفلی دلربائی کے اب بھی قائل ہین۔ پبلک کے دربار مین تو یہ نامہ داخل کرکے مولانا درحقیقت اپنے پہلے ریویو کے کسی جزو کو بھی واپس نہین لے سکے۔ ہان اپنے تبحر کا اضافہ البتہ ہوگیا کہ "مولانا کی شان اس سے ارفع ہے اور الندوہ کی نظر مین اُردو کا کوئی رسالہ وقیع نہین" اس سے زیادہ صحیح نمونہ عذر گناہ بدتر از گناہ کا نہین ہو سکتا۔

خلیفہ ہارون رشید نے ایکبار کہا تھا کہ یہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" کا مقولہ لغو ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ گناہ کی عذر خواہی کی جائے تو وہ گناہ سے بھی بڑھ جائے؟ دربار کے شوخ طبع شاعر ابو نواس نے عرض کیا کہ مین کسی وقت اس کی صحت کا یقین دلادون گا۔ اسکے بعد شام کو ابو نواس زنانی ڈیوڑھی کے پردے کے پاس چھپکے کھڑا ہو رہا۔ اور جب خلیفہ محل مین جانے لگا تو دوڑکے لپٹ گیا اور اُس کا مُنہ چوم لیا۔ خلیفہ گھبرا کے اور بہت طیش کھا کے کہا "آین یہ کیا؟" ابو نواس گھبرا کے بولا "حضور ہیں، مین سمجھا تھا زبیدہ خاتون (رشید کی خاص محل) ہین" یہ جواب سُنتے ہی رشید اور برافروختہ ہوا۔ اور ابو نواس نے ہاتھ جوڑکے کہا "حضور عذر گناہ بدتر از گناہ اسی کو کہتے ہین"۔ اس بدتر از گناہ معذرت کی عربی لٹریچر مین بڑی شہرت ہے مگر ہمارے خیال مین مولانا الندوہ کی یہ بدتر از گناہ معذرت اس سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ وہان تو اکیلی زبیدہ خاتون پر حملہ ہوا تھا یہان ایک سرے سے سب ہی کی پگڑی اُتار لی گئی۔ مگر مولانا۔ ہم تو بے پگڑی کے بھی جی لین گے آپ اپنی پگڑی سنبھالیے۔

ناول

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران گفتہ آید در حدیثِ دیگران

ہندوستان مین ناول نویسی ایک بالکل نئی چیز تھی۔ اور اُن نئی دلچسپ چیزون مین جنھین مغربی تہذیب نے ہماری زبان سے لا کے انٹروڈیوس کیا ہے۔ انگریزی معاشرت اور لٹریچر سے جتنی نئی چیزین ہمارے ملک مین آئین اُنکے قبول کرنے وقت ابتدا مین اپنی عادت کے موافق ہندوستانیون نے ناک بھون ضرور چڑھائی۔ مگر ناول ایک ایسی دلچسپ اور بامزہ چیز تھی کہ ابتدائی زو مین اسے

سب نے اسے ہنسی خوشی سے قبول کر لیا - اور کیونکر قبول نہ کرتے وہ چیز ہی ایسی تھی مگر چند روز بعد جب دوسرے مذاق اور دیگر علوم و فنون کے مصنفون نے دیکھا کہ ہماری تصانیف کی قدر گھٹی جاتی ہے اور جو ہے کسی نہ کسی ناول کو ہاتھ مین لیے ہوے ہے تو اُنھین ناولون کی کثرتِ اشاعت اور اپنی کتابون کی کساد بازاری پر حسد معلوم ہوا - اور جب کوئی زور نہ چلا تو خواہ مخواہ ناول نویسون اور ناول کے شائقین کو کوسنا شروع کر دیا - اور جس قسم کا لٹریچر اُنکے ہاتھ مین آگیا اُسی سے ناولون پر حملہ کرنے کو تیار ہو گئے - تاکہ اُنکی اشاعت کم ہو اور ملک مین جو اُنکا مذاق بڑھتا جاتا ہے وہ گھٹے - چنانچہ جن حضرات کے سرون پر فضیلت کی پگڑی رکھی ہے (جس کی وجہ سے وہ قوم کے حق مین ایک غیر قابل برداشت بار بن گئے ہین) اُنھون نے فتوے دینے شروع کر دیے کہ ناول نہایت ہی مخرب اخلاق چیز ہین - اور جس طرح ناسمجھ یونانیون نے تعلیماتِ سقراط کی نسبت کہا تھا کہ وہ نوعمرون کے اخلاق بگاڑتی ہین - اُسی طرح ہمارے ہندوستان کے یہ ناعاقبت اندیش ریفارمر ناولون کو مخرب اخلاق بتاتے ہین - اور محض اس لیے کہ اُن مین حسن و عشق کے افسانے درج ہوتے ہین - اور اُن کے مطالعہ سے اگر براہِ راست نہین تو ضمنی طور پر دلون مین بد اخلاقی کے جذبات پیدا ہوتے ہین -

لیکن اگر بد اخلاقی کا یہی معیار ہے تو اُن بزرگون کے نزدیک سب سے پہلے بد اخلاقی کی تعلیم قرآن مجید سے ہوئی ہوگی - جس مین حضرت یوسف اور عزیز مصر کی بی بی کا قصہ عجب دلکش الفاظ مین مذکور ہے - پھر اُسکے بعد بڑی مخرب اخلاق حدیث و فقہ کی کتابون کو ہونا چاہیے جن کی کتاب الطہارت اور دیگر بحثون مین اُن شرمناک باتون کو جائز کر لیا گیا ہے جو اگر یہی معیار قرار دیا جائے جو ہمارے ان فضیلت مآبون اور ناسمجھ ریفارمرون نے قرار دے رکھا ہے تو کسی حال مین جائز نہین قرار دی جا سکتیں -

سچ یہ ہے کہ حسد اور خود غرضی ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کرتی اور بڑون سے بڑون کی آنکھون پر پٹی باندھ دیا کرتی ہے - ان سادہ لوح بزرگون کی سمجھ مین اتنا بھی نہین آتا کہ ناولون مین تعلیم اخلاق کا وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو قرآن مجید مین اختیار کیا گیا تھا کہ واقعاتِ عالم کو دکھا کے اُنکے بُرے یا بھلے انجام کے متعلق علما کے

فتوؤن کی طرح حکم نہ لگا یا جائے بلکہ اُنکے ہر قسم کے انجام کی تصویرین دکھا دی جائین اور اُن کا مشاہدہ کرا دیا جائے - اور یہی تعلیم اخلاق کا وہ طریقہ ہے جو ناولون مین اختیار کیا جاتا ہے -

یورپ مین جو ہر قسم کی اخلاقی - مذہبی اور نیز پولیٹکل اصلاح کا ذریعہ ناول قرار دیے گئے تو یہ کوئی بے عقلی کا کام نہین کیا گیا - اور نہ یورپ ایسا بے عقل اور ناعاقبت اندیش ہے کہ کسی فاش غلطی مین مبتلا ہو جائے - اصل یہ ہے کہ ناول سے زیادہ کوئی موثر پیرایہ کسی مسئلہ یا کسی تہذیب کے ذہن نشین کرنے اور لوگون کو پابند بنا دینے کا ہو سکتا ہی نہین - ناول کا اسلوب وہ شکر ہے جو ہر کڑوی دوا کے خوشگوار بنانے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے - طبیب اگر چاہتا ہے کہ مریض اُسکی مجوزہ دوا کو بے تکلف پی جائے اور وہ دوا ہزار بے مزہ ہو مگر مریض کو استفراغ نہ ہو تو سوا شکر اور مصری سے کام لینے کے وہ اور کوئی تدبیر نہین اختیار کر سکتا - اسی طرح جو معلم اخلاق یہ چاہتا ہو کہ لوگ اُسکے اصول اخلاق پر کاربند ہون تو اُسے سوا اسکے کہ ناولون کے اسلوب کو اختیار کرے اور کسی طرح کامیابی نہین ہو سکتی -

ناول چونکہ ایک دلچسپ مذاق اور سلجھے ہوے مذاق مین لکھے جاتے ہین اور اُن کا لٹریچر وہ ہوتا ہے جسے انگریزی مین لائٹ لٹریچر کہتے ہین - اسلیے اُنھین ادنیٰ و اعلیٰ - تھوڑی قابلیت رکھنے والا بھی - اور زیادہ لیاقت رکھنے والا بھی - یکسان دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور مزہ لیتے ہین - اور یہی سبب اُن کی اشاعت کے بڑھنے اور اُن کی طرف لوگون کے عام طور پر متوجہ ہو جانے کا ہوتا ہے - قابل اور صاحب علم لوگ بھی جس آسانی سے تفریح اور بیکاری کے اوقات مین بغیر اسکے کہ اُنکے دماغون پر کسی قسم کا بار پڑے ناولون کا مطالعہ کر سکتے ہین نہ کسی تاریخ کا کر سکتے ہین اور نہ کسی اخلاقی کتاب کا - اور اُنکی کثرت اشاعت اور عام دلکشی ہی اس بات کا اصلی سبب ہے کہ اسکے ذریعہ سے ضمنی طور پر ہر قسم کی تعلیم دینے کو دیگر طریقون پر ترجیح دی گئی ہے -

یہ بزرگ اس مصلحت پر تو نظر نہین ڈالتے ہین اور خواہ مخواہ اس حسد مین جلے مرتے ہیں کہ ہماری عالمانہ کتابون کو تو کوئی پوچھتا نہین اور یہ بازاری مذاق کی

کتابین بڑے شوق کے ساتھ لی اور پڑھی جاتی ہین - اس شرمناک جوش نے اُن کے پُرانے طرز عمل "لِمَ تقُولوُنَ مَالَاتفعَلوُنَ" کو تازہ کردیا - اور ریاکاری کی جو پُرانی عادت پڑی ہوئی ہے اُس مین ایک حد تک اور ترقی ہوگئی - یعنی جس طرح اور سب اخلاقی امور مین "چون بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند" کی شان فضیلت آبی نمایان ہوا کرتی ہے ناولون کے معاملہ مین بھی ظاہر ہونے لگی - یعنی ہوس پرستی کے ذاتی شوق مین مبتلا ہو کے - اور ون سے چھپا کے - اور کمرے کے دروازے بند کرکے خود تو ناولون کو بڑے لطف سے اور مزے لے لے کے پڑھا کرتے ہین - مگر باہر نکلتے ہی لوگون کو تعلیم دی جاتی ہے کہ "خبردار ناول نہ پڑھنا - پڑھا اور غارت ہوے"۔

اسی سلسلے مین ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہین کہ ناولون نے اُردو دان پبلک کو اس وقت تک کس قدر فائدہ پہونچایا ہے - گو ابھی تک ایسے عمدہ اور اعلیٰ درجے کے ناول اُردو مین بہت کم موجود ہین جو انگریزی کے اعلیٰ ناولون کا مقابلہ کرسکین - مگر اس بے مایگی پر بھی موجودہ ناول ہمین اسلوب زندگی کے جتنے نمونے دکھا چکے ہین گذشتہ صدہا اور ہزارہا سال کا لٹریچر نہین دکھا سکا تھا - اور آج کل کے معیار تعلیم کے اعتبار سے یہی سب سے بڑی تعلیم ہے - اسکے علاوہ تاریخ کا مذاق ملک مین صرف ناولون نے پھیلایا ہے - موجودہ سررشتۂ تعلیم مین اگرچہ تاریخ داخل نصاب کردی گئی ہے - مگر اول تو صرف تعلیم یافتہ گروہ اور طلبہ تک محدود ہے - دوسرے ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ کے علاوہ اور کسی حصۂ ملک کی تاریخ سے سررشتۂ تعلیم کو بہت کم علاقہ ہے - ناولون نے اکثر مختلف اقوام و ممالک کی تاریخ کو ایسے دلچسپ عنوان سے شایع کیا کہ معمولی قابلیت کے لوگ حتیٰ کہ عورتین تک تاریخ کو ایک نہایت دلچسپ فن خیال کرنے لگین - مگر افسوس کہ اُردو مین جن حضرات نے تاریخین لکھی ہین ایسی بے مزہ اور بے لطف زبان مین اور کچھ ایسے بھونڈے عنوان سے لکھی ہین کہ لوگون کے دلون مین تاریخی ناول پڑھ کے تاریخ کا جو شوق پیدا ہوتا ہے وہ تاریخون کو پڑھ کے جاتا رہتا ہے - انگریزی مین اول تو عموماً تاریخین نہایت ہی اعلیٰ درجے کے دلکش رنگ عبارت مین لکھی جاتی ہین - اور اگر بالفرض وہ بھی کسی کو بے مزہ معلوم ہون تو "اسٹوری آف دی نیشن سیریز" کا ایک سلسلۂ تاریخ

مرتب ہو گیا ہے جس میں کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ میں پورا پورا وہی لطف پیدا کر دیا جائے جو ناولوں میں ہوتا ہے۔ بخلاف اسکے ہمارے اُردو زبان کے مصنفین تاریخ اگر انشا پردازی کی طرف توجہ کرتے ہیں تو پُرانے مذاق کی عبارت آرائی کے خیال میں اپنے مذاق کے مناسب لفظوں اور فقروں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا کرتے ہیں جن میں لفاظی بہت ہوتی ہے اور مطلب بہت کم۔ بلکہ بعض جگہ بالکل ندارد ہوتا ہے۔ اور اگر انھیں تحقیق و تنقید کی طرف توجہ ہوتی ہے تو واقعات اور مواد تاریخ کا ایک خشک و بے مزہ ذخیرہ محض نقل کی حیثیت سے جمع کر دیتے ہیں جس کی ترتیب ناقص ہوتی ہے اور واقعات کی نتیجہ خیزی کے متعلق نہایت بے سلیقگی ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ جس طرح طبیب ایک نسخہ تجویز کرتے وقت مختلف اجزا کو اس خوبی سے ترکیب دیتا ہے کہ اُن سے ایک نیا۔ موثر۔ اور نفع بخش مزاج پیدا ہو۔ بعینہٖ یہی کام اصل ایک مورخ کا ہونا چاہیے کہ واقعات کو وہ محض جالب روایات کی حیثیت سے جمع کر کے صرف اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں نہ کر دے۔ بلکہ انکی نئی ترکیب سے نیا رنگ اور نیا مزاج پیدا کرے۔ اور اُس کے تازہ منافع و فوائد سے لوگوں کو فائدہ پہونچائے۔ اور اس سے ہمارے تمام مورخ بے بہرہ ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ناولوں کے ذریعہ سے ہم تاریخوں کا جو مذاق ملک میں پیدا کرتے ہیں وہ اِن بزرگوں کی تاریخیں پڑھ کے بالکل تشریف لے جاتا ہے۔

آج کل اُردو پبلک کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ہر طرف سے لوگ تاریخوں کو مانگ رہے ہیں۔ مصنفین کو خطوط لکھ لکھ کے دریافت کرتے ہیں کہ کوئی اچھی تاریخ بتایئے تاکہ ہم مختلف ممالک و اُمم کے حالات معلوم کر سکیں۔ مگر جب انھیں کوئی تاریخ بتائی جاتی ہے تو اُسے پڑھ کے انکی تسلی و تشفی نہیں ہوتی۔ پیاس لگتی ہے مگر بجھتی نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ناول نویسوں نے اپنی خدمت پوری ادا کر دی۔ کیونکہ یہ پیاس انھیں کی لگائی ہوئی ہے۔ مگر افسوس کہ مورخ اپنا فرض منصبی بالکل نہیں ادا کر سکے۔ اس لیے کہ وہ پیاس اُنکے بجھائے نہ بجھ سکی۔

یہ اُمید رکھنا کہ ناولوں کے مذاق پر کوئی اور مذاق غالب آسکے گا ہوس

محال ہے - چنانچہ اسی وجہ سے ناول ہر ملک اور ہر قوم مین دیگر قسم کی کتابون سے زیادہ شایع ہوتے ہین - ہان اگر تاریخ لکھنے والے اپنے فن کو اچھے سلیقے سے ترتیب دے سکین گے اور لوگون کی خواہش کے مطابق تاریخی تصانیف مرتب کر سکین گے تو بیشک یہ ہوسکے گا کہ مورخین کو اپنی کسا د بازاری کی شکایت نہ باقی رہے - اور اُنکی کتابین بھی ہر گروہ اور ہر طبقہ مین دلچسپی کی نظر سے دیکھی جانے لگین - مگر یہ سمجھنا کہ خالی ناولون کے خلاف فتوے دینے اور ناول لکھنے یا پڑھنے والون کو کوس لینے سے کام نکل جائے گا - ایک خیال پست و محال است و جنون -

عربی زبان اور اُسکی نحو و صرف

آج کل دنیا کی مشہور و متداول زبانون مین سے اکثر یا تو خالص آریہ قوم کی زبانین ہین یا آریون کی زبان سے نکلی ہین - مگر دنیا مین روز بروز ثابت ہوتا جاتا ہے کہ آریہ قوم کے عروج سے پہلے ساری مہذب دنیا مین بنی سام کا دور دورہ تھا - اور انھین کی زبان اطراف عالم پر چھائی ہوئی تھی -

اُنکی زبانین سُریانی - کلدانی - عبرانی - اور غالباً قبطی تھین - اور مشرق مین بابل نینوا کا زور و شور ہوا اور مغرب مین فراعنۂ مصر کا - تو یہی سامی زبانین ساری دنیا کی تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیئن اور انھین کے علم و ہنر کے باغ سے آکے یونانیون نے خوشہ چینی کی -

مگر ان سلطنتون اور قوتون کے فنا ہوتے ہی آریہ قوم اور اُس کی زبان کا عروج شروع ہوا - اور بنی سام کی اور زبانین تو سب مٹ گیئن یا مٹنے کے قریب ہین - اور اگر ہین بھی تو گمنام اور بے نشان - فقط ایک عربی زبان باقی ہے جو سب کی وارث ہے اور جس نے آریون کے غالب آنے کے بعد اُنکو مغلوب کیا - اور اُن سب پر اپنا سکہ جما دیا - یہی حضرت سلیمان کے جاہ و جلال اور حضرت یوسف کے حسن و جمال کو یاد دلاتی ہے - اور یہی بابل و اسیریا کے دربارون کی یادگار ہے - یہی ملک سبا اور تبابعۂ یمن کی ترقیون اور عالمگیریون کا افسانہ سُناتی ہے - اور یہی صابئین کے علم و فضل اور کمالات روحانی کی خبر دے رہی ہے - اس بحث سے بھی قطع نظر کیجیے

کہ یہ عبرانی سے نکلی ہے یا عبرانی اِس سے۔ اور اس ذکر کو بھی جانے دیجیے کہ عبرانی زیادہ قدیم ہے یا عربی (جس مین کہ فاضل زمانہ جسٹس مولانا سید کرامت حسین صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد نے بہت کچھ بحث کی ہے) مگر یہی کیا کم ہے کہ جو اثر دنیا اور دنیا کی زبانون پر عربی زبان نے ڈالا اور جیسا بقاے دوام عربی کو حاصل ہو گیا ہے نہ کسی اور سمٹک زبان کو نصیب ہوا تھا اور نہ کسی آرین زبان کو۔

عربی کے مقابلہ کی زبانین صرف سنسکرت۔ یونانی۔ اور لاطینی ہیں جو آرین اسٹاک کی زبانین سمجھی جاتی ہین۔ مگر وہ سب دوسری نوزائیدہ زبانون مین اپنے الفاظ پریشان چھوڑ کے دنیا سے رخصت ہو گئین۔ سنسکرت کے اثر کا حلقہ سرحد چین سے لے کے ایران کی مغربی سرحد تک ہے۔ جس مین بیسیون زبانین ہین۔ اور سب سنسکرت کی بیٹیان ہین۔ کیونکہ وہ ہر صوبہ کے اصلی باشندون کی زبان اور سنسکرت کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہین۔

ایران سے حدود شام تک بابل و نینوا کی قدیم سمٹک زبانون کا حلقہ تھا اور وہان سے آگے بڑھ کے انتہائی حدود مغرب تک یعنی مغربی حصۂ ایشیا اور سارے یورپ مین یونانی اور لاطینی زبانون کا عمل و دخل تھا۔ جہان کے لوگون کی اصلی زبانون پر ان دونون زبانون نے حکومت کر کے نئی زبانین مروج کین۔ جو آج کل یورپ کی ترقی کے ساتھ اوج کمال پر پہونچ رہی ہین۔ ان دونون زبانون نے جو آرین اسٹاک کی زبانین تھین بحیرۂ روم کے جنوبی سواحل پر اُتر کے افریقہ پر بھی اپنا اثر ڈالا جہان کہ فراعنہ کی قدیم قبطی زبان کا اثر پڑا ہوا تھا۔

غرض دنیا کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ مشرق مین سنسکرت اور اُسکی سگی بہن پہلوی زبانین اپنی نو عمر بیٹیان چھوڑ کے مر چکی تھین۔ بابل اور اسیریا کی زبانون کا بھی چراغ گل ہو چکا تھا۔ جنوب مین فراعنہ کی زبان کا نام و نشان بھی نہین باقی رہا تھا۔ مغرب مین یونانی اپنے مصنفون کے ساتھ قبر مین دفن ہو چکی تھی۔ اور لاطینی دین عیسوی کی مقتدائی کا عصا ہاتھ مین لے کے بُڑھاپے اور کمزوری کی گھڑیان پوری کر رہی تھی کہ عربی اپنے وطن کے پہاڑون اور بالو کے ٹیلون سے نکل کے متمدن دنیا مین آئی اور چند روز مین اقوام عالم کے ساتھ السنۂ عالم پر بھی چھا گئی۔

اسلام سے پیشتر عربی زبان جزیرہ نماے عرب کی حدون کے اندر بند تھی۔ اگرچہ جنوبی عرب کی حمیری زبان جو عربی ہی کی ایک شاخ تھی کسی قدر متمدن زبان تھی اور قدیم الایام کے بڑے بڑے کارنامون اور حیرت انگیز ترقیون کی خبر دیتی تھی۔ یہان تک کہ اُسی کی برکت سے ارض حبشہ کی موجودہ زبان پیدا ہوئی ہے مگر شمالی عربی یعنی ارض حجاز کی لغت قریش نے یہان تک دینی و دنیوی عروج حاصل کیا کہ اُسے بھی مغلوب کرکے اپنا بنا لیا۔

نیز اسلام کے طلوع سے پہلے عربی زبان مین بہت سے اختلافات تھے بلکہ یون کہنا چاہیے کہ ہر بڑے قبیلے اور ہر حصۂ عرب کی زبان جداگانہ تھی۔ مگر یہ اختلافات صرف محاورات یا بعض حروف کے مخارج اور طرز ادا مین تھے یعنی یہ نہین کہا جا سکتا تھا کہ کوئی دوسری زبان عرب مین بولی جاتی تھی۔ یا اتنا فرق تھا کہ ایک صوبے کی زبان کو دوسرے صوبہ والے سمجھ نہ سکین۔ اس زبان مین فصاحت بھی تھی بلاغت بھی۔ مگر عالم کی نظر سے چھپی ہوئی۔ اپنی لسانی خوبیون کی قدر کرنے والے وہ خود آپ ہی تھے۔ دوسری قومین ہنوز تیار نہ تھین کہ اُنکی فصاحت اور جادو بیانی کی داد دے سکین۔ اُن دنون اظہار فصاحت کے میدان یا چند میلے اور بازار تھے جہان قبائل عرب تمدنی اغراض سے جمع ہو جاتے تھے۔ یا عرصہ ہاے کارزار تھے جہان وہ اپنی شجاعت و جوانمردی کا نغمہ خود ہی سُناتے اور خود ہی سر دھن لیتے اور اپنی پُر اثر رجز خوانی سے اپنے رگ حمیت کو جوش مین لاتے۔ یا شاہان یمن و حیرہ و تلقاد کے دربار تھے جہان قصیدہ خوانی کرکے وہ کچھ دولت حاصل کر لیتے۔ یا کسی عزیز و قریب کے دوست کی لاش تھی جس پر کھڑے ہو کے مرثیہ خوانی کرتے۔ یہ وہ مقامات تھے جہان اُن کی نظمین سُنی جاتین۔ رہی نثر اُس مین اُنکے کمالات کبھی تو کسی کاہن یا کاہنہ کی گفتگو مین نظر آتے کبھی کسی اخلاقی حکیم کے پند و نصائح مین۔ اور کبھی کسی خطیب کے برجستہ خطبون مین۔

مگر یہ لٹریری خزانہ ابھی تک صرف دماغون اور حافظون مین محفوظ تھا۔ کیونکہ کوئی خط نہین ایجاد ہوا تھا۔ صرف ایک حمیری خط جنوبی عرب مین تھا۔ جس سے تصنیف و تالیف کا کام نہیں لیا گیا۔ اس سے اگر مدد لی جاتی تھی تو صرف

خط و کتابت اور نامہ و پیام ہین۔ قریش مین آنحضرت صلعم کی ولادت سے چند ہی روز پہلے ارض حیرہ یعنی ایران کے سرحدی صوبۂ عرب سے ایک رسم خط حاصل کیا گیا تھا جس کے جاننے والے چند گنتی کے اہل مکہ تھے۔ آپ کی تعلیم نبوت کے ساتھ ہی ساتھ اس خط کو فروغ ہوا جسکے دو ایک نمونے یورپ کے عجائب خانون مین موجود ہین اور اُنکے فوٹو چھاپ مل سکتے ہین۔ اس مین شک نہین کہ موجودہ عربی رسم خط کا نقش اولین وہی تھا۔ مگر اس قدر ناقص اور غیر مکمل کہ نہ نقطہ ہین اور نہ اعراب۔

اب قرآن نازل ہوا۔ اور اُسکے لکھنے اور نیز تعلیم و تلاوت کی لازمی ضرورت سے اِس رسم خط نے خود بخود ترقی کرنا شروع کی۔ ابتدائی فتوحات کے وقت جب عرب۔ ایران۔ شام۔ روم اور مصر وغیرہ کی فتوحات و ملک گیری مین مشغول تھے انکہین ہوا سے اعلاء کلمۃ اللہ کی دُھن کے اور کسی بات کا خیال نہ تھا۔ رجز خوانی او مرثیہ گوئی تو البتہ تھی باقی اور سب طرح کی نظمون کا بازار سرد تھا۔ ہان افسران فوج سے خط و کتابت کرنے کی ضرورت سے ایک خاص قسم کی سادی انشاپردازی ترقی کرنے لگی تھی جس کی فصاحت و بلاغت کا معیار صرف نظم قرآنی کا تتبع تھا۔

فتوحات کے بعد ضرورت ہوئی کہ شرفاے عرب جو مدت دراز تک جہاد مین مصروف رہ کے رٹائر ہوسے تھے اور صحراے عرب کی تلخی و ترشی کی معاشرت سے ناآشنا ہوگئے تھے ایسے مقامات پر آباد کیے جائین جو نہ عرب سے باہر اور دور ہون۔ اور نہ وحشت عرب کے اندر واقع ہون۔ اور جہاد و فوج کشی کی ضرورتین بھی اِس بات کی متقاضی تھین کہ نو مفتوح ممالک کی سرحدون پر عربون کی نوآبادیان قائم کردی جائین تاکہ ضرورت کے اوقات مین بہت جلد اسلامی لشکر مرتب کر لیے جا سکین۔ اور وہ چند ہی منزلون کی مسافت طے کرکے رزمگاہ مین پہونچ جایا کرین۔ خصوصاً جب عرب خاندان بلاد دور و دراز مین جا جا کے آباد ہونے لگے تو اسکی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوئی۔ اسی ضرورت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے مین عراق کی سرحد پر کوفے اور بصرے کی نوآبادیان قائم ہوئین۔ جہان اُن تمام شرفاے عرب نے جو ایران سے لے کے سندھ اور ترکستان تک جوہر سپہ گری دکھا چکے تھے سکونت اختیار کی اور اپنے گھر بنا کے رہنے لگے۔ ایسی ہی عربی بستیان

دمشق اور اسکندریہ کے پاس بھی قائم ہوگئی تھین۔ مگر اطمینان سے بیٹھنے کا جیسا موقع کوفے اور بصرے والون کو ملا کہین کے عربون کو نہین ملا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ مشرق کی طرف کوئی ایسی سلطنت نہین باقی رہی تھی جو اسلامی سلطنت کے مقابل صف آرا ہونے کی جرأت کر سکتی۔ بخلاف اسکے دمشق روم کی مشرقی سلطنت کی سرحد پر تھا۔ جس سے چھ سات سو برس تک اسلامی سلطنتون سے لڑائیان ہوتی رہین اور سکندریہ کے عربون کا رُخ افریقہ کی طرف تھا جہان روز نئے فتنے پیدا ہوتے تھے اور جدھر آبنائے جبرالٹر کا نالہ پھاندکے اُنھون نے گاتھک سلطنت کا خاتمہ کیا اور یورپ کے جنوب و مغربی حصّے مین اپنی سلطنت قائم کرلی۔

عراق یعنی کوفہ و بصرہ کے عربون کی فارغ البالی کا ایک بڑا سبب حضرت علیؓ اور جناب معاویہؓ کی لڑائیان بھی ہوئین۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی مین کوفہ والون نے کبھی پورے جوش اور سچے دل سے آپ کا ساتھ نہین دیا۔ اور آپ کی شہادت کے بعد جب بنی اُمیہ کی سلطنت قائم ہوگئی تو اُنھون نے اُن لوگون کو فطرۃً بیوفا خیال کرکے یا یہ سمجھ کے کہ یہ لوگ ہمارے سچے دوست نہین ہوسکتے ان سے لشکرکشی اور معرکہ آرائی مین بہت کم کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوفہ اور بصرہ والون کو میدان جنگ کے مشغلون سے فراغت ہوتے ہی زبان عرب کے قواعد منضبط کرنے اور لٹریری مشاغل مین مصروف ہوجانے کا پورا موقع مل گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے جو شہر عربیت کے مستند اسکول بنے یہی دونون شہر کوفہ اور بصرہ تھے جن پر مباحث نحوی و صرفی اور فصاحت و بلاغت کے مسائل مین آج تک استناد کیا جاتا ہے۔

سب کے پہلے ابوالاسود دوئلی نے علم نحو کی تدوین کی بنیاد ڈالی جو بصرے مین اقامت گزین تھے۔ ابوالاسود حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کے صحبت یافتہ، آپ کے شاگرد، اور کبار تابعین مین تھے۔ حضرت علیؓ نے اُنکو زبان عرب کے چند قواعد کی تعلیم دی تھی۔ اُن قواعد کو ضروری اور قیمتی خیال کرکے ابوالاسود نے جناب امیر کی خدمت مین عرض کیا کہ "انحُ نحو ما صنعتَ" نحو کے معنی مثل کے ہین۔ مطلب یہ کہ "اجازت ہو تو جیسے قواعد آپ نے بنائے ہین ویسے ہی مین بھی بناؤن"۔ حضرت علیؓ نے اجازت دی اور ابوالاسود نے چند اور قواعد بنائے اور اسی لفظ نحو کی رعایت سے اُس کا نام نحو رکھدیا۔

ابوالاسود ابتداءً اُن قواعد کو لوگون سے چھپاتے اور قیمتی جواہرات کی طرح پوشیدہ رکھا کرتے تھے۔ یہان تک کہ زیاد نے جو ابوالاسود کی زباندانی سے واقف تھا اپنے عہد حکومت عراق مین اُنھین بُلا کے کہا "آپ کچھ ایسی باتین قلمبند کر دیجیے جن سے لوگون کو کتاب اللہ کی تعلیم مین مدد ملے۔ ابوالاسود نے صاف جواب دیا کہ "مجھے معاف رکھیے" اور اپنے گھر چلے آئے۔ لیکن اسکے چندہی روز بعد دو ایسے واقعے پیش آئے کہ اُنھین اپنی ضد چھوڑنی پڑی۔ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ کسی قاری قرآن کو تلاوت کرتے سُنا جو آیۂ کریمہ اِن اللہ بری مِن المشرکین ورسولہٗ" مین "رسولہٗ" کی جگہ "رسولِہٖ" پڑھ گیا۔ آیت کا اصل مطلب تو یہ تھا کہ "خدا و رسول مشرکون سے بری الذمہ ہین"۔ مگر اعراب کی اس غلطی سے یہ مطلب ہو گیا کہ "خدا مشرکون اور اپنے رسول سے بری الذمہ ہے"۔ سنتے ہی ابوالاسود کانپ گئے۔ اور کہا "مین یہ نہین سمجھا تھا کہ لوگون کی یہ حالت ہو گئی ہے"۔ دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ سعد نام ایک فارسی الاصل شخص نومسلم نے ابوالاسود کے کسی سوال کے جواب مین ایک ایسا فقرہ کہا جس مین "اِن" کی خبر کو بجاے پیش کے زیر دے دیا۔ جس پر تمام گرد و پیش کے ہنس پڑے۔ اور ابوالاسود نے کہا "ان غلامون نے دین اسلام اختیار کیا اور ہمارے بھائی بن گئے ہین۔ بہتر ہوگا کہ ہم انھین زبان کی تعلیم دین"۔

اہل زبان و زباندان کا فرق اور زبان اُردو کا معیار

یہ سچ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بعض شعرا اور مدعیان زباندانی نے دوسرے شہرون کے شعرا اور انشاپردازون کے ساتھ اکثر بے رحمی کا سلوک کیا ہے۔ اور ان لوگون کے اس قسم کے دعوے ہم بارہا سُن چکے ہین کہ ہمارے سوا کسی کو زبان آتی ہی نہین۔ اور غیر شہر والون کے کلام کو محض اِس بنا پر الگ ڈال دیتے دیکھا ہے کہ یہ اہل زبان کا کلام نہین۔ اب اُردو ترقی کر رہی ہے اور دہلی و لکھنؤ سے زیادہ شاعر اور ادیب دیگر بلاد و ممالک ہند مین پیدا ہوتے ہین۔ جو بڑی محنتون اور کوششون سے تیار ہوتے ہین۔ ایسے قابل لوگون کی محض بے پروائی سے یہ کہکر تحقیر اور سُبکی کر دینا کہ وہ اہل زبان نہین ہین انتہا درجے کی بے انصافی ہے۔

دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان مین جب وہ دور دور تک پھیلتی ہے بہت سے مختلف لغات (ڈایالکٹ) پیدا ہو جاتے ہین۔ گر کسی زبان کے شعرا اور ادیبون نے اُن مختلف لغات کے ساتھ ایسا سلوک نہین کیا جیسا کہ اُردو کے شعراے اہل زبان کر رہے ہین۔ قرآن پاک کی تدوین کے وقت اگرچہ لغت قریش کو ترجیح دی گئی ہے مگر یہ کبھی کسی کی زبان سے نہین نکلا کہ یمنی۔ عراقی۔ شامی۔ مصری یا تونسی و مراکشی شاعرون کی زبان قابل لحاظ نہین۔

انگریزی مین بھی اگرچہ بہت سے لغات اور "ڈایالکٹ" پیدا ہو گئے ہین۔ اور جزائر برطانیہ والون کو اُس کے اہل زبان ہونے پر بہت کچھ فخر و ناز بھی ہے مگر یہ کبھی نہین دیکھا گیا کہ لندن کے سخت تنقید کرنے والے اخبارون یا وہان کے جادو بیان مضمون نگارون۔ اعلیٰ ادیبون۔ اور نازک خیال شاعرون نے امریکہ اور دیگر مقامات کے مصنفون اور شاعرون کی محض اس بنیاد پر تحقیر کی ہو کہ وہ اہل زبان نہین یا قابل استناد نہین ہین۔

اس نزاع کے دُور کرنے کے لیے پہلے اس بات کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ "اہل زبان" کون لوگ ہین اور "زباندان" کا لفظ کن لوگون کی نسبت استعمال کیا جانا چاہیے۔ لوگون کی جو مادری زبان ہو اُسکے وہ اہل زبان ہین۔ مقامات اور ڈایالکٹ کے بدل جانے سے اُن کے اہل زبان ہونے مین فرق نہین آسکتا۔

ہندوستان کے جن حصون یا لوگون مین عورتون کی زبان اُردو ہو عام اس سے کہ وہ چاہے کیسی ہی بگڑی ہوئی اُردو ہو اُردو کے اہل زبان ہین۔ لہذا اُردو کے اہل زبان لکھنؤ کے حدود میونسپلٹی اور دہلی کی چار دیواری مین بند نہین بلکہ تمام قطاع ہند مین پھیلے ہین۔ اور ہمین ہرگز یہ حق نہین ہین کہ انھین اُن کے اِس حق سے محروم کرین۔

زبان دان کا لفظ بالکل اس سے متغائر ہے۔ کیونکہ بعض حیثیتون سے وہ خاص ہے اور بعض حیثیتون سے عام۔ "زباندان" ہر اُس شخص کو کہین گے جس نے کسی زبان کے لٹریچر اور شعر و سخن کی طرف توجہ کر کے اُس مین بصیرت حاصل کی ہو۔ اور اُس زبان مین علمی حیثیت سے ترقی کی ہو عام اس سے کہ وہ اہل زبان ہو یا نہ ہو۔ لہذا بہت سے

اہل زبان خاص دہلی اور لکھنؤ کے رہنے والے جہلا گو کہ بہت فصیح زبان بولتے ہوں "زبان دان" نہیں ہیں۔ اور بہت سے وہ لوگ جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے مگر اُنھوں نے اُردو زبان میں ترقی کی ہے وہ صحیح معنوں میں "زبان دان" کہے جانے کے مستحق ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ "اہل زبان" اور "زبان دان" کے اِس مفہوم کے طے ہو جانے کے بعد ہمارے نوعمر جھگڑنے والوں کا جھگڑا بہت کچھ طے ہو جائے گا۔

لیکن اس کے مقابل ایک اور بات کا خیال رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ زبان محض ایک نقلی فن ہے۔ اُس کا استناد صرف سماع پر ہوتا ہے عقلی احتجاج سے اسے مطلقاً علاقہ نہیں ہے۔ اور فلسفہ و منطق کے چون وچرا کو عالم لسان میں مطلقاً دخل نہیں۔ کسی لفظ یا محاورہ کی صحت کے لیے سوا اسکے کہ اہلِ زبان یونہیں بولتے ہیں اور اِن معنوں میں استعمال کرتے ہیں کوئی عقلی اور منطقی دلیل ہرگز نہیں قائم کی جا سکتی۔

لہذا ہر نقلی فن کے لیے لازمی ہے کہ کوئی خاص چیز محل استناد قرار دے لیجائے جیسے علوم نقلیۂ دینیہ میں قرآن و حدیث ہیں۔ ورنہ قلمرو سخن میں بربادکن طوائف الملوکی پیدا ہو جانے سے زبان کے غارت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ الفاظ و محاورات کی صحت کے لیے ہم کو معیار کے مقرر کرنے کی لازمی ضرورت ہے۔ اور وہ حیثیت ہمارے خیال میں دہلی و لکھنؤ کی زبان نے حاصل کر لی جس سے انکار کرنا لٹریری بغاوت ہے۔

بہر تقدیر ہمارے نزدیک یہ فیصل شدہ امر ہے کہ اگر دہلی و لکھنؤ والے کسی اُردو بولنے والے گروہ کو اہل زبان ہونے کے حق سے محروم کریں تو ظلم ہے۔ اور اگر کوئی گروہ اِن شہروں کے معیار صحت ہونے سے انکار کرے تو باغی اور زبان کی قلمرو میں امن و امان کا دشمن ہے۔

اُردو اور ہندی

یہ جھگڑا کسی طرح طے ہونے کو نہیں آتا۔ اور اہل ملک کی جو حالت ہو رہی ہے اُسکے دیکھتے امید نہیں کہ کبھی بھی طے ہو۔ اگر زمانہ کا یہی رنگ رہا اور ہندوستان میں

یہی لیل و نہار ہے تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہندوستان میں نہ اُردو ہوگی نہ ہندی بلکہ سب کی مادری زبان انگریزی ہوگی مگر زندگی کی تھوڑی مدت جو باقی ہے اُس میں بھی ملک کے بیوقوف وکلا اُسے چین نہیں لینے دیتے۔ اگر کسی گروہ کا یہ خیال ہو کہ وہ ہندوستان کی اس رفتار کو بدل دیں گے یا برٹش گورنمنٹ کے سوا یہاں اور کوئی حکومت ہوگی وہ بے وقوف اور عقل کا دشمن ہے۔ برٹش سطوت روز بروز بڑھے گی اور اُن تمام کوششوں اور قوتوں کو پامال کر ڈالے گی جو اُسکے خلاف ہیں۔ اور دُنیا کے اُن تمام مقامات میں جہاں جہاں انگریزی حکومت ہے ایک متحد المذاق والاغراض قوم تیار ہوگی جس کی کاروباری اور معاشرتی زبان انگریزی ہوگی۔

اُردو ہو یا ہندوستان کی کوئی اور زبان یہ سب مٹنے والی چیزیں ہیں جو اپنی اپنی عمریں پوری کر کے صرف کتابوں میں رہ جائیں گی اور زبانوں پر فقط انگریزی ہوگی۔ لہذا ضرورت ہے کہ انگریزی کو قوت کے ساتھ اُٹھایا اور شوق سے حاصل کیا جائے۔ اور ان زبانوں کی جتنی عمر باقی ہو اُس میں اُنھیں موقع دیا جائے کہ امن و امان کی زندگی بسر کریں۔ اور ایک دوسرے کے آزار کے درپے نہ ہوں۔ مگر نہیں۔ ہم اپنی بدقسمتی اور بے عقلی سے اُنکی اس چندروزہ زندگی کو بھی بے مزہ کیے دیتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو زبان خودرو طور پر پیدا ہوئی۔ اور خود ہی بغیر کسی کوشش کے سارے ہندوستان پر چھا گئی۔ اور اسکو یہ حیثیت حاصل ہے کہ کسی غیر ملک کا آدمی ہندوستان میں آنے اور ہندوستان کے لوگوں سے ملنے جلنے اور اُن سے گفتگو کرنے کے لیے جس زبان کو سیکھتا ہے وہ اُردو ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اُردو کو مسلمانوں سے کوئی خصوصیت نہیں۔ اس لیے کہ اسکی ترکیب اور اسکی پیدائش میں جتنا دخل عربی یا فارسی کو ہو سکتا ہے اُس سے زیادہ بھاشا اور سنسکرت کو ہے دراصل یہ اُس سوسائٹی کی زبان ہے جو ہندو مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی۔ اور سچ پوچھو تو ہندو مسلمانوں کے سابقہ اتحاد اور باہمی ربط و ضبط کی ایک یادگار ہے۔ مگر ہندوستان کی پھوٹ مشہور ہے۔ وہ اتحاد کا دشمن ہے۔ اور نہیں چاہتا کہ دوستی و اتحاد کی کوئی یادگار بھی باقی رہے۔

مسلمانوں نے حماقت سے روز بروز تسلیم کیا کہ یہ خاص ہماری زبان ہے۔ اور ہندوؤں نے

حماقت سے سمجھ لیا کہ یہ حقیقت میں ہماری زبان نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں گروہوں کی باہمی عداوت و منافرت سے غریب اُردو عجب کشمکش میں پڑ گئی۔ ہندوؤں نے اس مالیخولیا میں مبتلا ہوکے کہ اُردو ہماری زبان نہیں "ہندی زبان" کا ایک نیا لفظ اختیار کیا جو دراصل ایک اسم ہے جس کا کوئی مسمّیٰ نہیں۔ اس جھگڑے سے پہلے ہندی کا لفظ صرف کائیتھی اور ایک خاص قسم کے رسم خط کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جو اکثر جاہل اور ان پڑھ دکانداروں میں مروج تھا۔ ہندی نام کی کوئی زبان ہندوستان میں نہ تھی۔ مگر قومی اور مذہبی سرگرمی کا جوش دکھانے کے لیے ایک "ہندی زبان" بنائی گئی جو کہ فی الاصل موجود نہ تھی۔ اور نہ اسوقت تک ہے۔

لیکن جب ایک نام اختیار کیا گیا تو اُسکے لیے کوئی مفہوم مقرر کرنا ضروری تھا لہٰذا ایک نئی زبان کے پیدا کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اور اسکے لیے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا گیا۔ پڑھے لکھے لوگوں کا دستور ہے کہ جس زبان کے لٹریچر کو حاصل کرتے ہیں اُسکے اکثر الفاظ اپنی گفتگو میں شامل کر لیتے ہیں جیسے کہ فی الحال انگریزی دانوں کی زبانوں پر کثرت سے انگریزی الفاظ ہوا کرتے ہیں۔ چونکہ پیشتر فارسی تعلیم عام تھی اور پڑھنا لکھنا ہندوستان میں فارسی ہی پڑھنے کا نام تھا۔ اس لیے تمام تعلیم یافتہ لوگوں کا قاعدہ تھا کہ اُردو میں روز بروز فارسی اور عربی کے الفاظ زیادہ شامل کرتے جاتے تھے۔ اگرچہ اب فارسی کی تعلیم موقوف ہو جانے سے اُردو میں نئے فارسی الفاظ کے آنے کا سدباب ہو گیا ہے مگر اُردو کے دشمنوں کو اس پر اطمینان نہیں ہوا۔ اور بلا لحاظ اسکے کہ زبانوں پر کون لفظ چڑھے ہوے ہیں اور بڑے بوڑھے بچوں اور عورتوں تک کی زبان پر جاری ہیں۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اُردو میں سے فارسی و عربی کے مانوس الفاظ سب نکال ڈالے جائیں اور ان کی جگہ بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ عام ازیں کہ وہ بولے جاتے ہوں یا نہ بولے جاتے ہوں داخل کر دیے جائیں۔ اس طریقہ سے ایک نئی زبان تصنیف کی گئی اور اُس کا نام "ہندی" قرار دیا گیا۔ جو دراصل نہ کسی ملک کی زبان ہے نہ کسی مذہب کی۔ نہ کسی قوم کی اور نہ کسی گروہ کی۔ مگر زور و شور سے دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ سارے ہندوستان کی زبان یہی ہے۔

دنیا کے تمام ممالک کی طرح ممالک متحدہ میں بھی یہ نظر آئے گا کہ شہر والوں کی زبان

پر جو عموماً فصیح و بلیغ اور لٹریری زبان ہوتی ہے اُن زبانوں کے الفاظ زیادہ ہین جنکی تعلیم کے اثر سے زبان اُردو بنی تھی۔ کیونکہ چندروز پیشتر کیا سنی آج بھی اعلیٰ سوسائٹی کی زبان یہی ہے۔ اسکے مقابل دیہات مین ایک گنواری زبان مروج ہے جس مین الفاظ تو قریب قریب وہی ہین مگر افعال کے اشتقاق کی صورت بدلی ہوئی ہے اور فارسی کے بعض حروف اپنے مخارج سے نہین ادا ہوتے ہین۔ مثلاً "آتے ہین" "کھاتے ہین" "جاتے ہین" "سوتے ہین"۔ اور "آتے تھے" "جاتے تھے" "سوتے تھے" کے مقام پر وہ لوگ "آوت ہین" "کھات ہین" "جات ہین" "سووت ہین" اور "آوت ہتے" "جات ہتے" "سووت ہتے" بولتے ہین۔ اور حرف خ۔ ذ ز۔ ض۔ ظ کو "جیم" "شین" کو "سین" "غ" کو "گاف" "ف" کو "پھے" اور "ق" کو "کاف" کی آوازون سے ادا کرتے ہین۔ بس اُردو اور اُس گنواری زبان مین یہی فرق ہے۔

نئی ہندی کی مصنفون نے اُس گنواری زبان کو بالکل نہین اختیار کیا ہے۔ کیونکہ ناگری خط کے اخبارات اور اُن کی تمام کتابون مین جو زبان استعمال کی جاتی ہے اُس مین نہ یہ دیہاتی افعال کے اوزان اختیار کیے گئے ہین اور نہ مذکورۂ بالا حروف کے مخارج کا التیاز دُور کیا گیا ہے۔ کیونکہ ناگری کا حرف "جا" نیچے ایک نقطہ دے کے ز۔ اور "پھا" نقطہ دے کے ف بنا دیے گئے ہین۔ لہذا اس مین ذرا بھی شک و شبہہ نہین کہ جس زبان کو فی الحال ہندی کہا جاتا ہے وہ یہان کی دیہاتی زبان نہین ہے۔ بلکہ ایک تصنیف زبان ہے جو صرف لڑنے اور دعویٰ کرنے کے لیے ہے۔ کوئی ایسی زبان نہین جو کہین بولی بھی جاتی ہو۔

مگر فی الحال مردم شماری کے موقع پر ایک بڑی بھاری غلط فہمی یہ پیدا کرائی جا رہی ہے کہ دیہات کی گنواری زبان کو ہندی بتایا جاتا ہے۔ اور شہر کی فصیح زبان کو اُردو۔ اور اسکے ذریعہ سے اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملک مین زیادہ تعداد ہندی بولنے والون کی ہے۔ کیا دنیا مین کوئی اور زبان بھی ہے جس مین گنوارون اور دیہات کی خراب زبان بولنے والون سے فصیح زبان بولنے والے پڑھے لکھون کی تعداد زیادہ ہو؟ اگر یہی اصول ہے تو انگریزی، فارسی، عربی اور مین کہتا ہون کہ دنیا کی ساری زبانون کا لٹریچر دریابُرد کر دینے کے قابل ہے۔ کیونکہ وہ چند خاص پڑھے لکھے فصحا

شہر کی زبان ہے جن کی تعداد غلط اور گنواری زبان والون کے مقابل مین بہت ہی کم ہے۔ دیہات کی زبان اُردو کے سوا ہرگز کوئی اور زبان نہین ہے۔ گرہان ہر ملک اور ہر قوم کے دیہاتیون کی طرح وہ ایک خراب اور غیر فصیح زبان یا یون کہیے کہ بگڑی ہوئی اُردو ہے۔ چونکہ آج کل باہمی اختلافات اور تعصب نے لوگون کو سچائی اور حقیقت سے ہٹا دیا ہے لہذا یورپین حکام سے جو زبان کے مسئلے کو بخوبی نہین سمجھ سکتے" سمجھا بجھا کے ایسے احکام بھی جاری کرا دیے گئے ہین کہ دیہاتی زبان کو ہندی لکھا جائے۔ اور اُنھون نے بغیر اسکا اندازہ کیے کہ جس زبان کو ہندی کہا جاتا ہے اور جو ناگری کے اخبارون اور رسالون اور تحریرون مین برتی جاتی ہے وہ بھی دیہاتی زبان ہے یا نہین ایسے احکام بھی جاری کردیے ہین لیکن ایسے غلط احکام کے جاری ہونے کے بعد مردم شماری کی رپورٹ کا ہرگز اعتبار باقی نہ رہیگا۔ اور ہرگز اس مردم شماری سے اس کا سچا اندازہ نہ ہو سکے گا کہ ملک مین کتنے اُردو اور کتنے ہندی بولنے والے ہین۔

یہی مسئلہ آج کل سررشتۂ تعلیم مین بھی چھڑا ہوا ہے۔ اور چونکہ اُسکے ارکان مین زیادہ تعداد اُن ہندوؤن کی ہے جو ہندی زبان کے حامی ہین۔ لہذا مشکل سے امید کی جا سکتی ہے کہ کوئی صحیح فیصلہ ہو سکے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اِس جانب فوراً توجہ کرین۔ ورنہ اگر اُردو زبان کے خلاف کوئی فیصلہ ہو گیا تو اُردو کی ترقی کے لیے گورنمنٹ اور اہل علم گذشتہ دو تین سو سال مین جو کچھ کوششین کی ہین سب بیکار ہو جائین گی۔ مسلم لیگ کو اس موقع پر اُٹھ کے یورپین حکام کی غلط فہمیون کو دور کرنا چاہیے۔ اور چونکہ مسلم لیگ زبان اُردو کی ترقی کو منجملہ اپنے فرائض کے تسلیم کر چکی ہے لہذا اُسے اس موقع پہ غفلت نہ کرنی چاہیے۔ اور اگر اُس نے کچھ نہ کیا تو پھر مسلمانون کو آیندہ مسلم لیگ سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔

خوشی کی بات ہے کہ "مسلم کانفرنس بداؤن" نے اس جانب بڑی مستعدی سے توجہ شروع کی ہے۔ مسلمانون اور عموماً تمام اُردو کے حامیون کو کانفرنس مذکور کا پورا ساتھ دینا چاہیے۔ خاصتہً اُسے روپیے سے فوری مدد دینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اس کام مین ویسی ہی کوشش کر سکے جیسی کہ ایک ایسے اہم کام کے لیے ضروری ہے۔ مین ایک بار پھر یاد دلاتا ہون کہ یہ موقع مسلمانون کے غافل بیٹھنے کا نہین ہے۔ بہتر ہو کہ حامی قوم مسلمان

آنریری سکرٹری صاحب اُردو کانفرنس سے مراسلت کرکے "رسالۂ اُردو ہندی نمبرا" منگوا کے دیکھیں اور امکانی اعانت و کوشش میں دریغ نہ فرمائیں۔

مصحف عثمانی

قرآن مجید کی نسبت لوگوں میں عموماً مشہور ہے کہ اسے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع فرمایا ہے۔ اس معاملہ کے متعلق علما اور مورخین میں بہت کچھ اختلافات پڑے ہوئے ہیں۔ خصوصاً شیعہ و سُنی کے شرمناک جھگڑوں نے اسے اور زیادہ اُبھارا اور یہاں تک نوبت پہونچی کہ دشمنان اسلام علی الخصوص عیسائیوں کو قرآن پاک کی تحریف کے متعلق کچھ کہنے اور جھگڑنے کا موقع مل گیا۔

اس واقعہ کی اصلیت اسی قدر ہے کہ عرب کے مختلف حصوں اور صوبوں میں مختلف لغات بولے جاتے تھے۔ یعنی زبان ایک ہی تھی مگر لہجے میں اور بعض حرفوں کے مخارج اور تلفظ میں فرق تھا۔ جس سے یہ خطرناک نتیجہ ظاہر ہوا کہ اُن صوبجات عرب میں لوگوں نے اپنے تلفظ ہی کے مطابق قرآن کو لکھنا بھی شروع کر دیا۔ اس کی مثال آج کل کے اعتبار سے یوں سمجھیے کہ اکثر مقامات کے عرب حرف "ق" کا تلفظ گاف اور حرف "ث" کا "ت" کرتے ہیں۔ اب یہی لوگ اپنے لہجے اور تلفظ کے مطابق "ق" کی جگہ گاف اور "ث" کی جگہ "ت" لکھنے بھی لگیں گے تو خواہ مخواہ زبان کے بگڑ جانے اور قرآن میں اختلافات پڑ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ اسی اندیشے سے محفوظ رکھنے کے لیے حضرت عثمان رضی نے یہ کارروائی کی کہ صحابہ میں سے جو جو بزرگ قرأتِ قرآن میں کمال رکھتے تھے اور جن کی قرأت پر بھروسا تھا اُن کو جمع کر کے خاص قریش کے لہجے اور تلفظ کے مطابق املا کو مدون کر دیا۔ تاکہ پھر کوئی جھگڑا نہ باقی رہے۔ یا اس واقعہ کو آج کل کی زبان میں زیادہ صحیح طور پر یوں کہا جائے کہ حضرت ذی النورین نے قرآن مجید کا ایک مستند ایڈیشن دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور عربوں کے اختلافات لغت سے الفاظ کے بگڑنے یا بدل جانے کے جو اندیشے تھے مٹا دیے۔ اسی اعتبار سے حضرت عثمان رضی جامع قرآن کہے جاتے ہیں ورنہ قرآن کی ترتیب و تہذیب تکمیل دین ہی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ سورتوں میں آیات کی ترتیب۔ اور سورتوں کی باہمی ترتیب سب حضرت رسالت کے سامنے کی باتیں ہیں۔ ان کو ترتیب عثمانی سے کوئی علاقہ نہیں۔ اور

نہ کسی کو ایسی جرأت ہو سکتی تھی کہ آنحضرتؐ کی ترتیب میں کسی قسم کا دخل دے

تتبع روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اپنے اس مستند ایڈیشن کے پانچ نسخے تیار کرائے تھے جن میں سے ایک مکہ معظمہ میں بھیج دیا۔ ایک بصرہ میں بھیجا۔ ایک کوفے روانہ کیا ایک شام (دمشق) میں۔ اور ایک اپنے پاس مدینۂ طیبہ میں رکھا۔

علامہ ابو القاسم تجیبی سبطی (جو اسی شہر سبطہ کے رہنے والے تھے جسکا بین ہم اپنے ناول فتح اندلس میں دکھا چکے ہیں اور جہاں کے حاکم جولین سے مل کے مسلمانوں نے اسپین کے فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا) بیان کرتے ہیں کہ "شام والا قرآن (مصحف عثمانی) دمشق کی جامع بنی اُمیہ میں اُس کی محراب کے اندر رکھا ہوا ہے۔ جس کی میں نے ۶۵۷ھ میں خود اپنی آنکھوں سے زیارت کی۔ اور مکہ معظمہ والے قرآن کو میں نے قبۂ یہودیہ (ہم نہیں بتا سکتے کہ یہ قبہ کون اور کہاں تھا) میں دیکھا تھا"۔ اُن کے ایک صدی بعد ایک اور مصنف جن کا نام عبد الملک ہے فرماتے ہیں کہ "میں نے اُن دونوں قرآنوں کی اور نیز مدینہ والے مصحف عثمانی کی ۷۳۵ھ میں زیارت کی تھی"۔

ان میں سے ایک مصحف خدا جانے کیونکر ارض اندلس میں پہونچ گیا جو وہاں قرطبہ کی جامع مسجد میں ایک مدت تک ادب و تعظیم سے رکھا رہا۔ لوگ ذوق و شوق سے اسکی زیارت کرتے اور اُس سے فیض و برکت حاصل کرتے رہے۔ علامہ عبد الملک جنھوں نے ۷۳۵ھ میں مکہ اور مدینہ والے قرآنوں کو دیکھا تھا، فرماتے ہیں کہ "اندلس والے اور مدینہ والے قرآن کا خط ایک ہی تھا"۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

بعض عوام یہ تصور کرتے ہیں کہ ان قرآنوں کو حضرت عثمانؓ نے خاص اپنے دست مبارک سے لکھا تھا۔ مگر اسکی کوئی اصلیت نہیں۔ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی قرآن نہ تھا۔ لیکن جس ہاتھ سے وہ لکھے گئے ہوں گے وہ یقیناً برکت کا ہاتھ تھا۔ کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ معززین صحابہ میں سے کسی بزرگ کے ہاتھ سے لکھے گئے ہوں گے۔ جن علما نے ان مصاحف عثمانی کی زیارت کی تھی وہی اپنے معائنہ اور مشاہدہ سے بیان کرتے ہیں کہ مدینہ والے قرآن کی پشت پر یہ عبارت لکھی تھی "یہ وہ (قرآن) ہے جس پر اصحاب رسول اللہ صلعم کی ایک جماعت نے اتفاق کیا۔ منجملہ اُنکے زید بن ثابت۔ عبد اللہ بن زبیر اور سعید بن عاصی

ہین۔" اور اسی سلسلے مین اُن تمام صحابہ کے اسماے گرامی لکھے ہوے ہین جنھین حضرت عثمانؓ نے اس اہم کام کے لیے جمع فرمایا تھا۔

اہل اندلس کا اپنے قرآن کی نسبت یہ خیال بھی تھا کہ یہی وہ قرآن ہے جس پر شہید ہوتے وقت حضرت عثمانؓ کا خون گرا تھا۔ مگر اسکو علامہ مقری اپنی کتاب "نفح الطیب" مین (جس سے اخذ کر کے ہم یہ واقعات ناظرین ولگداز کے سامنے پیش کر رہے ہین) بعید از قیاس بتاتے ہیں اور فرماتے ہین کہ وہ ہوگا بھی تو شام والا قرآن ہوگا۔

لیکن ہمارے نزدیک اگر اُس قرآن مین خون کے دھبے موجود ہون تو اندلس والون ہی کا خیال ٹھیک ہے۔ کیونکہ شام کا قرآن جس کی ۵۵۷ھ مین ابوالقاسم تجیبی نے زیارت کی تھی وہ ہوگا جسے حضرت عثمانؓ نے اپنی زندگی ہی مین ارسال فرمایا تھا اور جس پر آپ کا خون گرا وہ آپ کے کُرتے اور آپ کی بی بی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیون کے ساتھ دمشق مین آپ کے بعد بھیجا گیا ہوگا۔ اور غالباً وہ آپ کا خاص قرآن ہوگا جس مین آپ خود تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ اور اہل مدینہ کی عام نفع رسانی کے لیے ایک دوسرا نسخہ ہوگا جو آپ کے بعد صدیون تک وہان موجود رہا۔ تاہم ہمین ابھی تک اسکا پتہ نہین چلا کہ اندلس مین وہ قرآن کس زمانے مین اور کیونکر پہونچا۔

لیکن اس مین شک نہین کہ اہل اندلس اُسکی نہایت ہی قدر و منزلت اور تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ یہان تک کہ اندلس کی سلطنت مین کمزوری پیدا ہوئی اور مراکش مین سلاطین موحدین کا دَور شروع ہوا جنھون نے سارے اسپین کو مغلوب و مقہور کر دیا تھا۔

اس خاندان کے بانی اور پہلے تاجدار ابو محمد عبدالمومن بن علی کو اس مستند اور متبرک نسخۂ قرآن کے اپنے دار السلطنت مراکش مین لے جانے کا بیحد شوق تھا۔ اُسی کے وزیر عبدالمومن ابوبکر محمد بن عبدالملک بن طفیل کا بیان ہے کہ "اس قرآن کے اصلی صحیفۂ عثمانی ہونے مین کسی کو شک نہ تھا"۔ چنانچہ خلفاے اندلس اور سلاطین اسپین نسلاً بعد نسلٍ اُسکی حفاظت کرتے آئے تھے۔ بادشاہ عبدالمومن کو بڑی آرزو تھی کہ اُسے قرطبہ سے منتقل کر کے مراکش مین لے آئے۔ مگر محض اس خیال سے اس کی جرأت نہ کرتا تھا کہ مسلمانان قرطبہ کو اس کا بڑا ملال ہوگا۔ اور اُن کی دلشکنی کرنا اچھا نہین۔ مگر خدا نے خود ہی یہ بات قرطبہ والون کے دل مین ڈال دی اور وہ آپ ہی آمادہ ہو گئے کہ اُس دولت گران بہا کو عبدالمومن

کے حوالے کرکے حق کو حقدار کے پاس پہونچا دین۔ چنانچہ قرطبہ کے دو رئیس زادے ابو سعید اور ابو سعید سنہ ۵۵۶ھ مین اُس قرآن مجید کو لے کے مراکش مین آئے جس کا استقبال نہایت بڑی دھوم دھام اور بڑے تزک و احتشام سے کیا گیا۔ بادشاہ عبد المومن کو اس نعمت عظمے کے ملنے کی بڑی خوشی ہوئی اور اُس نے اس مصحف کی حفاظت اور اُسکی زیارت کے لیے جو انتظام کیا حیرت انگیز ہے۔ چنانچہ اس کا مفصل حال ہم اسی مضمون مین آگے چل کے بیان کرین گے۔

عبد المومن کے عہد سے اِس ودیعت ربانی کے حامل سلاطین موحدین ہوے جو علی العموم اُس کی بے انتہا قدر کرتے تھے۔ اور حصول برکت کے لیے سفرون اور لڑائیون مین اُسے اپنے ساتھ لیجایا کرتے تھے۔ انھین مین سے بادشاہ منصور نے اِس قرآن مجید کی جلد پر سونے کے حرفون مین چار شعر لکھوا دیے تھے جن مین سے آخری شعر یہ تھا۔

والبستہ الیاقوت والدر حلیۃ — وغیرک قد رواہ من دم صاحبہ

(تو نے تو اِسے یاقوت اور موتیون کا زیور پہنایا۔ اور دوسرون نے اِسے خود اُن بزرگ (حضرت عثمان رض) کے خون سے سیراب کیا جن کا یہ تھا)

انھین موحدین مین سے معتضد یعنی سعید علی بن مامون سنہ ۶۴۵ھ مین جب تلمسان کے سفر پر روانہ ہوا تو عادت کے موافق اِس قرآن مجید کو اپنے ہمراہ لیتا گیا تھا۔ تلمسان کے قریب وہ اور اُس کا بیٹا ابراہیم دونون لڑائی مین مارے گئے اور بدوی عربون اور دیگر افریقی قبائل نے جہان شاہی لشکرگاہ کی اور سب چیزین لوٹین اِس مصحف عثمانی کو بھی لیگئے۔

اب چند روز تک یہ قرآن مجید گمنامی مین رہا۔ مگر بعض کہتے ہین کہ "نہین۔ شاہان تلمسان کے خزانہ مین تھا۔" یہان تک کہ آخر ماہ رمضان سنہ ۷۳۷ھ مین بادشاہ ابو الحسن نے جو بنی مرینیا مین سے تھا تلمسان کو فتح کرکے یہ مصحف عثمانی اپنے قبضے مین کیا۔

اب بادشاہ ابو الحسن نے اسے ذریعۂ برکت قرار دیا۔ اور یہود کے تابوت سکینہ کی طرح لڑائیون اور جہاد کے سفرون مین اُسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اُس نے اتفاقاً پرتگال کے شہرون پر یورش کی جس مین وہ دشمنون کے نرغہ مین پڑکے مارا گیا۔ اور یہ قرآن اُسکے دشمنون کے ہاتھ لگا۔ اب کسی تاجر نے حسن تدبیر سے اُسکو اُن لوگون سے حاصل کیا۔ اور سنہ ۷۴۵ھ مین پھر مراکش مین لاکے شہر فاس کے خزانے مین رکھ دیا۔

بس اِس کے بعد ہم نہین جانتے کہ وہ قرآن کہان ہے۔ آیا وہ محترم نسخہ آج بھی

شہر فاس مین ہے یا نہین - فی الحال ایک قرآن مجید اور وہی خاص جس پر حضرت عثمان کا خون گرا تھا قسطنطنیہ مین دولت عثمانیہ کے قبضے مین بتایا جاتا ہے، ممکن ہے کہ یہ وہی قرآن ہو اور کسی ذریعہ سے سلاطین آل عثمان کے قبضے مین آ گیا ہو۔

لیکن ہمین ابھی اتنا بتانا باقی ہے کہ پہلے فرمانروا ے موحدین عبدالمومن بن علی نے اس کی قدردانی و حفاظت کے لیے کیا انتظامات کیے تھے۔ اُسے اس قرآن کے ملتے ہی اِس بات کی فکر ہوئی کہ جیسا یہ معجز نما کلام ہے ویسی ہی اسکی رحل اور اسکے رکھنے کا تابوت (صندوق) بھی ہو۔ جن سے ایک طلسم اور معجز نمائی کی شان نمایان ہوتی ہو۔

چنانچہ اِس غرض کے لیے اُس نے اپنے دار السلطنت مراکش (جو اُن دنون ایک بڑا ترقی یافتہ اور متمدن شہر تھا) کے اور نیز اپنی قلمرو کے بلاد دور دراز کے بڑے بڑے ہنرمندون۔ نقاشون۔ معمارون۔ نجارون۔ سادہ کارون نگینہ جڑنے والون اور صحافون غرض ہر قسم کے کاریگرون کو بُلا کے شہر مراکش مین جمع کیا۔ اور اُن کو حکم دیا کہ تم سب مل کے باہمی مشورے سے اس قرآن کی جلد بناؤ۔ اُس مین جواہرات جڑو۔ اور اُسکے لیے اعلیٰ درجے کا ایک جزدان بناؤ۔ اور یہ سب چیزین ایسی ہون جو اعجوبۂ روزگار ہون۔ پھر اُس کے لیے ایک کرسی اور ایک رحل اور ایک ایسا تابوت تیار کرو جس مین اپنی ساری صناعی صرف کر دو۔ اور ایسا کمال دکھاؤ کہ یہ سب چیزین ایک طلسم معلوم ہون اور اُن سے ایسے عجائبات ظاہر ہون جن کے اسباب نظر سے پوشیدہ رہین۔

یہ ایک دینی کام تھا جس مین اجر و ثواب آخرت کے علاوہ بادشاہ کی خوشنودی بھی متصور تھی۔ کاریگرون نے جانین لڑا دین۔ پہلے تو اُس کلام اللہ کے لیے سونے چاندی کی ایک مرصع کار جلد اس وضع کی بنائی گئی کہ اُس مین زیادہ ترکیبی کی شان تھی۔ اندر باہر عجیب و غریب صنعتین رکھی گئی تھین۔ اور ہر جگہ ایسے نقش و نگار تھے جن مین ہر مقام پر ایک نئی صنعت نظر آتی تھی۔ اُس پر رومی شیشے کی ایسی میناکاری کی گئی تھی کہ اُس سے پہلے کبھی لوگون

نظر سے نہین گزری تھی اس جلد مین حیرت انگیز طریقے سے ہر مقام پر جوڑ تھے جو بند ہوتے وقت خوب بھڑ کے بیٹھ جاتے اور کھلتے وقت جدا ہو جاتے - اور ایسی خوش اسلوبی اور عمدہ ترتیب سے اُس جلد پر ہیرے - یاقوت - زمرد اور موتی جڑے گئے تھے کہ اُسکی آب و تاب پر نظر نہ جم سکتی - پھر اُسکے لیے سُندس و حریر کا ایک نہایت ہی پُر تکلف جزدان تیار کیا گیا - اور اس مین بھی بہت ہی بیش بہا جواہرات کثرت سے ٹانکے گئے -

اسکے بعد اُس قرآن مجید کے واسطے ایک آبنوس کی مرصع کار رحل بنائی گئی - اور اُس مین بھی اعلیٰ درجے کے نقش و نگار بنا کے جابجا جواہرات جڑے گئے - اس رحل کی وضع بھی نہایت خوشنما اور عجیب تھی - پھر ایک نہایت نازک خوبصورت اور پُر تکلف کرسی بنائی گئی تاکہ اُس کرسی پر رحل اور قرآن پاک رکھا جائے - پھر ایک بڑا سا تابوت (صندوق) بنایا گیا تاکہ اُسکے اندر وہ کرسی اور رحل اور قرآن حفاظت کے ساتھ رکھے رہین - اور جب کہین لیجانا ہو تو اُس پورے تابوت کو اُٹھا کے لیجایا کرین - یہ تابوت شش پہل تھا - بہت بلند تھا اور نہایت خوشنما - اور اُسپر چارون طرف ایسے نقش و نگار بنائے گئے تھے کہ جو دیکھتا عش عش کر جاتا -

مگر سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس خیال سے کہ بغیر ہاتھ لگائے قرآن کی زیارت ہو جایا کرے اور حضرت جل وعلا کے اس ارشاد کی کہ "لا یمسہٗ الا المطہرون" کی پوری تصدیق ہوتی رہے - اس تابوت - کرسی - اور رحل مین کچھ ایسی کلین لگائی گئی تھین اور اُنکی تکمیل مین ایسا کمال انجینیری صرف کیا گیا تھا کہ اُنھین دیکھ کے عقل دنگ رہ جاتی - اور قرآن مجید کی زیارت مین ایک معجز نمائی کا حیرت انگیز کرشمہ لوگون کو نظر آجاتا - جب کسی کو اُسکی زیارت کا شوق ہوتا تو اُس شش پہل تابوت کے ایک پہلو پر جو دو پٹ لگے ہوے تھے اُنکے نیچے ایک سوراخ مین ایک نازک سی خوبصورت کُنجی ڈال کے پھرائی جاتی - کُنجی کے پھرتے ہی آپ سے آپ دونون پٹ یکایک کُھل کے اندر کی طرف مُڑ جاتے - وہ کرسی جس پر رحل تھی خود بخود تابوت سے باہر دوڑ آتی - اور

رحل مع قرآن بھی خود بخود حرکت کرکے اور اُس کرسی پر کھسک کے انتہائی سرے پر آ جاتی - اور یہ سب حرکتین ایک ہی ساتھ صرف کنجی کے پھرا لینے سے بغیر اسکے کہ کوئی ہاتھ لگائے ہوتین - اور قرآن مجید زیارت کرنے والون کے قریب آجاتا - پھر بعد زیارت جب اُسے احتیاط سے رکھ دینا منظور ہوتا تو کنجی اُسی سوراخ مین ڈال کے دوسری طرف پھرائی جاتی اور ساتھ ہی کرسی و رحل مع قرآن کے آپ سے آپ اندر ہو کے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو جاتے اور خود ہی تابوت کے پٹ بھی بند ہو کے مقفل ہو جاتے -

مسلمانون اور خصوصاً آج کل کے تعلیم یافتہ لوگون کو اُس زمانہ مین اور وہ بھی مراکو مین ایک ایسی صنعت کے پائے جانے کا مشکل سے یقین آئے گا - مگر یہ کُل باتین کتاب نفح الطیب کی جلد اول مین بوضاحت درج ہین جو کہ آج کل کی تصنیف نہین - اور کوئی وجہ نہین کہ اُسکے بیان کو جو مستند مورخین کے حوالہ سے ہے بے اصل تصور کیا جائے -

مگر ہان خود ہماری حالت ایسی ہو رہی ہے کہ ایسے کمالات کا اب ہمارے اگلے باکمال بزرگون کی جانب منسوب کیا جانا بھی اورون کو نہین خود ہمارے ہم قومون کو قابل حیرت نظر آتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ ہمارے بزرگ ایسے نہ تھے جیسے کہ ہم ہین -

اردو لٹریچر اور محکمۂ قوانین

اُردو زبان خوش اقبالی مین بھی بدنصیب ہے، اُس کی تاریخ بتا رہی ہے کہ اُسکو جب کبھی ضرر پہونچا ہے تو اپنون اور اپنے مربیون سے پہونچا ہے -

ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دست خویشتن فریاد

جن ہندو اور مسلمانون کے امتزاج و اتحاد - میل جول و باہمی ربط و ضبط سے وہ پیدا ہوئی اُنھین نے ابتدائی سواایک گھریلو زبان سمجھنے کے اُسے ہمیشہ علمی دربار سے محروم رکھا - اور اب بھی دیکھ لیجیے کہ وہی لوگ جو اسکو بولتے، اسے برتتے، اس مین مراسلت، نامہ و پیام اور تصنیف و تالیف کرتے

اور اس مین اخبار نکالتے ہین وہی اسکے دشمن ہین۔ اور جب پوچھو تو یہی کہتے ہین کہ ہمین اُردو سے کوئی تعلق نہین اور نہ یہ ہماری زبان ہے۔ سرکار برطانیہ جس نے اُسے علمی دربار مین پہونچایا سرکاری زبان بنایا۔ سلطنت کے قوانین اُس مین مدوّن کرائے۔ شہرون اور گانوٗن مین اسکی تعلیم کے مدرسے جاری کیے۔ اُسی کے بعض افسر اُردو کے خلاف ہین اور اُس کی ترقیون کو اچھی نگاہ سے نہین دیکھتے۔ اور اگر اس پر عنایت بھی کرتے ہین تو بدنصیبی سے وہی عنایت جو موجب مضرت بنجاتی ہے۔

سررشتۂ تعلیم مین چونکہ ہندو عنصر غالب ہے اس لیے اگر اور کچھ نہین بن پڑتا تو اسی بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ نصاب تعلیم کی کتابون کی زبان ہی بگاڑ کے غارت اور گنوارون کی زبان سے بھی بدتر کردی جائے۔ مگر اسکے علاوہ ایک اور حیثیت سے بھی اُردو بگاڑی جا رہی ہے۔ جو اس سے بھی زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اور وہ حیثیت سررشتۂ ترجمۂ قوانین کی ہے۔

اُردو زبان کو ہندوستان کی دوسری زبانون پر مختلف حیثیتون سے ترجیح حاصل ہے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ دیگر اقوام و السنہ سے جس قدر علم و فن ہندوستان کی لٹرری دنیا مین آتا ہے وہ زیادہ تر اُردو ہی مین ہوتا ہے۔ ہندوستان جسے بجاے خود ایک براعظم کہنا چاہیے اُسکی تقریباً نصف آبادی اُردو بولتی اور سمجھتی ہے۔ جس کی وجہ سے دوسری زبانون سے جتنی کتابین یا چیزین ترجمہ ہوتی ہین اکثر اُردو ہی مین ہوتی ہین۔ اِن ترجمون کا سلسلہ ایک مدتِ دراز سے اُردو مین جاری ہے جن کی بدولت اُردو مین اتنا وسیع اور غیر محدود لٹریچر پیدا ہوگیا ہے کہ اُسے تکمیل کے ساتھ جمع کرلینا کسی بڑی لائبریری کے بھی امکان مین نہین ہے۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ اور تلنگی زبانون مین بھی ترجمہ ہوے ہین۔ مگر اُردو کے مقابل بہت کم۔ اور اتنے ہین کہ اُنکی مجموعی تعداد اُردو ترجمون کے عُشرِ عَشیر کو بھی نہین پہونچ سکتی۔ اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ جہان تک خاص اُردو کی قلمرو ہے اُس مین اُن زبانون کو کوئی جانتا بھی نہین اور اُنکے خاص رقبے مین اُردو پوری طرح حکومت کر رہی ہے۔ بنگالی۔ گجراتی۔

مرہٹی اور تلنگی زبانون کے لٹریچر کو عظیم آباد سے پشاور تک کوئی جانتا بھی نہین مگر اُردو لٹریچر کی اشاعت جیسی لکھنؤ اور دہلی مین ہے اُسکے قریب ہی قریب کلکتہ۔ بمبئی۔ پونا۔ اور مدراس مین بھی ہو رہی ہے۔ اور اسی وجہ سے اُن زبانون کا دائرہ بہت ہی محدود ہے اور اُن مین ویسی علمی وسعت ہرگز نہین جیسی کہ اُردو مین ہے۔

دنیا کی تمام زبانون کو سب سے زیادہ علمی فائدہ ترجمون ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوا کیا ہے۔ کیونکہ ترجمہ کی معرفت جب نئے مضامین اور نئے خیالات کسی زبان مین آتے ہین تو اپنے لیے نئے الفاظ محاورات اور مصطلحات بھی پیدا کرلیا کرتے ہین جن سے زبان کو روز بروز وسعت حاصل ہوتی جاتی ہے۔ ہندوستان مین مختلف زبان بولنے والی قومین اور مختلف مذاق و اعتقادات و خیالات کے لوگ موجود ہین جن کی وجہ سے یہان کوئی ایک قومی اور ملکی اکاڈیمی نہین قائم ہوسکتی جیسی کہ فرانس مین نظر آتی ہے۔ جہان ایک ہی زبان بولنے والون اور ایک ہی مذاق رکھنے والون کی متحدہ کوششین فرنچ اکاڈیمی کے ذریعہ سے فرانسیسی لٹریچر کو یوماً فیوماً ترقی دلاتی رہتی ہین۔

یہان سچ پوچھیے تو ایسی کسی اکاڈیمی کا قائم مقام صحیح معنون مین گورنمنٹ کا محکمہ ترجمہ قوانین ہے۔ جس کے ذریعہ سے تمام قانون کے ترجمے برابر اُردو مین شایع ہوتے رہتے ہین۔ اور جو اپنی اشاعت کے ساتھ اُردو مین بہت سے نئے الفاظ نئے محاورے اور نئے مصطلحات پیدا کردیتے ہین اور وہ شایع ہوتے ہی ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر جاری ہو جاتے ہین۔ چونکہ یہ کتابین گورنمنٹ کے ایما اور حکم سے اس محکمہ کے ذریعہ سے شایع ہوتی ہین۔ ان کو اشاعت کے ساتھ ہی جیسی مقبولیت اور تعمیم حاصل ہو جاتی ہے ویسی نہ کسی شاعر کے کلام کو نصیب ہوسکتی ہے اور نہ کسی ادیب کی عبارت کو۔ وہ ترجمے فوراً مستند تسلیم کرلیے جاتے ہین۔ عدالتون اور تمام طبقون مین پڑھنا شروع ہو جاتے ہین۔ فوراً اُن سے استناد کیا جانے لگتا ہے۔ اور اُن کا ہر ہر لفظ چاہے بُرا ہو یا بھلا با محاورہ ہو یا بے محاورہ ایک ناخواندہ مہمان کی طرح زبان مین

زبردستی گھس پڑتا ہے۔

جہان تک مجھے تجربہ ہوا ہے ان قوانین کے ترجمون مین کثرت سے خلافِ محاورہ ترجمون کو مجبوراً قبول کر لیتے ہین۔ اور اُن پر حرف رکھنے کی جرأت نہین کرتے۔ جس کی وجہ سے ہمین یہ کہنے کا موقع حاصل ہے کہ خود گورنمنٹ کی مہربانی سے زبان بجاے سُدھرنے کے بگڑ رہی ہے۔ اور جس اکاڈیمی سے ہمین فائدہ پہونچنا چاہیے تھا اُس سے ہم ضرر اُٹھا رہے ہین

لوگ ان ترجمون کو عموماً قبول کر لیا کرتے ہین۔ اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اُنھون نے ترجمون کو صحیح و با محاورہ سمجھ کے قبول کر لیا۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ ضرورت مجبور کر کے اُن سے تسلیم کراتی ہے۔ ورنہ اس کی کوئی وجہ نہین کہ ہم جن غلطیون کے ایک جاہل بچے کی زبان پر بھی متحمل نہین ہو سکتے اُنھین غلطیون کو سرکاری قوانین مین دیکھ کے برداشت کرین اور اُنھین ٹھنڈے دل سے قبول کر لین۔ خلاف محاورہ الفاظ کے مقبول ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ نیل کوڈ (تعزیرات ہند) کے ترجمہ نے صدہا غیر مانوس اور زبان پر گران گذرنے والے لفظون اور لغتون کو چند ہی روز مین بالکل مانوس بنا دیا۔ حالانکہ اُن کی جگہ زیادہ سلیس۔ خوبصورت اور با محاورہ الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے۔

خیر وہ تو ایک گذری ہوئی بات تھی جس کا اب کوئی علاج نہیں۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ آج بھی جبکہ اُردو لٹریچر بہت ترقی کر گیا ہے سرکاری قوانین کے ترجمون مین بے احتیاطی برتی جا رہی ہے۔ اس مین شک نہین کہ ان ترجمون کا غلط اور خلاف محاورہ ہونا سخت اعتراض کے قابل ہے۔ یہ غلطیان کسی اور مصنف یا رسالہ سے ہوتین تو چندان قابل لحاظ نہ تھین۔ مگر چونکہ ایک ایسے سرکاری محکمہ سے ہوتی ہین جس کا ہر ہر لفظ پبلک کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے اس لیے کسی طرح قابل درگذر نہین۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ اس محکمہ کی طرف خاص توجہ کرے۔ اور سوا لائق و مستند زبان دانون کے اور ایسے تعلیم یافتہ لوگون کی جن کی مادری زبان اُردو ہو اور کسی کے ہاتھ مین ایسی ذمہ داری کا کام

نہ دے۔ کیونکہ اگر یہی بے پروائی چند روز اور رہی تو یہ محکمہ بجائے نفع کے اُردو کو سخت ضرر پہونچا دے گا۔ اور اُس کی غفلت سے ہماری زبان بگڑ جائیگی۔

فی الحال چونکہ صوبۂ بہار کے لائق و فائق بزرگ آنریبل مسٹر علی امام لا ممبر مقرر ہوے ہیں جن میں نہایت اعلیٰ درجہ کا لٹرری ذوق بھی ہے لہذا اُنکی ذات سے ہمیں کامل امید ہے کہ وہ اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے۔ اور سرکاری قوانین کے ترجموں کے متعلق ضروری اصلاح فرما کے وہ ہماری زبان اور ہمارے ملک پر خاص احسان فرمائیں گے۔

ہم مسلم لیگ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے صیغۂ ترقی اُردو کو بھی اس اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ امید ہے کہ اس بارۂ خاص میں وہ سرکار میں ہمارا ریپرزنٹیشن کریں گے۔ اُردو کانفرنس جس نے بیدار مغزی سے کام لینا شروع کیا ہے اُس کے لیے اِس جانب توجہ کرنے کا پورا موقع ہے۔ اور اگر اُس نے اِس شکایت کو رفع کرا دیا تو وہ اپنی زبان پر بہت بڑا احسان کریگی اور اُردو کو ایک ایسی مضرت سے بچا دے گی جس سے بچانے کی سخت ضرورت ہے۔

ہمارا جدید ناول

ناول یوسف و نجمہ جو ایک مدت سے ناتمام و ناقص پڑا ہوا تھا، پورا ہو گیا۔ اور اس کا فیصلہ پبلک کے ہاتھ ہے کہ انجام کیسا ہوا؟ اور اُسکی حالت کیا حالت رہی؟ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ناظرین نے اس انجام کو پسند کیا ہوگا۔ اور جو کچھ اس میں ہوا وہ اُنکے مذاق اور اُنکی خواہشوں کے موافق ہو گا۔

نئے ناول کے متعلق ہم کچھ زمانے تک متردد رہے کہ کس تاریخ اور کس عہد کو اختیار کریں۔ بعض حضرات کی خواہش تھی کہ غدر کا زمانہ اختیار کیا جائے۔ اور اُس وقت کی مصیبتوں کی تصویر دکھائی جائے۔ بعض احباب کی رائے ہوئی کہ ہندوستان ہی کی پرانی تاریخ میں سے کوئی زمانہ منتخب کر لیا جائے۔ دو ایک دوستوں نے پھر یورپ کی سیر کرنی چاہی۔ اور فرمایا کہ دولت عثمانیہ کی تاریخ

میں سے ایک اچھا اور دلچسپ پلاٹ اخذ کر لیا جائے۔ لیکن ہم نے جہاں تک غور کیا ان میں سے کسی مشورے پر عمل کرنے کے لیے ہم ابھی تیار نہ تھے۔

نئے تعلیم یافتہ گروہ کا خیال ہے کہ ہماری موجودہ زندگی اور ابنائے وطن کی مروجہ معاشرت پر ناول لکھے جانے چاہییں۔ جیسا انگریزی میں ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں یہ انکی ناتجربہ کاری ہے۔ بیشک انگلستان اور ممالک یورپ میں اکثر ناول ایسے ہی ہوتے ہیں اور وہاں وہی عنوان دلچسپ رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کی پبلک میں جہاں تک میرا تجربہ ہے یہ عنوان بالکل دلچسپ نہیں ہو سکتا۔ افسانوں میں انسان اپنی زندگی کے اعلیٰ اور کامیابی کے واقعات کو ڈھونڈھتا ہے۔ اور ناکامی و ٹریجڈی بھی پسند آتی ہے تو اسی عہد کی جبکہ اپنے حالات میں کامیابی و مقصدوری کی صورتیں نظر آیا کرتی تھیں۔ جس طرح ہر انسان اپنے جوانی کے واقعات کو زیادہ پسند کرتا اور مزے لے لے کے کہتا اور سنتا ہے اسی طرح قومیں بھی اپنے عروج و کمال اور اوج و اقبال کے واقعات کو زیادہ پسندیدہ خیال کیا کرتی ہیں۔

یورپ والوں کو دنیا کی ساری عمر میں اپنا یہی موجودہ دور کامیابی و کامرانی اور ترقی و عروج کا دور نظر آتا ہے۔ اور اسی لیے وہ اپنی گذشتہ زندگی کے عوض موجودہ زندگی کو زیادہ پسند کرتے اور قومی عمر کے اسی حصہ پر فخر و ناز رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر اُن کے ناول موجودہ سوسائٹی کے واقعات سے لبریز ہوتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بلکہ بالکل بجا ہے۔ بخلاف اُنکے ہم اہل ہند ہندو ہوں یا مسلمان بلکہ میں کہوں گا کہ جاپان والوں کے سوا سارے اہل ایشیا: اس میں عرب ہوں یا تُرک، ایرانی ہوں یا ہندی یقین کر رہے ہیں کہ ہمارے اوج و عروج کا زمانہ گذر گیا۔ اور فی الحال ہم ایک نکبت و پستی کی زندگی میں مبتلا ہیں۔ پھر ایسی حالت میں ہم پوچھتے ہیں کہ انھیں اپنی موجودہ زندگی میں لطف آئے گا یا اوج و اقبال کی زندگی میں؟

اور ہماری اس ذلت و پستی کی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے جس میں ہمیں یا کسی کو مزہ آئے گا؟ اولوالعزمی و بلند حوصلگی ہم میں نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

بڑے اہم معاملات ملکی و قومی نہ ہم کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے ہاتھ میں ہیں تعلیم و قابلیت ہم میں نہایت کم درجے پر ہے۔ ہماری عورتیں جاہل اور نادان ہیں۔ اور سوا پستیِ خیال کے اُن سے نہ کوئی علمی کام ہو سکتا ہے اور نہ کوئی بڑا اہم ملکی کام۔ شریف گھرانوں میں ہمارے یہاں عشق ناجائز ہے۔ عقد سے پہلے مرد و عورت میں کوئی رابطہ نہیں قائم ہو سکتا۔ اور ہو تو ناجائز ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم میں سوسائٹی ہی نہیں جس پر یورپ کے ناولوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

رہیں چند معمولی باتیں۔ پیدا ہونا۔ کھیل کود کے بڑا ہونا۔ کچھ دنوں اُستاد کے سامنے بیٹھ کے محض بے نتیجہ اپنا اور اُس کا بھیجا خالی کرنا۔ شادی کرنا نہیں بلکہ دوسروں کے ہاتھوں شادی کا ہو جانا۔ اور چند روزوں تک روٹی کی فکر میں مبتلا رہ کے اور زمانہ کی سختی و سُستی برداشت کر کے مرجانا ہماری موجودہ زندگی کا خلاصہ ہے۔ اس میں اور ایک جانور کی زندگی میں بہت ہی تھوڑا فرق ہے اور ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان واقعات میں کسی کو کیا لطف آئے گا؟

موجودہ سوسائٹی کے شوق کی برکت سے اُردو میں ایسے بھی ناول لکھے گئے ہیں۔ جن میں کبھی کوئی شریف زادی کسی اور کے گھر میں ڈولی سے اُتروا دی گئی ہے۔ کبھی کسی نے کسی مہ جبین بہو بیٹی کو کھڑکی سے جھانکتے یا گاڑی کی جھلملیوں سے آنکھیں ملاتے دیکھ لیا ہے اور عاشق ہو گیا ہے۔ پھر اُس کے گھر سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اور آخر اُسے خراب کیا ہے۔

ایسے ناولوں کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ وہ سوسائٹی کی تصویریں ہیں یا اُن کے ذریعہ سے سوسائٹی اور زیادہ بدنام و رسوا کی گئی ہے۔ اُن میں اخلاق کا سبق دیا گیا ہے یا بد اخلاقی سکھائی گئی ہے۔

سچ یہ ہے کہ ہماری زندگی اس قابل ہی نہیں کہ ناول کے صفحوں پر لائی جائے اور جو کچھ اس سوسائٹی میں ہے اگر دکھایا جائے گا اُس سے سوا اس کے کہ ہم اپنی ذلت و تباہی کو عالم آشکارا کر دیں اور کچھ نہ ہوگا۔ ان کو پڑھ کر غیر ہم پر ہنسیں گے اور ہم اُن سے جو سبق حاصل کریں گے وہ ہٹیں اور ذلیل دیست کرے گا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ موجودہ مذاق پبلک کو پسند بھی نہیں آ سکتا

کیونکہ اُسی اصول کے مطابق جو ہم اوپر بیان کر آئے ہین ہمارے ہم وطنون اُور ہم قومون کو اپنی قومی زندگی کے اُسی حصہ کے واقعات مین مزہ آسکتا ہے جو کامیابی و عروج کا زمانہ تھا۔ اور نصیحت و عبرت کے لیے بھی ہم اُنھین اُنکے اوج و عروج کے کارنامے دکھائین تو شاید وہ زیادہ متنبہ ہون گے۔

ہندوستان کے لیے اہل یورپ کے مذاق کے ناول نہیں چاہیے۔ بلکہ "رومانس" چاہیے جن مین اُنھین کے کسی اگلے ہموطن یا ہم مذہب کی اعلی کارگزاریان دکھائی گئی ہون اور جن کے ذریعہ سے اُنھین اپنا اگلا علم و فضل اور اوج و عروج یاد دلایا گیا ہو۔

ہم نے بھی دو ایک ناول موجودہ سوسائٹی دکھانے کی کوشش مین لکھ کے شایع کیے تھے۔ مگر پبلک کو اُن مین ہرگز اتنا مزہ نہین آیا تھا کہ ملک العزیز ورجنا۔ فتح اندلس۔ ایام عرب۔ اور فردوس برین وغیرہ وغیرہ مین آیا۔ اور اسی خیال سے ہم ہمیشہ ناول کے لیے اگلے عہد کا کوئی واقعہ ڈھونڈھ لیا کرتے ہین۔ اور اُس مین موجودہ لٹریچر کے موافق کچھ مشرقیت ہوتی ہے اور کچھ مغربیت۔ حتی الامکان دلچسپی پیدا کر دیا کرتے ہین۔ اور ہمین اب یقین ہو گیا ہے کہ جس طرح ہمارا موجودہ لٹریچر مغربی و مشرقی انشا پردازی کا مجموعہ ہے اسی طرح ہمارے ناولون کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ اُن مین کچھ ایشیائیت ہو اور کچھ یوروپیت۔ نہ وہ بالکل ایسی بے سرو پا کہانیان ہون اور نہ انگلش گھرون کی تصویر دکھانے والے ناول۔

فی الحال ہم نے کوئی خیالی پلاٹ نہین بنایا۔ بلکہ ایک ایسے عاشق عرب کا قصہ ناول کے پیرایہ مین لکھنا شروع کر دیا ہے جس کے نام سے ہندوستان کے لوگ تو بہت کم واقف ہین مگر عرب کے لٹریچر مین اُس کی حد سے زیادہ زیادہ شہرت ہے۔ عشاق عرب مین سے مجنون عامری اور اُس کی معشوقہ لیلیٰ کا نام فارسی اور اُردو نظم کا عنصر اعظم بن گیا۔ مگر قیس بن ذریح عذری اور اُسکی معشوقہ لبنیٰ کے حالات سے لوگ بالکل ناواقف ہین۔ حالانکہ عرب مین ان دونون نامون کو لیلیٰ مجنون کے نامون سے کم شہرت نہین حاصل ہے۔

قیس بن ذریح کا کلام عربی لٹریچر میں کثرت سے موجود ہے - اس کے واقعات مورخین نے تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں - اور شعرا نے اُس کے سوزِ عشق سے اپنے عاشقانہ کلام میں گرمی پیدا کی ہے - اس کا زمانہ صحابۂ کرام کا درمیانی زمانہ ہے - حضرت عثمان ذی النورین اور حضرت علی مرتضیٰ کی شہادتوں کو اُس نے دیکھا نہیں تو سُنا تھا - اور اسلام کے اُس ابتدائی عہد پُر فتن میں تھا جبکہ حضرت رب العزت نے خیر القرون کے برگزیدہ لوگوں کو آزمایش کی مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا - لیکن اپنے عشق کے جوش سے اُس نے اُس عہد کے جھگڑوں کی طرف توجہ نہیں کی اور لبنیٰ کی یاد میں رو یا کیا - اس کو سب سے بڑی فضیلت و شرافت یہ حاصل تھی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا رضاعی بھائی تھا -

ممکن تھا کہ اس موقع پر ہم اُسکے مختصر حالات بھی بیان کر دیتے لیکن نہیں - اس سے ہمارا ناول بے مزہ ہو جائے گا - اور واقعات کے معلوم کرنے کا جو شوق دلوں میں پیدا ہوا کرتا ہے سرد پڑ جائے گا - لیکن اتنا اطمینان دلاتے ہیں کہ اس ناول میں جو واقعات بیان کیے جائیں گے مجموعی طور پر سچے اور مطابق واقعہ ہوں گے - ہاں ناول کی ضرورت سے تفصیلی صحبتوں اور صحبت کی باتوں میں تصرف اور اضافہ کرنے سے مجبوری ہے - کیونکہ بغیر اسکے نہ ناول ناول ہو سکتا ہے اور نہ قصے میں مزہ آ سکتا ہے -

ہمارا لٹریچر

اُردو زبان کی تاریخ پر عمدہ طور پر غور ہو چکا - اور اُس کی اگرچہ اُسی زمانے میں بنا پڑ گئی جبکہ مسلمانوں کا قدم پہلے پہل ہندوستان میں آیا - مگر اس بات کو اکثروں نے تسلیم کر لیا ہے کہ زبان اُردو کے ایک ممتاز صورت اختیار کرنے کی تاریخ نسلِ تیمور کے پانچویں تاجدار ہند شاہجہان کے عہد سے شروع ہوتی ہے حسبِ قاعدۂ فطرت اُردو چونکہ ابتداءً صرف اخلاقی صحبتوں اور رنج کی

دلچسپیوں مین مزے دکھارہی تھی۔ لہذا عموماً ابتدائی شعرائے اُردو یا اُردو کے بچپن کے قدردانون نے علمی اہم ضرورتون مین اس گھریلو زبان سے کچھ کام نہین لیا۔

یہ ظاہر ہے کہ ادھر دو تین صدی پہلے تک کا زمانہ اسلام کا آخری دَور تھا۔ ایسے لوگ نہین رہے تھے جو کسی بچے کے تیور دیکھتے ہی اُسکے ہونہار ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ کر لیتے۔ اور اسی غلطی نے عرصے تک اُردو کو کسی قسم کی معتدبہ وقعت نہ حاصل کرنے دی۔ اور کیونکر ہوتا۔ تقدیر نے تو یہ نیکنامی نا ستحان مغرب کی قسمت مین لکھدی تھی۔ بس یہی ہوا۔ برٹش حکومت نے اُردو کو عدالت کی کرسی تک نہین پہونچایا۔ بلکہ یون کہنا چاہیے کہ خاک سے اُٹھایا اور آسمان پر پہونچا دیا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ قبل اسکے کہ انگریز اس زبان مین اپنا بابرکت ہاتھ لگائین اُردو کی کیا حالت تھی؟ کیونکہ انگریزون نے اُردو کی قدر و منزلت بڑھانے مین چاہے جس قدر مبالغہ کیا ہو۔ مگر اس مین شک نہین کہ مسلمان اپنی تنہا کوششون سے اس زبان کو بہت مضبوط اور شائستہ بنا چکے تھے۔ انگریزون کو مسلمانون کے ہاتھ سے یہ زبان نفس ایک زبان ہونے کی حیثیت سے پوری اور کمال کے درجے پر پہونچی ہوئی ملی۔ لہذا ظلم ہوگا اگر اُردو کی اصلیت اور ترقی پر بحث کرتے وقت مسلمانون کی کوششین قدردانی کی نظر سے نہ دیکھی جائین۔

ظاہر ہے کہ اُردو کا پہلا وطن دہلی ہے۔ اور ترقی کی دنیا مین دہلی کی جو رفتار تھی وہی رفتار زبان اُردو کی رہی۔ شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے البتہ ترقی کے زمانے تھے۔ مگر اُن دنون گویا اُردو کا عالم ہیولانیت تھا۔ شائستہ اور لائق صحبتون مین کوئی اُردو کی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ ہان بعد کے دَور اپنی ہمت اور طاقت کے موافق اُردو کی قدر کرتے رہے۔ اگرچہ طوائف الملوکی اور بے انتظامیون نے دہلی کو اس قابل ہی نہین رکھا تھا کہ وہ اُردو کے ایسے ایک آزاد طبع اور فارغ البالی چاہنے والے بچے کی پرورش کر سکے۔ مگر باوجود اس ناقابل ہونے کے اہل دہلی سے اُردو کی ترقی مین جو جو کوششین ظاہر ہوئین

قابلِ تحسین ہین۔ مگر افسوس ان کوششون کی بھی دہلی کبھی قدر نہ کر سکی۔ دہلی مین جتنے نامور اور معجز بیان شعرا ہوے۔ زمانے نے اُن کا قدم کبھی وہان نہ جمنے دیا۔ میر۔ سودا۔ انشا۔ یہ لوگ ایسے نہ تھے کہ اگر دہلی مین ذرا بھی صلاحیت ہوتی تو انھین اپنی شہر پناہ سے کبھی نکلنے نہ دیتی۔ سودا جیسے انھین وطن سے بڑی محبت تھی۔ اور اُن کے ابتدائی تیور کہہ رہے تھے کہ دلی چھوڑ کر کہین نہ جائین گے۔ مگر وہان کی ناقدردانیون سے آخر اُنکے استقلال مین بھی فرق آگیا۔ ان تمام باتون سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کو صرف وطن ہونے کے سبب سے دلی کے ساتھ ایک قسم کا اُنس تھا۔ ورنہ دلی والون میں اسکی ترقی کے متعلق کوئی صلاحیت نہ تھی۔ اگر بعض پچھلے شاہان دہلی شعرا ے اُردو کی قدردانی کی طرف متوجہ بھی ہوے تو اُسوقت زمانہ اُنکے خلاف تھا۔ اپنی حیثیت سے اُنھون نے بہت کیا۔ مگر اصل مین پوچھیے تو کچھ نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ اُردو کو جہان تک تعلق دلی سے رہا وہ فلسفیانہ طور پر باعث تنزل ہو سکتا ہے۔ نہ باعثِ ترقی۔ کیونکہ خود دہلی کی حالت رو بہ تنزل تھی۔

یہی سرد مہری اور دلی کی یہ بے استطاعتی دیکھ کے اُردو کو بھی آخر دلی چھوڑنی ہی پڑی۔ لکھنو کا دربار اگلے شاہان دہلی کے مقابلے مین چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو مگر اُس زمانے کے شاہان دہلی کے دربارون سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ زمانہ تصدیق کر رہا تھا کہ جو دلی سے جاتا ہے لکھنو مین ہاتھون ہاتھ لیا جاتا ہے۔ کمالون کی قدر ہوتی ہے اور طبع آزمائیون کی داد دی جاتی ہے۔ اُردو کے وہ تمام لائق اور سخن سنج شعرا جن کی گود مین اُردو پرورش پا رہی تھی اپنے ہونہار بچے کو بغل مین دبائے ہوے لکھنو آئے۔ جہان اُنکے استقبال کے شوق مین ہر امیر و غریب کی آنکھین بچھ گئین۔ لکھنو پہونچکے اس بچے نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو دلی کے خلاف جہان تجارت پیشہ لوگون کو اپنے لین دین سے اسکی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ تھی۔ یہان کی تمام صحبتین اطمینان اور فراغت سے طبع آزمائی مین مصروف ہین۔ فی الحقیقت ایک ایسی زبان کے لیے جو ترقی کرنا چاہتی ہو۔ یہ صحبتین نہایت عمدہ مربی ہو سکتی تھین۔ اُردو

کو سبھون نے قدر و منزلت سے قبول کیا۔ اور اس بچے نے کچھ اس فصاحت و بلاغت سے اپنے ساتھ تمام شہر کی زبان کھول دی کہ گویا یہی بچہ لکھنؤ کے ہر ہر گھر مین بلبل ہزار داستان کی طرح چہک اُٹھا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ لکھنؤ کی اُن دنون کیا حالت تھی۔ اور باعتبار ترقی اسکی کیا رفتار تھی۔ لکھنؤ اگر ترقی نہ کرتا تھا تو تنزل بھی نہین کر رہا تھا۔ اُسکا دربار ایک حالت پر ٹھہرا ہوا تھا۔ یہان کے وزراء کے نائب بھی ایسے حوصلے اور ایسی مقدرت رکھتے تھے کہ خود پچھلے شاہان دہلی بھی اُن کی حوصلہ مندیون کا مقابلہ نہین کر سکتے تھے۔ جو ماہوار رقم بادشاہ دہلی کو ملتی تھی وہ یہان کی بہت سی چھوٹی چھوٹی سرکارون کا خرچ تھا۔ لکھنؤ کو جو یکبیک زوال ہو گیا اُسکی وجہ لکھنؤ کا تنزل نہ تھا۔ بلکہ یہان کے بادشاہون کی غفلتین اور طفلانہ حرکتین یا انگریزی قوت کا یکبیک بڑھ جانا تھا۔ الغرض صاف ظاہر ہے کہ شعر و سخن کی قدر دانی اور اُردو کی تربیت مین دہلی لکھنؤ کا ہرگز مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ لہذا اُردو اگرچہ دلی مین پیدا ہوئی۔ مگر اُس کی ترقی۔ اُسکا نشو و نما جتنی باتین ہین سب لکھنؤ مین ہوئین۔ اُردو پر دہلی کے جسقدر احسان ثابت کیے جائین۔ مگر لکھنؤ کے احسانات اُن سے بڑھے ہی تسلیم کرنا پڑین گے۔

یہ تو نفس زبان اُردو کی بحیثیت زبان تاریخ تھی۔ باقی رہے خیالات جو اس زبان کے ذریعہ سے ظاہر کیے گئے ہین۔ اس مین شک نہین کہ دہلی والے عموماً قدیم سے دلی جذبات کے ابھارنے اور سچے سمان دکھانے کی طرف متوجہ رہے۔ اور تھوڑے بہت اب بھی ہین۔ بخلاف لکھنؤ والون کے جو ہمیشہ سے بلند پروازی اور مضمون آفرینی کی طرف جاتے ہین۔ اس محل پر ہم دہلی کے رنگ کو لکھنؤ کے خیالی معرکہ آرائیون پر ترجیح دیتے ہین۔ اور ہم پر کیا منحصر ہے۔ انگریزی جو جو ترقی کرتی جائے گی دلی والون کا رنگ ہر دلعزیز ہوتا جائے گا۔ انگریزی تعلیم سے شکسپیر اور گولڈ اسمتھ کے پُر درد رنگ سے دلون کو ایک خاص قسم کا لگاؤ ہو جاتا ہے۔ اور انسان اُسی قسم کا رنگ ہر جگہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اُردو کی دنیا مین ایسے شخص یا صرف دلی والون کے مشاعرون مین اپنے

مذاق کی کچھ پھیکی پھیکی باتین بھی نظر آجاتی ہین - مگر لکھنؤ والون کی ناز کخیالیون مین اُسکو ایسی بات بھی نہین نظر آتی - اور اسی سبب سے دلی کی شاعری لکھنؤ کی شاعری کو اب کسی قدر زک دینے لگی ہے - لیکن اول تو اس سے دلی والون کی زبان کو ترجیح کا کوئی موقع نہین مل سکتا - دوسرے جو خیال اب مین ظاہر کرتا ہون اُس سے ہر صاحب انصاف تسلیم کرے گا کہ یہ امر بھی لکھنؤ والون کے لیے ایک ایسی حجت ہے جس کی بنا پر وہ اپنی زبان کی خوبیون کا سب سے اعتراف کرالین -

شاعری کا قاعدہ ہے کہ فطرتی طور پر ہر زبان مین خود بخود پیدا ہوجاتی ہے - شاعری جس زبان مین پیدا ہوتی ہے اُس زبان کے علمی اور مضبوط زبان ہونے کا انتظار نہین دیکھتی - مگر ہر زبان کی ابتدائی حالت اور اُس زبان کے بولنے والون کا مذاق چونکہ سیدھا سادہ ہوتا ہے اس وجہ سے اسکے پہلے شعرا اُنھین چیزون اور اُنھین خیالات سے کام لیتے ہین جو بالکل سامنے کے پیش پا اُفتادہ ہین - اور قدرتی طور پر بے ارادہ اُنکے کلام سے نیچر کی جھلکیان نظر آنے لگتی ہین - مگر وہ زبان جو جو علوم و فنون اور قواعد و ضوابط کی دنیا مین قدم رکھتی جاتی ہے شعرا اور زبان دانون کا مذاق بھی بدلتا جاتا ہے - جن لوگون نے عربی کے پہلے اور پچھلے کارنامے دیکھے ہون گے اُنھین اس خیال کے تسلیم کر لینے مین ذرا عذر نہ ہوگا - جاہلیت کے کلام مثلاً سبعۂ معلقہ اور دیوان حماسہ کے مرثیون کے سامنے دیوان متنبی یا دیگر مولدین کے کلام کو لا کے رکھیے تو معلوم ہو کہ پچھلے شعرا صرف علوم کی چاشنی پا کے کہان سے کہان جا پڑے ہین - یہ بات کچھ عربی ہی پر منحصر نہین - دنیا کی تمام زبانون کی ابتدائی اور انتہائی حالت کا جب اندازہ کیجیے گا صاف معلوم ہوجائے گا کہ علوم نے بے تکلف نیچرل مذاق کو تدریجاً کس قدر بدل دیا ہے - ہان انگریزی زبان کی شاعری اس سے مستثنٰے ہے - کیونکہ انگریزی جو جو ترقی کرتی گئی وہ وہ اُس کا نیچرل مذاق اور نکھرتا گیا - اور انگریزی شعرا روز بروز زیادہ چلا دیتے گئے - اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزون نے شاعری کی ماہیت پر غور کر کے فیصلہ کر لیا تھا کہ شاعری صرف

انسان کے دل پر اثر ڈالنے اور واقعے کی تصویر دکھا دینے کا نام ہے۔ اسی خیال نے نہ اُنھیں علم کے عالیشان چو منزلوں پر چڑھنے دیا اور نہ فنون کی پیچیدہ بھول بھلیوں میں قدم رکھنے دیا۔ مگر اُردو شعرا نے شاعری کا کوئی مسلم الثبوت اصول نہیں قرار دیا تھا۔ لہذا اُردو انگریزی کی طرح ترقی السنہ کے عام قاعدے سے نکل نہیں سکتی تھی۔

یہ قاعدہ کلیہ بیان کر کے ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ اُردو جب تک دہلی میں رہی۔ بچہ تھی۔ اُسکے شعرا اپنی ٹوٹی پھوٹی بچوں کی سی زبان میں بچوں ہی کے سیدھے سادے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ مگر لکھنؤ میں آنے کے بعد اُردو نے ترقی کی علمی اور اخلاقی دنیا میں قدم رکھا۔ یہاں اُس کی تدریجی ترقی اور اصلاح کے ساتھ شعرا کے خیالات میں بھی حسب قاعدہ بلند پروازی اور نازک خیالی پیدا ہو گئی۔ قطع نظر اسکے جن لوگوں نے انگریزی علم عروض اور قواعد شعر و سخن کو غور سے دیکھا ہے وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اُردو نظم میں جس قدر سختی کی گئی ہے اُسی قدر انگریزی میں سہولت سے کام لیا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں صدہا قیدیں اور ہزارہا قسم کی پابندیاں ہیں اور ترقی کرتی جاتی ہے۔ بخلاف اسکے انگریزی میں بہت کم قیدوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ باوجود اس ترقی کے اب تک انگریزی میں قافیہ کی ضرورت نہیں۔ اور اُردو میں جب تک قافیہ کی پابندی نہ ہو شعر ہی نہیں ہو سکتا۔ اُردو میں غزل اس قدر سخت چیز ہے جس کی نظیر انگریزی کیا معنی عربی میں بھی نہیں مل سکتی۔ اب غزل کی قیود کا لحاظ کر کے اُردو کے مقابل میں انگریزی نظم کو دیکھیے تو کس قدر آسانی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے مشہور نیچرل مذاق کے مجدد جناب حالی انگریزی رنگ کی طرف جھکے تو مجبوراً اُنھوں نے اپنے آپ کو عموماً نظم اُردو کی قیود سے آزاد کر لیا۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حالی اصول شعر سے واقف نہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ ان مجبوریوں نے اُنھیں قدیم شاعری کی تقلید سے الگ کر دیا۔

نفس زبان کے متعلق ہم نے جو لکھنؤ والوں کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے اس دھوکے میں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ اُن کا کلام قابل نکتہ چینی ہی نہیں۔ اپنے خیالات

کی نسبت انکو دہلی کے شعرا سے سبق لینا چاہیے - لکھنؤ والے کچھ ایسے زلف و کاکل اور بے مزہ لبند پروازیون مین پڑ گئے ہین کہ اُنکی شاعری روز بروز بیکار اور فضول ہوتی جاتی ہے - اگرچہ اس زمانے مین کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہین جن کو میر اور مومن کے پُر درد مذاق کی طرف توجہ ہے - مگر عام شعرائے لکھنؤ ابھی اپنے اُسی رنگ پر ہین - اگرچہ زبان کے اعتبار سے لکھنؤ کو بیشک اپنے حریف دہلی والون پر ترجیح ہے مگر اُن کے پھیکے مذاق نے ایسی خرابیان پیدا کر دین کہ آج لکھنؤ والون کے دیوان عام نگاہون مین بے مزہ ہوتے جاتے ہیں اور دہلی والون کا کلام ایک بنیا ہی سگے اثر کے ساتھ ہر شخص کو مزا دے جاتا ہے - مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا ظلم ہوگا کہ دہلی والون نے نفس زبان کے لحاظ سے کچھ کیا ہی نہین - اگرچہ زبان اُردو کو آخر زمانے مین لکھنؤ سے خاص تعلق ہو گیا تھا - لیکن دہلی مین ابھی اسکا چرچا باقی تھا - مومن - غالب - اور ذوق ایسے شعرا ہین جنھون نے ترقی زبان اُردو مین بہت کوششین کین - اُن کا کلام آج لکھنؤ اور دہلی دونون شہرون کے اُستادان زبان کے نزدیک قبولیت کی سند پا چکا ہے - ان لوگون کا کلام دیکھنے سے لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہین کہ مومن خاں تو دہلی کے قدیم رنگ پر جا رہے تھے - انکی طبع آزمائیون نے زبان کو اُسی حالت پر رکھا - مگر درد اور سوز و گداز پیدا کرنے کی حیثیت سے سچ پوچھیے تو اپنے وقت کے گولڈ سمتھ تھے - جو بتیابیان اور عشق کی پُر جوش اُمنگین اُنکے کلام مین نظر آتی ہین - اور کسی کے کلام مین ممکن نہین - غالب کی طبیعت مین ایجاد اور جدت پسندی کا مادہ بہت تھا - علاوہ برین فارسی کی قدیم مذاق کی طرف وہ بڑے ذوق و شوق سے متوجہ تھے - دری بلکہ ژند کی زبان کی طرف وہ موجودہ فارسی کو کھینچے لیے جاتے تھے - اور چونکہ اُس زبان مین نیچر اور قدرت کے محسوس منظرون کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے - اس لیے اُن مین دو باتین کمال کی پیدا ہو گئین - طبیعت کی اصلی جدت پسندی نے مضمون آفرینی پیدا کی اور قدیم زبان ژند کے ذوق نے نیچرل خیالات پیدا کر دیے - اگرچہ فارسی کی طرف زیادہ متوجہ رہنے سے اُنکی اُردو شاعری مین تھوڑا سا

نقص پیدا ہو گیا یعنی فارسی بندشوں مین اعتدال سے بڑھ گئے۔ لیکن جو مذاق اور جو خیالات اُنھون نے اُردو مین پیدا کیے اُس مین اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ اور لکھنو والون کے عام رنگ سے علیحدہ ہو کر جس خوبصورتی سے غالب نے مضمون آفرینی کے ساتھ نیچرل مذاق کو نباہا ہے وہ اُنھین کا حصہ تھا۔ اور اُس پہ دہلی والے جس قدر ناز کرین زیبا ہے۔ باقی رہے ذوق۔ صرف ذوق ایک شخص ہین جو لکھنؤ والون کی طرح ترقی کی عام رفتار مین پڑ کے دھوکا کھا گئے۔ جو رنگ شعرائے لکھنؤ نے اختیار کیا تھا وہی رنگ ذوق نے دلی کے آخر عہد مین اختیار کیا۔ ان مین اور شعرائے لکھنؤ مین کوئی فرق نہ تھا۔ اگر تھا تو اُسی قدر جسقدر ہر شاعر مین اپنے خاص طبعی جذبات کے لحاظ سے اور دوسرے شاعر مین ہوتا ہے۔ خود لکھنؤ کے شعرا مین باہم ایسا ہی فرق نکل آئے گا جیسا کہ ذوق مین اور لکھنؤ کے کسی شاعر مین ہو۔ مگر زمانے کی رفتار ترقی کے ساتھ شاعری کے مذاق کے بدلنے کا جو ہم نے دعوے کیا ہے اُس کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ ذوق جو نیچر کے رنگ کو چھوڑ کے مضمون آفرینی اور بلند پروازی کی طرف جھکے تو دلی والون نے بھی اُن کی قدر کل شعرائے دہلی سے زیادہ کی۔ آج دلی کی زیادہ آبادی ذوق کو اُستاد مان رہی ہے اور بیچارے غالب و مومن کا نام لینے والے کم ہین۔ بس یہی تین شعرا ہین جنھین دلی کا سرمایۂ ناز کہنا چاہیے۔ اور گذشتہ شعرا اگرچہ اُردو پر اُن کا احسان سب سے زیادہ ہے۔ مگر اُن کو لکھنؤ اور دہلی دونون مقامون سے برابر کا تعلق تھا۔ اور اگر وہ دہلی کے لیے ذریعہ فخر ہین تو ہون۔ لکھنؤ کو اُن دنون اہل زبان ہونے کا دعوے نہ تھا۔ دہلی کی طرح لکھنؤ بھی اُنکے عہد مین اُنھین پر ناز کر رہا تھا۔

اُردو شاعری اور اُردو زبان کی یہ سچی تاریخ تھی۔ اور اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ دہلی کو اُردو سے وطن ہونے کا اور لکھنؤ کو مقام نشو و نما و تربیت اور ذریعۂ ترقی ہونے کا تعلق ہے۔ دہلی والون کو لکھنؤ کا احسان ماننا چاہیے تھا کہ جو ننھا بچہ اُن کے شہر مین پیدا ہوا تھا اُس کی وہ ذرا تربیت نہ کر سکتے تھے۔ لکھنؤ کے رؤسا اور بادشاہون نے اُسے اپنی گود مین اُٹھا لیا اور پوری ترقی دلا دی۔ مگر ثبات

اسکے اکثر دیکھا گیا کہ حضرات دہلی اپنی تحریرون اور تصنیفون کے اندر... لکھنو پر حملے کر جایا کرتے ہین - اگرچہ لکھنو کے شعرا جو ہمارے سرمایۂ ناز ہین - انکو ان رکیک حملون کی ذرا پروا نہین ہوتی - مگر کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور چاہیے تاکہ پبلک کو اصلی حالات بخوبی معلوم ہو جائین -

لکھنو پر سب سے زیادہ عنایت جناب مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے کی - انکی کتاب آبحیات بتا رہی ہے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ لکھنو کے مٹا دینے مین کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے شعرا کی سوانحعمری لکھتے وقت انھین یہ کس نے صلاح دی تھی کہ ناسخ و آتش کے حالات بھی لکھین - شاید صرف یہ غرض ہوگی کہ ابتدا سے آخر تک جتنے شعرائے اردو ہوے ہین سب دلی کے تھے - صرف یہ دو شخص البتہ لکھنو کے ہین - مگر اس مجمع کے آگے ان دو کا کیا شمار - اس دھوکے مین شاید کوئی ناواقف آ گیا ہو تو آ گیا ہو - ورنہ جاننے والے جانتے ہین کہ لکھنو مین ناسخ و آتش کے علاوہ بہت سے شعرا ہین جن کی وقعت ناسخ و آتش سے کسی طرح کم نہ تھی - بلکہ وہ زیادہ وقعت رکھتے تھے - خواجہ وزیر وزیر - میر وزیر علی صبا - رند - رشک - اسیر یہ سب لوگ ایسے تھے جن پر لکھنو کی شاعری کا دار و مدار ہے - ان کے دیوانون کو دیکھ کے انسان ناسخ و آتش کو بھی بھول جاتا ہے - ہم یہ کہنا تو گستاخی سمجھتے ہین کہ ہمارے حضرت آزاد نے ان لوگون کا کلام نہین دیکھا - مگر انکے حسن نیت کے ہم البتہ بہت بڑے معتقد ہو گئے - مثنوی کے اعتبار سے جو ناموری اور قبول عام "تلق" اور حکیم نواب مرزا شوق اور مصنف گلزار نسیم کو نصیب ہوئی اس پر بہتون کو رشک ہے - جناب آزاد نے لکھنو والون کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کا نعم البدل انھین یہ ملا کہ دلی مین آج انکو کوئی نہین مانتا - چاہے اپنے گھر بیٹھے ادعائے استادی کیا کرین - مگر وہ دل شکستہ نہ ہون ہم انکے حسن عبارت کی داد دیتے ہین - اور لطف یہ کہ ہمارے جناب مولانا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نے اردو کی پوری تاریخ لکھی اور ہر عہد کے تغیرات پر غور فرمایا - مگر اس کا خیال نہ کیا کہ سودا اور میر جس وقت دلی چھوڑ کے لکھنو آئے ہین اسکے بعد سے دلی کو ترقی کا کوئی موقع نہ ملا - حالانکہ لکھنو ترقی کر رہا تھا - جس سے

لکھنؤ کی خوبیِ زبان کا عقلی نتیجہ نکلتا ہے۔

میرے نزدیک اب یہ امر بہ وضاحت ثابت ہوگیا کہ باعتبارِ زبان لکھنؤ کو دلّی پر، اور باعتبارِ مذاق و خیال دلّی کو لکھنؤ پر ترجیح ہے۔ زمانہ اب دُور دُور کے مقامات کو ملا رہا ہے۔ لکھنؤ والون کی باتین روز دلّی والے اور دلّی والون کی پُردرد غزل خوانیان لکھنؤ والے سُن لیا کرتے ہین۔ ایسے وقت مین مناسب ہے کہ دلّی اور لکھنؤ والون کی باہمی بحثین اُٹھا رکھی جائین اور دونون مقامون کے لوگ یون اپنی مادری زبان کی اعانت پر کمربستہ ہون کہ جس کو جس امر مین ترجیح ہو اُس سے دوسرا سبق لے۔ اگر لکھنؤ والون کی زبان اچھی ہے تو دہلی والے اُن سے سیکھین اور اگر دہلی والون کا رنگ دلچسپ اور موثر ہے تو لکھنؤ والے اُنکی شاگردی اپنا فخر سمجھ کے اختیار کرین اور اپنے مذاقِ سخن کی اصلاح کرین۔

ہم نے یہ اپنی راے ظاہر کردی۔ ورنہ ہم کو نہ دہلی سے تعلق ہے اور نہ لکھنؤ سے۔ ہم سے جیسی عبارت بن پڑتی ہے لکھ لیتے ہین۔ اس مین بھی کسی بات کا دعوے نہین۔ ملک مین ایک سے ایک بڑھ کر لکھنے والا پڑا ہے۔ مگر پھر بھی اتنا کہتے ہین کہ جو لوگ اُردو کے اہلِ کمال ہین اُن کے نزدیک ہماری وقعت کچھ اُن لوگون سے زیادہ ہی ہوگی جو خود بخود پکارتے پھرتے ہین کہ ہم سے بڑھ کے لکھنے والا کوئی دنیا بھر مین نہین۔

تمّت بالخیر

شہر فاس مین ہے یا نہین۔ فی الحال ایک قرآن مجید اور وہی خاص جس پر حضرت عثمان کا خون گرا تھا قسطنطنیہ مین دولت عثمانیہ کے قبضے مین بتایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ وہی قرآن ہو اور کسی ذریعہ سے سلاطین آل عثمان کے قبضے مین آ گیا ہو۔

لیکن ہمین ابھی اتنا بتانا باقی ہے کہ پہلے فرمانروائے موحدین عبدالمومن بن علی نے اس کی قدردانی و حفاظت کے لیے کیا انتظامات کیے تھے۔ اُسے اِس قرآن کے ملتے ہی اِس بات کی فکر ہوئی کہ جیسا یہ معجز نما کلام ہے ویسی ہی اسکی رحل اور اسکے رکھنے کا تابوت (صندوق) بھی ہو۔ جن سے ایک طلسم اور معجز نمائی کی شان نمایان ہوتی ہو۔

چنانچہ اِس غرض کے لیے اُس نے اپنے دار السلطنت مراکش (جو اُن دنون ایک بڑا ترقی یافتہ اور متمدن شہر تھا) کے اور نیز اپنی قلمرو کے بلاد دور و دراز کے بڑے بڑے مہندسون۔ نقاشون۔ معمارون۔ نجارون۔ سادہ کارون نگینہ جڑنے والون اور صحافون غرض ہر قسم کے کاریگرون کو بُلا کے شہر مراکش مین جمع کیا۔ اور اُن کو حکم دیا کہ تم سب مل کے باہمی مشورے سے اس قرآن کی جلد بناؤ۔ اُس مین جواہرات جڑو۔ اور اُسکے لیے اعلیٰ درجے کا ایک جزدان بناؤ۔ اور یہ سب چیزین ایسی ہون جو اعجوبۂ روزگار ہون۔ پھر اُس کے لیے ایک کرسی اور ایک رحل اور ایک ایسا تابوت تیار کرو جس مین اپنی ساری صناعی صَرف کر دو۔ اور ایسا کمال دکھاؤ کہ یہ سب چیزین ایک طلسم معلوم ہون اور اُن سے ایسے عجائبات ظاہر ہون جن کے اسباب نظر سے پوشیدہ رہین۔

یہ ایک دینی کام تھا جس مین اجر و ثواب آخرت کے علاوہ بادشاہ کی خوشنودی بھی متصور تھی۔ کاریگرون نے جانین لڑا دین۔ پہلے تو اُس کلام اللہ کے لیے سونے چاندی کی ایک مرصع کار جلد اس وضع کی بنائی گئی کہ اُس مین زیادہ ترکیبین کی شان تھی۔ اندر باہر عجیب و غریب صنعتین رکھی گئی تھین۔ اور ہر جگہ ایسے نقش و نگار تھے جن مین ہر مقام پر ایک نئی صنعت نظر آتی تھی۔ اُس پر رومی شیشے کی ایسی میناکاری کی گئی تھی کہ اُس سے پہلے کبھی لوگون

نظر سے نہین گزری تھی اس جلد مین حیرت انگیز طریقے سے ہر مقام پر جوڑ رکھے جو بند ہوتے وقت خوب بھڑ کے بیٹھ جاتے اور کھلتے وقت جدا ہو جاتے۔ اور ایسی خوش اسلوبی اور عمدہ ترتیب سے اُس جلد پر ہیرے۔ یاقوت۔ زمرد اور موتی جڑے گئے تھے کہ اُسکی آب و تاب پر نظر نہ جم سکتی۔ پھر اُسکے لیے سُندس و حریر کا ایک نہایت ہی پُر تکلف جزدان تیار کیا گیا۔ اور اس مین بھی بہت ہی بیش بہا جواہرات کثرت سے ٹانکے گئے۔

اسکے بعد اُس قرآن مجید کے واسطے ایک آبنوس کی مرصع کار رحل بنائی گئی۔ اور اُس مین بھی اعلیٰ درجے کے نقش و نگار بنا کے جابجا جواہرات جڑے گئے۔ اس رحل کی وضع بھی نہایت خوشنما اور عجیب تھی۔ پھر ایک نہایت نازک، خوبصورت اور پُر تکلف کرسی بنائی گئی تاکہ اُس کرسی پر رحل اور قرآن پاک رکھا جائے۔ پھر ایک بڑا سا تابوت (صندوق) بنایا گیا تاکہ اُسکے اندر وہ کرسی اور رحل اور قرآن حفاظت کے ساتھ رکھے رہین۔ اور جب کہین لیجانا ہو تو اُس پورے تابوت کو اُٹھا کے لیجایا کرین۔ یہ تابوت شش پہل تھا۔ بہت بلند تھا اور نہایت خوشنما۔ اور اُسپر چارون طرف ایسے نقش و نگار بنائے گئے تھے کہ جو دیکھتا عش عش کر جاتا۔

مگر سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس خیال سے کہ بغیر ہاتھ لگائے قرآن کی زیارت ہو جایا کرے اور حضرت جل وعلا کے اس ارشاد کی کہ "لا یمسّہٗ الّا المطہرون" کی پوری تصدیق ہوتی رہے۔ اس تابوت۔ کرسی۔ اور رحل مین کچھ ایسی کلین لگائی گئی تھین اور اُنکی تکمیل مین ایسا کمال انجینیری صرف کیا گیا تھا کہ اُنھین دیکھ کے عقل دنگ رہ جاتی۔ اور قرآن مجید کی زیارت مین ایک معجز نمائی کا حیرت انگیز کرشمہ لوگون کو نظر آجاتا۔ جب کسی کو اُسکی زیارت کا شوق ہوتا تو اُس شش پہل تابوت کے ایک پہلو پر جو دو پٹ لگے ہوے تھے اُنکے بیچ ایک سوراخ مین ایک نازک سی خوبصورت کُنجی ڈال کے پھرائی جاتی۔ کُنجی کے پھرتے ہی آپ سے آپ دونون پٹ یکایک کُھل کے اندر کی طرف مُڑ جاتے۔ وہ کرسی جس پر رحل تھی خود بخود تابوت سے باہر دوڑ آتی۔ اور

رحل مع قرآن بھی خود بخود حرکت کرکے اور اُس کرسی پر کھسک کے انتہائی سرے پر آجاتی۔ اور یہ سب حرکتیں ایک ہی ساتھ صرف کُنجی کے پھرانے سے بغیر اسکے کہ کوئی ہاتھ لگائے، ہوتیں۔ اور قرآن مجید زیارت کرنے والوں کے قریب آجاتا۔ پھر بعد زیارت جب اُسے احتیاط سے رکھ دینا منظور ہوتا تو کنجی اُسی سوراخ میں ڈال کے دوسری طرف پھرائی جاتی اور ساتھ ہی کرسی و رحل مع قرآن کے آپ سے آپ اندر ہوکے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو جاتے اور خود ہی تابوت کے پٹ بھی بند ہو کے مقفل ہو جاتے۔

مسلمانوں اور خصوصاً آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں کو اُس زمانہ میں اور وہ بھی مراکو میں ایک ایسی صنعت کے پائے جانے کا مشکل سے یقین آئے گا۔ مگر یہ کُل باتیں کتاب نفح الطیب کی جلد اول میں بوضاحت درج ہیں جو کہ آج کل کی تصنیف نہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اُسکے بیان کو جو مستند مورخین کے حوالہ سے ہے بے اصل تصور کیا جائے۔

مگر ہاں خود ہماری حالت ایسی ہو رہی ہے کہ ایسے کمالات کا اب ہمارے اگلے باکمال بزرگوں کی جانب منسوب کیا جانا بھی اوروں کو نہیں خود ہمارے ہم قوموں کو قابل حیرت نظر آتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ ہمارے بزرگ ایسے نہ تھے جیسے کہ ہم ہیں۔

اردو لٹریچر اور محکمۂ قوانین

اُردو زبان خوش اقبالی میں بھی بد نصیب ہے۔ اُس کی تاریخ بتا رہی ہے کہ اُسکو جب کبھی ضرر پہونچا ہے خود اپنوں اور اپنے مربیوں سے پہونچا ہے۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند   سعدی از دست خویشتن فریاد

جن ہندو اور مسلمانوں کے امتزاج و اتحاد۔ میل جول اور باہمی ربط و ضبط سے وہ پیدا ہوئی اُنھیں نے ابتدا ہی سے اسے ایک گھریلو زبان سمجھ کے اُسے ہمیشہ علمی دربار سے محروم رکھا۔ اور اب بھی دیکھ لیجیے کہ وہی لوگ جو اسکو بولتے، اسے برتتے، اس میں مراسلت، نامہ و پیام اور تصنیف و تالیف کرتے

اور اس مین اخبار نکالتے ہین وہی اسکے دشمن ہین۔ اور جب پوچھو تو یہی کہتے ہین کہ ہمین اُردو سے کوئی تعلق نہین اور نہ یہ ہماری زبان ہے۔ سرکار برطانیہ جس نے اُسے علمی دربار مین پہونچایا سرکاری زبان بنایا۔ سلطنت کے قوانین اُس مین مدوّن کرائے۔ شہرون اور گانوٗن گانوٗن مین اسکی تعلیم کے مدرسے جاری کیے۔ اُسی کے بعض افسر اُردو کے خلاف ہین اور اُس کی ترقیون کو اچھی نگاہ سے نہین دیکھتے۔ اور اگر اس پر عنایت بھی کرتے ہین تو بدنصیبی سے وہی عنایت جو موجب مضرت بنجاتی ہے۔

سررشتۂ تعلیم مین چونکہ ہندو عنصر غالب ہے اس لیے اگر اور کچھ نہین بن پڑتا تو اسی بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ نصاب تعلیم کی کتابون کی زبان ہی بگاڑ کے غارت اور گنوارون کی زبان سے بھی بدتر کر دی جائے۔ مگر اسکے علاوہ ایک اور حیثیت سے بھی اُردو بگاڑی جا رہی ہے۔ جو اس سے بھی زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اور وہ حیثیت سررشتۂ ترجمۂ قوانین کی ہے۔

اُردو زبان کو ہندوستان کی دوسری زبانون پر مختلف حیثیتون سے ترجیح حاصل ہے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ دیگر اقوام و السنہ سے جس قدر علم و فن ہندوستان کی لٹریری دنیا مین آتا ہے وہ زیادہ تر اُردو ہی مین ہوتا ہے۔ ہندوستان جسے بجائے خود ایک بر اعظم کہنا چاہیے اُسکی تقریباً نصف آبادی اُردو بولتی اور سمجھتی ہے جس کی وجہ سے دوسری زبانون سے جتنی کتابین یا چیزین ترجمہ ہوتی ہین اکثر اُردو ہی مین ہوتی ہین۔ اِن ترجمون کا سلسلہ ایک مدت دراز سے اُردو مین جاری ہے جن کی بدولت اُردو مین اتنا وسیع اور غیر محدود لٹریچر پیدا ہو گیا ہے کہ اُسے تکمیل کے ساتھ جمع کر لینا کسی بڑی لائبریری کے بھی امکان مین نہین ہے۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ اور تلنگی زبانون مین بھی ترجمہ ہوئے ہین۔ مگر اُردو کے مقابل بہت کم۔ اور اتنے ہین کہ انکی مجموعی تعداد اُردو ترجمون کے عُشر عشیر کو بھی نہین پہونچ سکتی۔ اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ جہان تک خاص اُردو کی قلمرو ہے اُس مین اُن زبانون کو کوئی جانتا بھی نہین اور اُنکے خاص رقبے مین اُردو پوری طرح حکومت کر رہی ہے۔ بنگالی۔ گجراتی۔

مرہٹی اور تلنگی زبانون کے لٹریچر کو عظیم آباد سے پشاور تک کوئی جانتا بھی نہین مگر اُردو لٹریچر کی اشاعت جیسی لکھنؤ اور دہلی مین ہے اُسکے قریب ہی قریب کلکتہ- بمبئی - پونا - اور مدراس مین بھی ہو رہی ہے - اور اسی وجہ سے اُن زبانون کا دائرہ بہت ہی محدود ہے اور اُن مین ویسی علمی وسعت ہرگز نہین جیسی کہ اُردو مین ہے -

دنیا کی تمام زبانون کو سب سے زیادہ علمی فائدہ ترجمون ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوا کیا ہے - کیونکہ ترجمہ کی معرفت جب نئے مضامین اور نئے خیالات کسی زبان مین آتے ہین تو اپنے لیے نئے الفاظ محاورات اور مصطلحات بھی پیدا کر لیا کرتے ہین جن سے زبان کو روز بروز وسعت حاصل ہوتی جاتی ہے - ہندوستان مین مختلف زبان بولنے والی قومین اور مختلف مذاق و اعتقادات و خیالات کے لوگ موجود ہین جن کی وجہ سے یہان کوئی ایک قومی اور ملکی اکاڈمی نہین قائم ہو سکتی جیسی کہ فرانس مین نظر آتی ہے - جہان ایک ہی زبان بولنے والون اور ایک ہی مذاق رکھنے والون کی متحدہ کوششین فرینچ اکاڈمی کے ذریعہ سے فرانسیسی لٹریچر کو یوماً فیوماً ترقی دلاتی رہتی ہین -

یہان سچ پوچھیے تو ایسی کسی اکاڈمی کا قائم مقام صحیح معنون مین گورنمنٹ کا محکمہ ترجمۂ قوانین ہے - جس کے ذریعہ سے تمام قانون کے ترجمے برابر اُردو مین شایع ہوتے رہتے ہین - اور جو اپنی اشاعت کے ساتھ اُردو مین بہت سے نئے الفاظ نئے محاورے اور نئے مصطلحات پیدا کر دیتے ہین اور وہ شایع ہوتے ہی ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر جاری ہو جاتے ہین - جو کتابین گورنمنٹ کے ایما اور حکم سے اس محکمے کے ذریعہ سے شایع ہوتی ہین - ان کو اشاعت کے ساتھ ہی جیسی کچھ مقبولیت اور تعمیم حاصل ہو جاتی ہے ویسی نہ کسی شاعر کے کلام کو نصیب ہو سکتی ہے اور نہ کسی ادیب کی عبارت کو - وہ ترجمے فوراً مستند تسلیم کر لیے جاتے ہین - عدالتون اور تمام حلقون مین برتنا شروع ہو جاتے ہین - فوراً اُن سے استناد کیا جانے لگتا ہے - اور اُن کا ہر ہر لفظ چاہے بُرا ہو یا بھلا یا محاورہ ہو یا بے محاورہ ایک ناخواندہ دہقان کی طرح زبان مین

زبردستی گھس پڑتا ہے۔

جہاں تک مجھے تجربہ ہوا ہے ان قوانین کے ترجموں میں کثرت سے خلاف محاورہ ترجموں کو مجبوراً قبول کر لیتے ہیں۔ اور اُن پر حرف رکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے ہمیں یہ کہنے کا موقع حاصل ہے کہ خود گورنمنٹ کی مہربانی سے زبان بجائے سدھرنے کے بگڑ رہی ہے۔ اور جس اکاڈیمی سے ہمیں فائدہ پہونچنا چاہیے تھا اُس سے ہم ضرر اُٹھا رہے ہیں

لوگ ان ترجموں کو عموماً قبول کر لیا کرتے ہیں۔ اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اُنھوں نے ترجموں کو صحیح و بامحاورہ سمجھ کے قبول کر لیا۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ ضرورت مجبور کر کے اُن سے تسلیم کراتی ہے۔ ورنہ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ہم جن غلطیوں کے ایک جاہل بچے کی زبان پر بھی متحمل نہیں ہو سکتے اُنھیں غلطیوں کو سرکاری قوانین میں دیکھ کے برداشت کریں اور اُنھیں ٹھنڈے دل سے قبول کر لیں۔ خلاف محاورہ الفاظ کے مقبول ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ پینل کوڈ (تعزیرات ہند) کے ترجمہ نے صدہا غیر مانوس اور زبان پر گراں گذرنے والے لفظوں اور لغتوں کو چند ہی روز میں بالکل مانوس بنا دیا۔ حالانکہ اُن کی جگہ زیادہ سلیس۔ خوبصورت اور بامحاورہ الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے۔

خیر وہ تو ایک گذری ہوئی بات تھی جس کا اب کوئی علاج نہیں۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ آج بھی جبکہ اُردو لٹریچر بہت ترقی کر گیا ہے سرکاری قوانین کے ترجموں میں بے احتیاطی برتی جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان ترجموں کا غلط اور خلاف محاورہ ہونا سخت اعتراض کے قابل ہے۔ یہ غلطیاں کسی اور مصنف یا رسالہ سے ہوتیں تو چنداں قابل لحاظ نہ تھیں۔ مگر چونکہ ایک ایسے سرکاری محکمہ سے ہوتی ہیں جس کا ہر لفظ پبلک کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے اس لیے کسی طرح قابل درگذر نہیں۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ اس محکمہ کی طرف خاص توجہ کرے۔ اور سوا لائق و مستند زبان دانوں کے اور ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی جن کی مادری زبان اُردو ہو اور کسی کے ہاتھ میں ایسی ذمہ داری کا کام

نہ دے۔ کیونکہ اگر یہی بے پروائی چار روز اور رہی تو یہ محکمہ بجائے نفع کے اُردو کو سخت ضرر پہونچا دے گا۔ اور اُس کی غفلت سے ہماری زبان بگڑ جائیگی۔

فی الحال چونکہ صوبۂ بہار کے لائق و فائق بزرگ آنریبل مسٹر علی امام لا ممبر مقرر ہوئے ہیں جن میں نہایت اعلیٰ درجہ کا لٹرری ذوق بھی ہے لہذا اُنکی ذات سے ہمیں کامل امید ہے کہ وہ اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے۔ اور سرکاری قوانین کے ترجمون کے متعلق ضروری اصلاح فرما کے وہ ہماری زبان اور ہمارے ملک پر خاص احسان فرمائیں گے۔

ہم مسلم لیگ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے صیغۂ ترقی اُردو کو بھی اس اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ امید ہے کہ اس بارۂ خاص میں وہ سرکار میں ہمارا ریپریزنٹیشن کریں گے۔ اُردو کانفرنس عیں نے بیدار مغزی سے کام لینا شروع کیا ہے اُس کے لیے اِس جانب توجہ کرنے کا پورا موقع ہے۔ اور اگر اُس نے اِس شکایت کو رفع کرا دیا تو وہ اپنی زبان پر بہت بڑا احسان کریگی اور اُردو کو ایک ایسی مضرت سے بچا دے گی جس سے بچانے کی سخت ضرورت ہے۔

ہمارا جدید ناول

ناول یوسف ونجمہ جو ایک مدت سے ناتمام و ناقص پڑا ہوا تھا، پورا ہو گیا۔ اور اس کا فیصلہ پبلک کے ہاتھ ہے کہ انجام کیسا ہوا؟ اور اُسکی حالت کیا حالت رہی؟ جہان تک ہم سمجھتے ہیں ناظرین نے اس انجام کو پسند کیا ہوگا۔ اور جو کچھ اس میں ہوا وہ اُنکے مذاق اور اُنکی خواہشون کے موافق ہوگا۔

نئے ناول کے متعلق ہم کچھ زمانے تک متردد رہے کہ کس تاریخ اور کس عہد کو اختیار کریں۔ بعض حضرات کی خواہش تھی کہ غدر کا زمانہ اختیار کیا جائے۔ اور اُس وقت کی مصیبتوں کی تصویر دکھائی جائے۔ بعض احباب کی رائے ہوئی کہ ہندوستان ہی کی پرانی تاریخ میں سے کوئی زمانہ منتخب کر لیا جائے۔ دو ایک دوستون نے پھر یورپ کی سیر کرنی چاہی۔ اور فرمایا کہ دولت عثمانیہ کی تاریخ

مین سے ایک اچھا اور دلچسپ پلاٹ اخذ کر لیا جائے۔ لیکن ہم نے جہان تک غور کیا ان مین سے کسی مشورے پر عمل کرنے کے لیے ہم ابھی تیار نہ تھے۔

نئے تعلیم یافتہ گروہ کا خیال ہے کہ ہماری موجودہ زندگی اور ابنائے وطن کی مروجہ معاشرت پر ناول لکھے جانے چاہیین۔ جیسا انگریزی مین ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے خیال مین یہ اُنکی ناتجربہ کاری ہے۔ بیشک انگلستان اور ممالک یورپ مین اکثر ناول ایسے ہی ہوتے ہین اور وہان وہی عنوان دلچسپ رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کی پبلک مین جہان تک میرا تجربہ ہے یہ عنوان بالکل دلچسپ نہین ہوسکتا۔ افسانون مین انسان اپنی زندگی کے اعلیٰ اور کامیابی کے واقعات کو ڈھونڈھتا ہے۔ اور ناکامی وٹریجڈی بھی پسند آتی ہے تو اُسی عہد کی جبکہ اپنے حالات مین کامیابی ومقصدوری کی صورتین نظر آیا کرتی تھین۔ جس طرح ہر انسان اپنے جوانی کے واقعات کو زیادہ پسند کرتا اور مزے لے لے کے کہتا اور سنتا ہے اُسی طرح قومین بھی اپنے عروج وکمال اور اوج واقبال کے واقعات کو زیادہ پسندیدہ خیال کیا کرتی ہین۔

یورپ والون کو دنیا کی ساری عمر مین اپنا ہی موجودہ دَور کامیابی وکامرانی اور ترقی وعروج کا دَور نظر آتا ہے۔ اور اسی لیے وہ اپنی گذشتہ زندگی کے عوض موجودہ زندگی کو زیادہ پسند کرتے اور قومی عمر کے اسی حصہ پر فخر وناز رکھتے ہین۔ ایسی حالت مین اگر اُن کے ناول موجودہ سوسائٹی کے واقعات سے لبریز ہوتے ہین تو کوئی تعجب کی بات نہین۔ بلکہ بالکل بجا ہے ہے۔ بخلاف اُنکے ہم اہل ہند ہندو ہوں یا مسلمان بلکہ مین کہونگا کہ جاپان والون کے سوا سارے اہل ایشیا، اس مین عرب ہون یا تُرک، ایرانی ہون یا ہندی یقین کررہے ہین کہ ہمارے اوج وعروج کا زمانہ گذر گیا۔ اور فی الحال ہم ایک نکبت وپستی کی زندگی مین مبتلا ہین۔ پھر ایسی حالت مین ہم پوچھتے ہین کہ انھین اپنی موجودہ زندگی مین لطف آئے گا یا اوج واقبال کی زندگی مین؟

اور ہماری اس ذلت وپستی کی زندگی مین رکھا ہی کیا ہے جس مین ہمین یا کسی کو مزہ آئے گا؟ اولوالعزمی وبلندحوصلگی ہم مین نہ ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔

بڑے اہم معاملات ملکی و قومی نہ ہم کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ تعلیم و قابلیت ہم میں نہایت کم درجے پر ہے۔ ہماری عورتیں جاہل اور ناداں ہیں۔ اور سوا پستیِ خیال کے اُن سے نہ کوئی علمی کام ہو سکتا ہے اور نہ کوئی بڑا اہم ملکی کام۔ شریف گھرانوں میں ہمارے یہاں عشق ناجائز ہے۔ عقد سے پہلے مرد و عورت میں کوئی رابطہ نہیں قائم ہو سکتا۔ اور ہو تو ناجائز ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم میں سوسائٹی ہی نہیں جس پر یورپ کے ناولوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

رہیں چند معمولی باتیں۔ پیدا ہونا۔ کھیل کود کے بڑا ہونا۔ کچھ دنوں اُستاد کے سامنے بیٹھ کے محض بے نتیجہ اپنا اور اُس کا بھیجا خالی کرنا۔ شادی کرنا نہیں بلکہ دوسروں کے ہاتھوں شادی کا ہو جانا۔ اور چند دنوں تک روٹی کی فکر میں مبتلا رہ کے اور زمانہ کی سختی و سُستی برداشت کر کے مر جانا ہماری موجودہ زندگی کا خلاصہ ہے۔ اس میں اور ایک جانور کی زندگی میں بہت ہی تھوڑا فرق ہے اور ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان واقعات میں کسی کو کیا لطف آئے گا؟

موجودہ سوسائٹی کے شوق کی برکت سے اُردو میں ایسے بھی ناول لکھے گئے ہیں۔ جن میں کبھی کوئی شریف زادی کسی اور کے گھر میں ڈولی سے اُتروا دی گئی ہے۔ کبھی کسی نے کسی مہ جبین بہو بیٹی کو کھڑکی سے جھانکتے یا گاڑی کی جھلملیوں سے آنکھیں لڑاتے دیکھ لیا ہے اور عاشق ہو گیا ہے۔ پھر اُس کے گھر سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اور آخر اُسے خراب کیا ہے۔

ایسے ناولوں کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ وہ سوسائٹی کی تصویریں ہیں یا اُن کے ذریعہ سے سوسائٹی اور زیادہ بدنام و رسوا کی گئی ہے۔ اُن میں اخلاق کا سبق دیا گیا ہے یا بد اخلاقی سکھائی گئی ہے۔

سچ یہ ہے کہ ہماری زندگی اس قابل ہی نہیں کہ ناول کے صفحوں پر لائی جائے اور جو کچھ اس سوسائٹی میں ہے اگر دکھایا جائے گا اُس سے سوا اس کے کہ ہم اپنی ذلت و تباہی کو عالم آشکارا کر دیں اور کچھ نہ ہوگا۔ ان کو پڑھ کر غیر ہم پر ہنسیں گے اور ہم اُن سے جو سبق حاصل کریں گے وہ ہمیں اور ذلیل و پست کرے گا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ موجودہ مذاق پبلک کو پسند بھی نہیں آ سکتا

کیونکہ اُسی اصول کے مطابق جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ہمارے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو اپنی قومی زندگی کے اُسی حصہ کے واقعات میں مزہ آ سکتا ہے جو کامیابی و عروج کا زمانہ تھا۔ اور نصیحت و عبرت کے لیے بھی ہم اُنھیں اُنکے اوج و عروج کے کارنامے دکھائیں تو شاید وہ زیادہ متنبہ ہوں گے۔

ہندوستان کے لیے اہل یورپ کے مذاق کے ناول نہیں چاہیے۔ بلکہ "رومانس" چاہیے جن میں اُنھیں کے کسی اگلے ہموطن یا ہم مذہب کی اعلیٰ کارگزاریاں دکھائی گئی ہوں اور جن کے ذریعہ سے اُنھیں اپنا اگلا علم و فضل اور اوج و عروج یاد دلایا گیا ہو۔

ہم نے بھی دو ایک ناول موجودہ سوسائٹی دکھانے کی کوشش میں لکھ کے شایع کیے تھے۔ مگر پبلک کو اُن میں ہرگز اتنا مزہ نہیں آیا جتنا کہ ملک العزیز ورجنا۔ فتح اندلس۔ ایام عرب۔ اور فردوس بریں وغیرہ وغیرہ میں آیا۔ اور اسی خیال سے ہم ہمیشہ ناول کے لیے اگلے عہد کا کوئی واقعہ ڈھونڈھ لیا کرتے ہیں۔ اور اُس میں موجودہ لٹریچر کے موافق کچھ مشرقیت ہوتی ہے اور کچھ مغربیت۔ حتی الامکان دلچسپی پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ اور ہمیں اب یقین ہو گیا ہے کہ جس طرح ہمارا موجودہ لٹریچر مغربی و مشرقی انشا پردازی کا مجموعہ ہے اسی طرح ہمارے ناولوں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ اُن میں کچھ ایشیائیت ہو اور کچھ یورپیت۔ نہ وہ بالکل ایسی بے سر و پا کہانیاں ہوں اور نہ انگلش گھروں کی تصویر دکھانے والے ناول۔

فی الحال ہم نے کوئی خیالی پلاٹ نہیں بنایا۔ بلکہ ایک ایسے عاشق عرب کا قصہ ناول کے پیرایہ میں لکھنا شروع کر دیا ہے جس کے نام سے ہندوستان کے لوگ تو بہت کم واقف ہیں مگر عرب کے لٹریچر میں اُس کی حد سے زیادہ زیادہ شہرت ہے۔ عشاق عرب میں سے مجنون عامری اور اُس کی معشوقہ لیلیٰ کا نام فارسی اور اُردو نظم کا عنصر اعظم بن گیا۔ مگر قیس بن ذریح عذری اور اُسکی معشوقہ لُبنیٰ کے حالات سے لوگ بالکل ناواقف ہیں۔ حالانکہ عرب میں ان دونوں ناموں کو لیلیٰ مجنون کے ناموں سے کم شہرت نہیں حاصل ہے۔

قیس بن ذریح کا کلام عربی لٹریچر مین کثرت سے موجود ہے - اس کے واقعات مورخین نے تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہین - اور شعرائے اُس کے سوز عشق سے اپنے عاشقانہ کلام مین گرمی پیدا کی ہے - اس کا زمانہ صحابہؓ کرام کا درمیانی زمانہ ہے - حضرت عثمان ذی النورین اور حضرت علی مرتضی کی شہادتون کو اُس نے دیکھا نہین تو سُنا تھا - اور اسلام کے اُس ابتدائی عہد پُرفتن مین تھا جبکہ حضرت رب العزت نے خیر القرون کے برگزیدہ لوگون کو آزمایش کی مصیبت مین مبتلا کر دیا تھا - لیکن اپنے عشق کے جوش سے اُس نے اُس عہد کے جھگڑون کی طرف توجہ نہین کی اور لبنیٰ کی یاد مین رو یا کیا - اس کو سب سے بڑی فضیلت و شرافت یہ حاصل تھی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا رضاعی بھائی تھا -

ممکن تھا کہ اس موقع پر ہم اُسکے مختصر حالات بھی بیان کر دیتے لیکن نہین - اس سے ہمارا ناول بے مزہ ہو جائے گا - اور واقعات کے معلوم کرنے کا جو شوق دلون مین پیدا ہوا کرتا ہے سرد پڑ جائے گا - لیکن اتنا اطمینان دلاتے ہین کہ اس ناول مین جو واقعات بیان کیے جائین گے مجموعی طور پر سچے اور مطابق واقعہ ہون گے - ہان ناول کی ضرورت سے تفصیلی صحبتون اور اور صحبت کی باتون مین تصرف اور اضافہ کرنے سے مجبوری ہے - کیونکہ بغیر اسکے نہ ناول ناول ہو سکتا ہے اور نہ قصے مین مزہ آ سکتا ہے -

ہمارا لٹریچر

اُردو زبان کی تاریخ پر عمدہ طور پر غور ہو چکا - اور اُس کی اگرچہ اُسی زمانے مین بنا پڑ گئی جبکہ مسلمانون کا قدم پہلے پہل ہندوستان مین آیا - مگر اس بات کو اکثرون نے تسلیم کر لیا ہے کہ زبان اُردو کے ایک ممتاز صورت اختیار کرنے کی تاریخ نسل تیمور کے پانچوین تاجدار ہند شاہجہان کے عہد سے شروع ہوتی ہے حسب قاعدہٴ فطرت اُردو چونکہ ابتداءً صرف اخلاقی صحبتون اور بیع کی

دلچسپیون مین مزے دکھا رہی تھی۔ لہذا عموماً ابتدائی شعرائے اُردو یا اُردو کے بچپن کے قدردانون نے علمی اہم ضرورتون مین اس گھریلو زبان سے کچھ کام نہین لیا۔

ظاہر ہے کہ ادھر دو تین صدی پہلے تک کا زمانہ اسلام کا آخری دور تھا۔ ایسے لوگ نہین رہے تھے جو کسی بچے کے تیور دیکھتے ہی اُسکے ہونہار ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ کر لیتے۔ اور اسی غلطی نے عرصے تک اُردو کو کسی قسم کی معتدبہ وقعت نہ حاصل کرنے دی۔ اور کیونکر ہوتا۔ تقدیر نے تو یہ نیکنامی ناشتاکان مغرب کی قسمت مین لکھدی تھی۔ بس یہی ہوا۔ برٹش حکومت نے اُردو کو عدالت کی کرسی تک نہین پہونچایا۔ بلکہ یون کہنا چاہیے کہ خاک سے اُٹھایا اور آسمان پر پہونچا دیا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ قبل اسکے کہ انگریز اس زبان مین اپنا بابرکت ہاتھ لگائین اُردو کی کیا حالت تھی؟ کیونکہ انگریزون نے اُردو کی قدر و منزلت بڑھانے مین چاہے جس قدر مبالغہ کیا ہو۔ مگر اس مین شک نہین کہ مسلمان اپنی تنہا کوششون سے اس زبان کو بہت مضبوط اور شایستہ بنا چکے تھے۔ انگریزون کو مسلمانون کے ہاتھ سے یہ زبان نفس ایک زبان ہونے کی حیثیت سے پوری اور کمال کے درجے پر پہونچی ہوئی ملی۔ لہذا ظلم ہوگا اگر اُردو کی اصلیت اور ترقی پر بحث کرتے وقت مسلمانون کی کوششین قدردانی کی نظر سے نہ دیکھی جائین۔

ظاہر ہے کہ اُردو کا پہلا وطن دہلی ہے۔ اور ترقی کی دنیا مین دہلی کی جو رفتار تھی وہی رفتار زبان اُردو کی رہی۔ شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے البتہ ترقی کے زمانے تھے۔ مگر اُن دنون گویا اُردو کا عالم ہیولانیت تھا۔ شایستہ اور لائق صحبتون مین کوئی اُردو کی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ ہان بعد کے دور اپنی ہمت اور طاقت کے موافق اُردو کی قدر کرتے رہے۔ اگرچہ طوائف الملوکی اور بے انتظامیون نے دہلی کو اس قابل ہی نہین رکھا تھا کہ وہ اُردو کے ایسے ایک آزاد طبع اور فارغ البالی چاہنے والے بچے کی پرورش کر سکے۔ مگر باوجود اس ناقابل ہونے کے اہل دہلی سے اُردو کی ترقی مین جو جو کوششین ظاہر ہوئین

قابل تحسین ہین۔ مگر افسوس ان کوششون کی بھی دہلی کبھی قدر نہ کر سکی۔ دہلی مین جتنے نامور اور معجز بیان شعرا ہوے۔ زمانے نے ان کا قدم بھی وہان نہ جمنے دیا۔ میر۔ سودا۔ انشا۔ یہ لوگ ایسے نہ تھے کہ اگر دہلی مین ذرا بھی صلاحیت ہوتی تو انھین اپنی شہر پناہ سے بھی نکلنے نہ دیتی۔ سودا جنھین وطن سے بڑی محبت تھی۔ اور اُن کے ابتدائی تیور کہہ رہے تھے کہ دلی چھوڑ کر کہین نہ جائین گے۔ مگر وہان کی ناقدر دانیون سے آخر اُنکے استقلال مین بھی فرق آگیا۔ ان تمام باتون سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کو صرف وطن ہونے کے سبب سے دلی کے ساتھ ایک قسم کا اُنس تھا۔ ورنہ دلی والون مین اسکی ترقی کے متعلق کوئی صلاحیت نہ تھی۔ اگر بعض پچھلے شاہان دہلی شعراے اُردو کی قدردانی کی طرف متوجہ بھی ہوے تو اُسوقت زمانہ اُنکے خلاف تھا۔ اپنی حیثیت سے اُنھون نے بہت کیا۔ مگر اصل مین پوچھیے تو کچھ نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ اُردو کو جہان تک تعلق دلی سے رہا وہ فلسفیانہ طور پر باعث تنزل ہو سکتا ہے۔ نہ باعثِ ترقی۔ کیونکہ خود دہلی کی حالت روبہ تنزل تھی۔

یہی سرد مہری اور دلی کی یہ بے استطاعتی دیکھ کے اُردو کو بھی آخر دلی چھوڑنی ہی پڑی۔ لکھنؤ کا دربار اگلے شاہان دہلی کے مقابلے مین چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو مگر اُس زمانے کے شاہان دہلی کے دربارون سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ زمانہ تصدیق کر رہا تھا کہ جو دلی سے جاتا ہے لکھنؤ مین ہاتھون ہاتھ لیا جاتا ہے۔ کمالون کی قدر ہوتی ہے اور طبع آزمائیون کی داد دی جاتی ہے۔ اُردو کے وہ تمام لائق اور سخن سنج شعرا جن کی گود مین اُردو پرورش پا رہی تھی اپنے ہونہار بچے کو بغل مین دبائے ہوے لکھنؤ آئے۔ جہان اُنکے استقبال کے شوق مین ہر امیر و غریب کی آنکھین بچھ گئین۔ لکھنؤ پہونچ کے اس بچے نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو دلی کے خلاف جہان تجارت پیشہ لوگون کو اپنے لین دین سے اسکی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ تھی۔ یہان کی تمام صحبتین اطمینان اور فراغت سے طبع آزمائی مین مصروف ہین۔ فی الحقیقت ایک ایسی زبان کے لیے جو ترقی کرنا چاہتی ہو۔ یہ صحبتین نہایت عمدہ مربی ہو سکتی تھین۔ اُردو

کو سبھون نے قدر و منزلت سے قبول کیا۔ اور اس بچے نے کچھ اس فصاحت و بلاغت سے اپنے ساتھ تمام شہر کی زبان کھول دی کہ گویا ہی بچہ لکھنؤ کے ہر ہر گھر مین بلبل ہزار داستان کی طرح چہک اُٹھا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ لکھنؤ کی اُن دنون کیا حالت تھی۔ اور باعتبار ترقی اسکی کیا رفتار تھی۔ لکھنؤ اگر ترقی نہ کرتا تھا تو تنزل بھی نہین کر رہا تھا۔ اُسکا دربار ایک حالت پر ٹھیرا ہوا تھا۔ یہان کے وزراء کے نائب بھی ایسے حوصلے اور ایسی مقدرت رکھتے تھے کہ خود پچھلے شاہان دہلی بھی اُن کی حوصلہ مندیون کا مقابلہ نہین کر سکتے تھے۔ جو ماہوار رقم بادشاہ دہلی کو ملتی تھی وہ یہان کی بہت سی چھوٹی چھوٹی سرکارون کا خرچ تھا۔ لکھنؤ کو جو یک بیک زوال ہو گیا اُسکی وجہ لکھنؤ کا تنزل نہ تھا۔ بلکہ یہان کے بادشاہون کی غفلتین اور طفلاء حرکتین یا انگریزی قوت کا یک بیک بڑھ جاتا تھا۔ الغرض صاف ظاہر ہے کہ شعر و سخن کی قدردانی اور اُردو کی تربیت مین دہلی لکھنؤ کا ہرگز مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ لہذا اُردو اگرچہ دلی مین پیدا ہوئی۔ مگر اس کی ترقی۔ اُسکا نشو و نما جتنی باتین ہین سب لکھنؤ مین ہوئین۔ اُردو پر دہلی کے جسقدر احسان ثابت کیے جائین۔ مگر لکھنؤ کے احسانات اُن سے بڑھے ہی تسلیم کرنا پڑین گے۔

یہ تو نفس زبان اُردو کی بحیثیت زبان تاریخ تھی۔ باقی رہے خیالات جو اس زبان کے ذریعہ سے ظاہر کیے گئے ہین۔ اس مین شک نہین کہ دہلی والے عموماً قدیم سے دلی جذبات کے دکھانے اور نیچر کا سمان دکھانے کی طرف متوجہ رہے۔ اور لکھنؤ کے بہت سے ایسے بھی ہین۔ بخلاف لکھنؤ والون کے جو ہمیشہ سے بلند پروازی اور مضمون آفرینی کی طرف جاتے ہین۔ اس محل پر ہم دہلی کے رنگ کو لکھنؤ کے خیالی معرکہ آرائیوں پر ترجیح دیتے ہین۔ اور ہم پر کیا منحصر ہے۔ انگریزی جو جو ترقی کرتی جائے گی دلی والون کا رنگ ہر دلعزیز ہوتا جائے گا۔ انگریزی تعلیم سے شکسپیر اور گولڈ اسمتھ کے پردرد رنگ سے دلون کو ایک خاص قسم کا لگاؤ ہو جاتا ہے۔ اور انسان اُسی قسم کا رنگ ہر جگہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اُردو کی دنیا مین ایسے شخص کو صرف دلی والون کے مشاعرون مین اپنے

مذاق کی کچھ پھیکی پھیکی باتین بھی نظر آجاتی ہین - مگر لکھنؤ والون کی ناز کخیالیون مین اسکو ایسی بات بھی نہین نظر آتی - اور اسی سبب سے دلی کی شاعری لکھنؤ کی شاعری کو اب کسی قدر زک دینے لگی ہے - لیکن اول تو اس سے دلی والون کی زبان کو ترجیح کا کوئی موقع نہین مل سکتا - دوسرے جو خیال اب مین ظاہر کرتا ہون اُس سے ہر صاحب انصاف تسلیم کرلیگا کہ یہ امر بھی لکھنؤ والون کے لیے ایک ایسی حجت ہے جس کی بنا پر وہ اپنی زبان کی خوبیون کا سب سے اعتراف کرالین -

شاعری کا قاعدہ ہے کہ فطرتی طور پر ہر زبان مین خود بخود پیدا ہوجاتی ہے - شاعری جس زبان مین پیدا ہوتی ہے اُس زبان کے علمی اور مضبوط زبان ہونے کا انتظار نہین دیکھتی - مگر ہر زبان کی ابتدائی حالت اور اُس زبان کے بولنے والون کا مذاق چونکہ سیدھا سادہ ہوتا ہے اس وجہ سے اسکے پہلے شعرا اُنھین چیزون اور اُنھین خیالات سے کام لیتے ہین جو بالکل سامنے کے پیش پا اُفتادہ ہین - اور قدرتی طور پر بے ارادہ اُنکے کلام سے نیچر کی جھلکیان نظر آنے لگتی ہین - مگر وہ زبان جو جو علوم و فنون اور قواعد و ضوابط کی دنیا مین قدم رکھتی جاتی ہے شعرا اور زبان دانون کا مذاق بھی بدلتا جاتا ہے جن لوگون نے عربی کے پہلے اور پچھلے کلام دیکھے ہون گے اُنھین اس خیال کے تسلیم کرلینے مین ذرا عذر نہ ہوگا - جاہلیت کے کلام مثلاً سبعۂ معلقہ اور دیوان حماسہ کے مرثیون کے سامنے دیوان متنبی یا دیگر مولدین کے کلام کو لاکے رکھیے تو معلوم ہو کہ پچھلے شعرا صرف علوم کی چاشنی پاکے کہان سے کہان جا پڑے ہین - یہ بات کچھ عربی ہی پر منحصر نہین - دنیا کی تمام زبانون کی ابتدائی اور انتہائی حالت کا جب اندازہ کیجیے گا صاف معلوم ہوجائے گا کہ علوم نے بے تکلف نیچرل مذاق کو تدریجاً کس قدر بدل دیا ہے - ہان انگریزی زبان کی شاعری اس سے مستثنےٰ ہے - کیونکہ انگریزی جو جو ترقی کرتی گئی وہ وہ اُس کا نیچرل مذاق اور نکھرتا گیا - اور انگریزی شعرا روز بروز زیادہ نیچرل دیتے گئے - اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزون نے شاعری کی ماہیت پر غور کرکے فیصلہ کرلیا تھا کہ شاعری صرف

انسان کے دل پر اثر ڈالنے اور واقعے کی تصویر دکھا دینے کا نام ہے۔ اسی خیال نے نہ اُنھیں علم کے عالیشان چو منزلوں پر چڑھنے دیا اور نہ فنون کی پیچیدہ بھول بھلیوں میں قدم رکھنے دیا۔ مگر اُردو شعرا نے شاعری کا کوئی مسلم الثبوت اصول نہیں قرار دیا تھا۔ لہذا اُردو انگریزی کی طرح ترقی السنہ کے عام قاعدے سے نکل نہیں سکتی تھی۔

یہ قاعدہ کلیہ بیان کر کے ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ اُردو جب تک دہلی میں رہی۔ بچہ تھی۔ اُسکے شعرا اپنی ٹوٹی پھوٹی بچوں کی سی زبان میں بچوں ہی کے سیدھے سادے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ مگر لکھنؤ میں آنے کے بعد اُردو نے ترقی کی علمی اور اخلاقی دنیا میں قدم رکھا۔ یہاں اُس کی تدریجی ترقی اور اصلاح کے ساتھ شعرا کے خیالات میں بھی حسب قاعدہ بلند پروازی اور نازک خیالی پیدا ہوگئی۔ قطع نظر اسکے جن لوگوں نے انگریزی علم عروض اور قواعد شعر و سخن کو غور سے دیکھا ہے وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اُردو نظم میں جس قدر سختی کی گئی ہے اُسی قدر انگریزی میں سہولت سے کام لیا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں صدہا قیدیں اور ہزارہا قسم کی پابندیاں ہیں اور ترقی کرتی جاتی ہے۔ بخلاف اسکے انگریزی میں بہت کم قیدوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ باوجود اس ترقی کے اب تک انگریزی میں قافیہ کی ضرورت نہیں۔ اور اُردو میں جب تک قافیہ کی پابندی نہ ہو شعر ہی نہیں ہو سکتا۔ اُردو میں غزل اس قدر سخت چیز ہے جس کی نظیر انگریزی کیا معنی عربی میں بھی نہیں مل سکتی۔ اب غزل کی قیود کا لحاظ کر کے اُردو کے مقابل میں انگریزی نظم کو دیکھیے تو کس قدر آسانی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے مشہور نیچرل مذاق کے مجدد جناب حالی انگریزی رنگ کی طرف جھکے تو مجبوراً اُنھوں نے اپنے آپ کو عام اُردو کی قیود سے آزاد کر لیا۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حالی اصول شعر سے واقف نہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ ان مجبوریوں نے اُنھیں قدیم شاعری کی تقلید سے الگ کر دیا۔

نفس زبان کے متعلق ہم نے جو لکھنؤ والوں کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے اس دعوے میں ... یہ نہ سمجھ لیں کہ اُن کا کلام قابل نکتہ چینی ہی نہیں۔ اپنے خیالات

کی نسبت انکو دہلی کے شعرا سے سبق لینا چاہیے - لکھنؤ والے کچھ ایسے زلف و کاکل اور بے مزہ ملبند پروازیون مین پڑ گئے ہین کہ انکی شاعری روز بروز بیکار اور فضول ہوتی جاتی ہے - اگرچہ اس زمانے مین کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہین جن کو میر اور مومن کے پُردرد مذاق کی طرف توجہ ہے - مگر عام شعرائے لکھنؤ ابھی اپنے اُسی رنگ پر ہین - اگرچہ زبان کے اعتبار سے لکھنؤ کو بیشک اپنے حریف دہلی والون پر ترجیح ہے مگر اُن کے پھیکے مذاق نے ایسی خرابیان پیدا کر دین کہ آج لکھنؤ والون کے دیوان عام نگاہون مین بے مزہ ہوتے جاتے ہین اور دہلی والون کا کلام ایک بینا بی کے اثر کے ساتھ ہر شخص کو مزا دے جاتا ہے - مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا ظلم ہوگا کہ دہلی والون نے نفس زبان کے لحاظ سے کچھ کیا ہی نہین - اگرچہ زبان اُردو کو آخر زمانے مین لکھنؤ سے خاص تعلق ہو گیا تھا - لیکن دہلی مین ابھی اسکا چرچا باقی تھا - مومن - غالب - اور ذوق ایسے شعرا ہین جنھون نے ترقی زبان اُردو مین بہت کوششین کین - اُن کا کلام آج لکھنؤ اور دہلی دونون شہرون کے اُستادان زبان کے نزدیک قبولیت کی سند پا چکا ہے - ان لوگون کا کلام دیکھنے سے لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہین کہ مومن خان تو دہلی کے قدیم رنگ پر جا رہے تھے - انکی طبع آزمائیون نے زبان کو اُسی حالت پر رکھا - مگر درد اور سوز و گداز پیدا کرنے کی حیثیت سے سچ پوچھیے تو اپنے وقت کے گولڈ سمتھ تھے - جو بینا بیان اور عشق کی پُرجوش اُمنگین اُنکے کلام مین نظر آتی ہین - اور کسی کے کلام مین ممکن نہین - غالب کی طبیعت مین ایجاد اور جدت پسندی کا مادہ بہت تھا - علاوہ برین فارسی کی قدیم مذاق کی طرف وہ بڑے ذوق و شوق سے متوجہ تھے - دری بلکہ ژند کی زبان کی طرف وہ موجودہ فارسی کو کھینچے لیے جاتے تھے - اور چونکہ اُس زبان مین نیچر اور قدرت کے محسوس منظرون کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے - اس لیے اُن مین وہ باتین کمال کی پیدا ہو گئین - طبیعت کی اصلی جدت پسندی نے مضمون آفرینی پیدا کی اور قدیم زبان ژند کے ذوق نے نیچرل خیالات پیدا کر دیے - اگرچہ فارسی کی طرف زیادہ متوجہ رہنے سے انکی اُردو شاعری مین تھوڑا سا

تنفس پیدا ہوگیا یعنی فارسی بندشون مین اعتدال سے بڑھ گئے - لیکن جو مذاق اور جو خیالات اُنھون نے اُردو مین پیدا کیے اُس مین اپنا جھنڈا گاڑ دیا - اور لکھنو والون کے عام رنگ سے علیحدہ ہوکر جس خوبصورتی سے غالب نے مضمون آفرینی کے ساتھ نیچرل مذاق کو نباہا ہے وہ اُنھین کا حصہ تھا - اور اُس پر دہلی والے جس قدر ناز کرین زیبا ہے - باقی رہے ذوق - صرف ذوق ایک شخص ہین جو لکھنو والون کی طرح ترقی کی عام رفتار مین پڑ کے دھوکا کھا گئے - جو رنگ شعرائے لکھنو نے اختیار کیا تھا وہی رنگ ذوق نے دلی کے آخر عہد مین اختیار کیا - ان مین اور شعرائے لکھنو مین کوئی فرق نہ تھا - اگر تھا تو اُسی قدر جسقدر ہر شاعر مین اپنے خاص طبعی جذبات کے لحاظ سے اور دوسرے شاعر مین ہوتا ہے - خود لکھنو کے شعرا مین باہم ایسا ہی فرق نکل آئے گا جیسا کہ ذوق مین اور لکھنو کے کسی شاعر مین ہو - مگر زمانے کی رفتار ترقی کے ساتھ شاعری کے مذاق کے بدلنے کا جو ہم نے دعوے کیا ہے اُس کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ ذوق جو نیچر کے رنگ کو چھوڑ کے مضمون آفرینی اور بلند پروازی کی طرف جھکے تو دہلی والون نے بھی اُن کی قدر کل شعرائے دہلی سے زیادہ کی - آج دلی کی زیادہ آبادی ذوق کو اُستاد مان رہی ہے اور بیچارے غالب و مومن کا نام لینے والے کم ہین - بس یہی تین شعرا ہین جنھین دلی کا سرمایۂ ناز کہنا چاہیے - اور انھین شعرا اگرچہ اُردو پر اُن کا احسان سب سے زیادہ ہے - مگر اُن کو لکھنو اور دہلی دونون مقامون سے برابر کا تعلق تھا - اور اگر وہ دہلی کے لیے [illegible] لکھنو کو اُن دونون اہل زبان ہونے کا دعوے نہ تھا - دہلی [illegible] لکھنو بھی اُنکے عہد مین انھین پر ناز کر رہا تھا -

اُردو شاعری اور اُردو زبان کی یہ سچی تاریخ تھی - اور اس سے صاف ثابت ہوگیا کہ دہلی کو اُردو سے وطن ہونے کا اور لکھنو کو مقام نشو و نما و تربیت اور ذریعۂ ترقی ہونے کا تعلق ہے - دہلی والون کو لکھنو کا احسان ماننا چاہیے تھا کہ جو ہونہار بچہ اُن کے شہر مین پیدا ہوا تھا اُس کی وہ ذرا تربیت نہ کر سکتے تھے - لکھنو کے رؤسا اور بادشاہون نے اُسے اپنی گود مین اُٹھا لیا اور پوری ترقی دلا دی - مگر بجائے

اسکے اکثر دیکھا گیا کہ حضرات دہلی اپنی تحریروں اور تصنیفوں کے اندر... لکھنؤ پر حملے کر جایا کرتے ہیں - اگرچہ لکھنؤ کے شعرا جو ہمارے سرمایۂ ناز ہیں۔ انکو ان رکیک حملوں کی ذرا پروا نہیں ہوتی - مگر کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور چاہیے تاکہ پبلک کو اصلی حالات بخوبی معلوم ہو جائیں -

لکھنؤ پر سب سے زیادہ عنایت جناب مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے کی - انکی کتاب آبحیات بتا رہی ہے کہ اگر اُن کا بس چلتا تو وہ لکھنؤ کے مٹا دینے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتے - شعرا کی سوانحعمری لکھتے وقت انھیں یہ کس نے صلاح دی تھی کہ ناسخ و آتش کے حالات بھی لکھیں - شاید صرف یہ غرض ہو گی کہ ابتدا سے آخر تک جتنے شعرائے اردو ہوے ہیں سب دلی کے تھے - صرف یہ دو شخص البتہ لکھنؤ کے ہیں - مگر اُس مجمع کے آگے ان دو کا کیا شمار - اس دھوکے میں شاید کوئی ناواقف آگیا ہو تو آگیا ہو - ورنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے علاوہ بہت سے شعرا ہیں جن کی وقعت ناسخ و آتش سے کسی طرح کم نہ تھی - بلکہ وہ زیادہ وقعت رکھتے تھے - خواجہ وزیر وزیر - میر وزیر علی صبا - رند - رشک - اسیر یہ سب لوگ ایسے تھے جن پر لکھنؤ کی شاعری کا دار و مدار ہے - اُن کے دیوانوں کو دیکھ کے انسان ناسخ و آتش کو بھی بھول جاتا ہے - ہم یہ کہنا تو گستاخی سمجھتے ہیں کہ ہمارے حضرت آزاد نے ان لوگوں کا کلام نہیں دیکھا - مگر انکے حسن نیت کے ہم البتہ بہت بڑے معتقد ہو گئے - مثنوی کے اعتبار سے جو ناموری اور قبول عام خلق اور حکیم نواب مرزا شوق اور مصنف گلزار نسیم کو نصیب ہوئی اُس پر بہتوں کو رشک ہے - جناب آزاد نے لکھنؤ والوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اُس کا نعم البدل انھیں یہ ملا کہ دہلی میں آج انکو کوئی نہیں مانتا - چاہے اپنے گھر بیٹھے ادعائے اُستادی کیا کریں - مگر وہ دل شکستہ نہ ہوں ہم اُنکے حسن عبارت کی داد دیتے ہیں - اور لطف یہ کہ ہمارے جناب مولانا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نے اردو کی پوری تاریخ لکھی اور ہر عہد کے تغیرات پر غور فرمایا - مگر اس کا خیال نہ کیا کہ سودا اور میر جس وقت دلی چھوڑ کے لکھنؤ آئے ہیں اُسکے بعد سے دلی کو ترقی کا کوئی موقع نہ ملا - حالانکہ لکھنؤ ترقی کر رہا تھا - جس سے

لکھنؤ کی خوبیِ زبان کا عقلی نتیجہ نکلتا ہے۔

میرے نزدیک اب یہ امر بہ وضاحت ثابت ہوگیا کہ باعتبار زبان لکھ
کو دلّی پر۔ اور باعتبار مذاق و خیال دلّی کو لکھنؤ پر ترجیح ہے۔ زمانہ اب دُور
کے مقامات کو ملا رہا ہے۔ لکھنؤ والوں کی باتیں روز دلّی والے اور دلّی والو
کی پُر درد غزل خوانیاں لکھنؤ والے سُن لیا کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں منا
ہے کہ دلّی اور لکھنؤ والوں کی باہمی بحثیں اُٹھا رکھی جائیں اور دونوں مقامو
کے لوگ یوں اپنی مادری زبان کی اعانت پر کمر باندھیں کہ جس کو جس امر م
ترجیح ہو اُس سے دوسرا سبق لے۔ اگر لکھنؤ والوں کی زبان اچھی ہے تو د
والے اُن سے سیکھیں اور اگر دہلی والوں کا رنگ دلچسپ اور موثر ہے تو لکھ
والے اُنکی شاگردی اپنا فخر سمجھ کے اختیار کریں اور اپنے مذاق سخن کی اصلا
کریں۔

ہم نے یہ اپنی راے ظاہر کردی۔ ورنہ ہم کو نہ دہلی سے تعلق ہے او
لکھنؤ سے۔ ہم سے جیسی عبارت بن پڑتی ہے لکھ لیتے ہیں۔ اس میں بھی کسی
کا دعوےٰ نہیں۔ ملک میں ایک سے ایک بڑھ کر لکھنے والا پڑا ہے۔ مگر یہ
اتنا کہتے ہیں کہ جو لوگ اُردو کے اہل کمال ہیں اُن کے نزدیک ہماری وقع
کچھ اُن لوگوں سے زیادہ ہی ہو گی جو خود بخود پکارتے پھرتے ہیں
بڑھ کے لکھنے والا کوئی دنیا بھر میں نہیں۔

تمت بالخیر

ہندوستانی معیشت